خونِ دل کی کشید

فیض احمد فیضؔ کی شخصیّت اور فن کا مُطالعہ

مُرتبہ

مرزا ظفر الحسن

فیض احمد فیض کی شخصیت اور فن کا مطالعہ

مرتبہ

مرزا ظفر الحسن

مکتبۂ اسلوب

کراچی

اشاعت اوّل	۱۹۸۳ء
کتابت	مظفر گجراتی
طابع	حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد۔ کراچی
قیمت	پینتیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ کراچی ۱۸

فہرست

گلوں کی خوشبو

میزانِ سخن

شورشِ بربط و نے

حدیثِ یار کے عنواں

نذرانۂ محبت

آج فیض کی ۷۲ ویں سالگرہ منائی جا رہی ہے اور اس خوشی میں میں یہ کتاب نذرانۂ محبت کے طور پر پیش کر رہا ہوں کہ ایک ادیب کے لیے دوسرے ادیب کی طرف سے کتاب سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

۱۹۷۶ء میں میں نے سہ ماہی "غالب" کا فیض نمبر شائع کیا تھا، جس کے لیے میں نے دوسروں سے مضمون لکھوائے تھے، خود لکھے تھے اور فیض کی باتوں اور یادوں کو بھی کاغذ پر محفوظ کیا تھا۔ یہ نمبر بہت کم مدت میں ختم ہو گیا۔ اس کی اشاعت ثانی کی ضرورت تھی، لیکن بوجوہ میں یہ کام نہ کر سکا۔ اب جو فیض کی ۷۲ ویں سالگرہ پر فیض کو تحفہ دینے کا خیال آیا تو اس نمبر کو دوبارہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ـــــ لیکن خاصے غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس نمبر کو من و عن چھاپنا زیادہ مفید نہ ہوگا، بہتر ہوگا کہ ایک کتاب شائع کی جائے جس کی مستقل حیثیت ہو۔ زیرِ نظر کتاب میں فیض کی شاعری اور شخصیت پر مضامین شامل کیے گئے ہیں، کچھ تو وہی ہیں جو غالب نمبر میں تھے، اور کچھ نئے ہیں۔

میں اپنی ادبی زندگی کا سب سے منور زمانہ اُن سرگرمیوں کو قرار دیتا ہوں جو فیض پر لکھنے یا دوسروں سے لکھوانے یا فیض کی منتشر تخلیقات کو کتابی صورت میں مدون کرنے سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، اور اس میں بعض ایسے مضامین شامل ہیں جن میں فیض کے سوانح نگار کے لیے قیمتی مواد شامل ہے۔ امید ہے میری یہ کاوش ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

اس موقعے پر مجھے مشفق خواجہ کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے کہ یہ کتاب انھیں کی تحریک اور تجویز پر میں نے مرتب کی اور اگر ان کا تعاون شاملِ حال نہ ہوتا تو یہ شاید اس موقع پر شائع نہ ہو سکتی۔ آپ اسے میرا اور مشفق خواجہ کا مشترکہ نذرانۂ محبت بھی کہہ سکتے ہیں۔ سرِ ورق کی تصویر بھی مشفق خواجہ کی کھینچی ہوئی ہے جس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔

۱۳ فروری ۱۹۸۳ء — مرزا ظفر الحسن

حبیب جالب

فیضؔ

وفا شعار محبت کی روشنی ہے فیضؔ

سلام فیضؔ کو ہم سب کی زندگی ہے فیضؔ

نہ شیخ سے کوئی رغبت، نہ برہمن سے لگاؤ

کہ آدمی ہے، نگہدارِ آدمی ہے فیضؔ

ہوئے ہیں لوگ یہاں نذرِ مصلحت کیا کیا

وہی ہے نفرتِ اغیار اور وہی ہے فیضؔ

شبِ سیاہ کو ہم جو سحر نہیں کہتے

یہ بات کہنے کی جرأت بھی تو نے دی ہے فیضؔ

یہ حُسن اور کسی میں نظر نہیں آتا

بزرگ بھی ہے مگر اپنا یار بھی ہے فیضؔ

اپنی زبان میں

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ

جمعہ ۱۳، فروری ۱۹۷۶ء کو فیض کے گلبرگ لاہور والے سابق دفتر میں ٹیپ ریکارڈر تیار کر کے میں نے ان سے عرض کیا کہ آج جب کہ وہ پورے پینسٹھ برس کے ہو گئے ہیں اپنی یادیں مجتمع کریں اور بتائیں کہ اپنے لڑکپن، جوانی اور اب بڑھاپے کے ان تین ادوار میں انہیں کیا مشترک اور کیا مختلف نظر آتا ہے اپنے تجربات اور مشاہدات سے کیا حاصل کیا ہے اور شمع نظر، خیال کے انجم اور جگر کے داغ جیسے چراغ کس کس کی محفل سے آئے ہیں۔ میں نے اس گفتگو کی ریکارڈنگ کے لئے ہر ممکن احتیاطی تدبیر کر لی تھی۔ کمرے کے دونوں دروازے بند کر دیئے، فیض کے پی اے محمد طفیل صاحب سے کہہ دیا کہ کوئی ٹیلی فون نہ لائیں اور کسی مہمان کو اندر نہ آنے دیں۔ اور اس سے معذرت کر لیں کہ فیض صاحب دو ڈھائی گھنٹے تک ریکارڈنگ میں مصروف رہیں گے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر ایوب مرزا اور ڈاکٹر خالد سعید بٹ جو راولپنڈی۔ اسلام آباد سے بطور خاص موٹر کے ذریعے آئے تھے فیض کو سالگرہ کی مبارکباد دینے کے لئے، اپنے خلوص و محبت کے بے شمار تحفوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئے۔ جس کی وجہ سے میری مجوزہ ریکارڈنگ مکمل نہ ہو سکی۔ یادوں کے تمام چراغ روشن نہ ہو سکے، ریکارڈنگ جس سے یہ مسودہ مرتب کیا گیا ہے۔ غالب لائبریری میں محفوظ کر لی گئی ہے۔ م، خ، ا، ح

ہمارے شعراء کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدریٔ ابنائے وطن ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے الٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پہ لطف و عنایات کی اس قدر بارش رہی ہے، اپنے دوستوں کی طرف سے، اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی زیادہ محبت کا مستحق ہونے کے لئے جو تھوڑا بہت ہم نے کیا ہے اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیئے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے، اسکول میں پڑھتے تھے، تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ خواہ مخواہ انہوں نے ہمیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا حالانکہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں، یا تو آدمی بہت لٹھ باز ہو کہ دوسرے اس کا رعب مانیں، یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے، کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا۔ ہم جو تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا، جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے، کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گذارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے، کوئی لٹو چلا رہا ہے۔ ہم بس یہ کھیل کود دیکھتے رہتے تھے، اکیلے بیٹھ کر۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی کہ اسے شریفانہ شغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہربان رہے۔ آجکل کا میں نہیں جانتا، شاید ہوتا ہو، ہمارے زمانے میں تو اسکول میں سخت پٹائی ہوتی تھی۔ ہمارے عہد کے استاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے۔ بلکہ (ساتھی لڑکوں کو) سزا دینے کا منصب بھی ہمارے حوالے کرتے تھے۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو یوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ سزا محسوس نہ ہو۔ طمانچے کی بجائے گال تھپتھپا دیا، یا کان آہستہ سے کھینچا وغیرہ۔ کبھی ہم پکڑے جاتے تو استاد کہتے یہ کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تاثر بہت گہرے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچوں کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں ان سے محروم رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور اپنے اساتذہ سے ہمیں اسی قسم کی شفقت اور خلوص ملا جو بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے ملا اور آج بھی مل رہا ہے۔

صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذاں کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے، جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، درس قرآن سنا، پھر ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے سیر کے لئے گئے۔ پھر اسکول۔ رات کو ابا بلا لیا کرتے خط لکھنے کے لئے۔ اس زمانے میں انہیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔ ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انہیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

ایک اور یاد تازہ ہوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک دکان تھی، جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہوا کرتے تھے۔ جنہیں سب بھائی کہتے تھے۔ بھائی صاحب کی دکان میں اردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا وہ آجکل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں۔ جیسے طلسم ہوشربا، فسانۂ آزاد، عبدالحلیم شررؔ کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں اس

کے بعد شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ داغ کا کلام پڑھا۔ میر کا کلام پڑھا۔ غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا۔ لیکن ان کا دل پہ اثر کچھ اس قسم کا ہوتا تھا جیسے سانس رکنے لگی ہے۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ایک خاص قسم کا لگاؤ شعر سے پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے منشی گھر کے ایک طرح کے منیجر بھی تھے۔ ہمارا ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو انہوں نے کہا اچھا آج ہم تمہاری شکایت کریں گے کہ تم ناول پڑھتے ہو۔ اسکول کی کتابیں پڑھنے کی بجائے چھپ کر انٹ شنٹ کتابیں پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ڈر ہوا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی۔ ابا نے ہمیں بلایا اور کہا میں نے سُنا ہے تم ناول پڑھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی کے ناول پڑھو اردو کے ناول اچھے نہیں ہوتے۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لاکر پڑھا کرو۔

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کئے۔ ڈکنس پڑھ ڈالا، ہارڈی پڑھ ڈالا اور نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا پلّے نہ پڑتا تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہو گئی۔ استعداد پیدا ہونے لگی۔ دسویں جماعت میں پہنچتے پہنچتے تک محسوس ہوا کہ بعض استاد پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ہم ان کی انگریزی درست کرنے لگے۔ اس پہ ہماری پٹائی تو نہ ہوئی البتہ وہ استاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمہیں ہم سے اچھی انگریزی آتی ہے تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے کیوں پڑھتے ہو۔

اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کیفیت کا بعد میں بھی کبھی کبھی احساس ہوا ہے مگر اب نہیں ہوتا۔

مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے

زمانے میں مشاعرے کئے جاتے تھے۔ سیالکوٹ میں پنڈت راج نرائن حرمان دل ہوا کرتے تھے جو ان مشاعروں کے انتظامات کرتے تھے۔ ایک منشی سراج دین تھے۔ سرینگر میں مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ وہ صدارت کیا کرتے تھے۔ جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور دو ایک مشاعروں میں شعر پڑھ دیئے۔ منشی سراج دین نے ہم سے کہا میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمہارے دل و دماغ میں پختگی آجائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضیع اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں یوسف سلیم چشتی صاحب اردو پڑھانے آئے جو اقبال کے مفسر بھی ہیں تو انہوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا طرح پر شعر کہو۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں بہت داد ملی۔ چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔

گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے جہاں بہت ہی فاضل اور مشفق اساتذہ سے نیازمندی ہوئی پطرس بخاری تھے۔ اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر تاثیر تھے۔ بعد میں صوفی تبسم صاحب آگئے۔ ان کے علاوہ شہر کے جو بڑے ادیب تھے، امتیاز علی تاج تھے، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری صاحب تھے۔ اختر شیرانی تھے ان سب سے ذاتی مراسم ہو گئے۔ ان دنوں اساتذہ اور طلباء کا رشتہ ادب کے ساتھ ساتھ کچھ دوستی کا سا بھی ہوتا تھا۔ کالج کی کلاسوں میں تو شاید ہم نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا لیکن ان بزرگوں کی صحبت اور محبت سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی محفلوں میں ہم پر شفقت ہوتی تھی اور ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے اٹھتے تھے۔

ہم نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جب شعر کہتے تو سب سے پہلے خاص دوستوں ہی کو سناتے تھے۔ ان سے داد ملتی تو مشاعروں میں پڑھتے۔ اگر کوئی شعر خود کو پسند نہ آیا، یا دوستوں نے کہا نکال دو تو اسے کاٹ دیتے۔ ایم اے میں پہنچنے تک باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ہمارے ایک دوست ہیں خواجہ خورشید انور۔ ان کی وجہ سے ہمیں موسیقی میں دلچسپی

پیدا ہوئی۔ خورشید انور پہلے تو دہشت پسند تھے۔ بھگت سنگھ گروپ میں شامل۔ انہیں سزا بھی ہوئی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ دہشت پسندی ترک کر کے وہ موسیقی کی طرف رجوع ہوئے۔ ہم دن میں کالج جاتے اور شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین مرحوم کی بیٹھک میں بڑے بڑے استادوں کا گانا سنتے۔ اس زمانے کے سب ہی استاد آیا کرتے تھے۔ استاد توکل حسین خاں، استاد عبدالوحید خاں، استاد عاشق علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔ ان استادوں کے ہمعصر اور ہمارے دوست رفیق غزنوی مرحوم سے بھی صحبت ہوتی تھی۔ رفیق لا کالج میں پڑھتے تھے۔ خیر پڑھتے تو خاک تھے۔ بس یونہی طور پر کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی۔ غرض اس طرح ہمیں اس فنِ لطیف سے حظ اندوز ہونے کا کافی موقع ملا۔

جب ہمارے والد فوت ہوئے تو پتا چلا کہ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں ہے۔ کئی سال تک دربدر پھرے۔ فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی بہت لطف آیا اس لئے اس کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ خاص طور سے اپنے دوستوں سے۔ کالج میں چھوٹا سا ایک حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے احتشام الدین اور شیخ احمد حسین۔ ڈاکٹر حمید الدین بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔ جوانی کے جو دوسرے واقعات ہوتے ہیں وہ بھی ہوئے اور وہ ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گرمیوں کی جب تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سرینگر چلے جایا کرتے اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔ لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے۔ جہاں مناظرِ قدرت دیکھنے کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا۔ ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا۔ اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعۂ حسنِ فطرت سے نہیں رہا پھر بھی ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں ان میں اپنا ایک حسن ہے جو دریا و صحرا، کوہسار یا سرو و سمن سے کم حسین نہیں ہے۔ البتہ اس کو

دیکھنے کے لئے بالکل دوسری طرح کی نظر چاہیئے۔ مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدررو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا، چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدررو اور ارد گرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پراسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حسن پیدا ہو گیا تھا۔ جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے۔ شہر کی گلیوں محلّوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آجاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔

(فیض نے جس منظر کشی کا ذکر کیا ہے اس کے لئے ان کی نظم انتساب کا یہ بند ملاحظہ ہو سرِ وادیٔ سینا ص: ۴۴

بیواؤں کے نام

"کٹڑیوں" اور گلیوں، محلّوں کے نام

جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں

کو آآ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزو مند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو")

(کٹڑی کٹڑے کی تصغیر۔ پنجابی میں ملحقہ مکانوں کے احاطے کو کہتے ہیں)

ایم اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی ضرورت ہوئی کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دوسری کتابیں جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے۔ اس لئے امتحان میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اوّل دوم آتے ہیں ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں خواہ ہمارے نمبر ان سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے اساتذہ بھی جانتے تھے۔ جب کسی استاد کا، جیسے

پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر ہری چند کٹا پا لیا تھے، لکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے ہماری بجائے تم لکچر دے دو ایک ہی بات ہے۔ البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر ڈکنسن کے ذمّے انیسویں صدی کا نثری ادب تھا مگر انہیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے ہم سے کہا دو تین لکچر تیار کرلو۔ دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے ان سے بھی کہا دو دو تین تین لکچر تم لوگ بھی تیار کردو۔ کتابوں وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو آکے ہم سے پوچھ لینا۔ چنانچہ نیم استاد ہم اسی زمانے میں ہو گئے تھے۔

ابتدائی شاعری یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال ہی نہ گذرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغیرہ تو اس وقت ذہن میں بالکل ہی نہ تھی۔ اگرچہ اس وقت کی تحریکوں، مثلاً کانگریس تحریک، خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی ٹیرارسٹ تحریک۔ ان تحریکوں کے اثرات تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قصے میں شریک نہیں تھے۔

شروع میں خیال ہوا کہ ہم کوئی بڑے کرکیٹر بن جائیں کیونکہ لڑکپن سے کرکٹ کا شوق تھا اور بہت کھیل چکے تھے۔ پھر جی چاہا استاد بننا چاہیئے، نقّاد بننا چاہیئے۔ ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔ ان میں سے کوئی بھی بات نہ بنی۔ ہم کرکیٹر بنے نہ نقّاد اور نہ ریسرچ کیا۔ البتہ استاد ہو کر امرتسر چلے گئے۔

ہماری زندگی کا سب سے خوشگوار زمانہ امرتسر کا تھا اور کئی اعتبار سے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ جب ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا تو بہت لطف آیا۔ اپنے طلبا سے دوستی کا لطف۔ ان سے ملنے اور روزمرّہ کی رسم و راہ کا لطف، ان سے کچھ سیکھنے اور انہیں پڑھانے کا لطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع کیا۔ تیسرے یہ کہ امرتسر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقا، کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں محمود الظفر تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، بعد میں ڈاکٹر تاثیر آگئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا۔ سول لبرٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام کیا۔ ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام

کیا۔ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں اور ان میں حصہ لیا ادب لطیف کی ادارت کی پیش کش ہوئی تو دو تین برس اس کا کام کیا۔اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ایک ادب برائے ادب والے دوسرے ترقی پسند تھے۔کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحث چلتی رہی جس کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا۔

جو برصغیر میں ریڈیو شروع ہوا۔ریڈیو میں ہمارے دو دوست تھے۔ایک سید رشید احمد تھے جو ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہوئے۔دوسرے سومناتھ چپ تھے جو آجکل ہندوستان میں شعبۂ سیاحت کے سربراہ ہیں۔دونوں باری باری سے لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے ہم اور ہمارے ساتھ شہر کے دو چار اور ادیب، ڈاکٹر تاثیر، حسرت، صوفی صاحب اور ہری چند اختر ریڈیو آنے جانے لگے۔اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائرکٹر آف پروگرامس نہیں بناتا تھا ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔نئی نئی باتیں سوچتے تھے اور ان سے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے، فیچر لکھے دو چار کہانیاں لکھیں۔یہ سب ایک مستقل مشغلہ تھا۔رشید جب دلّی چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔وہاں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسائی۔مجازؔ، سردار جعفری، جاں نثار اختر، جذبیؔ اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسط سے رابطہ ہوا جس سے دوستی کے علاوہ بصیرت اور سوجھ بوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہوئے۔وہ سارا زمانہ مصروفیت کا بھی تھا اور ایک طرح سے بے فکری کا بھی۔

زلف کی اسیری، زنجیر کی اسیری

[۹ مارچ ۱۹۷۷ء کو لائل پور میں ۶۵ ویں سالگرہ کی تقریب سے فیض کا خطاب ریکارڈ کر لیا گیا تھا جو غالب لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مسودہ اسی ریکارڈنگ سے مرتب کیا گیا ہے۔ م ط ح۔]

جب ہمارے چند دوستوں نے کہا تھا کہ ہم سالگرہ کے تعلق سے لائل پور میں کوئی تقریب کرنا چاہتے ہیں تو میرا خیال تھا کہ یہاں جو ہمارے ۲۵، ۵۰ احباب ہیں ان کی کوئی نجی محفل ہوگی جس میں بیٹھ کر ہم گپ شپ کریں گے اس لئے میں نے حامی بھر لی اور کہا ضرور کیجئے ہم حاضر ہوں گے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے کرم فرما اور دوست سارے شہر کو براتی بنا کر یہاں اس طرح جمع کر دیں گے۔ اس کی مجھے مسرت تو ضرور ہے لیکن لائل پور کے مجھ پر پہلے ہی بہت سے احسانات ہیں اور ان میں یہ جو مزید اضافہ ہو گیا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ بدلہ کس طرح چکاؤں جب کہ پچھلے احسانات کا حساب ہی بے باق نہ کر سکا۔ میں ان تمام احسانات کے لئے انتہائی شکر گذار ہوں۔ سوائے کلمۂ شکر کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔

انگریزی کا ایک محاورہ ہے جس کو ایک اور طرح سے بیان کیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کوئی شخص اپنے گھر میں ہیرو نہیں ہوتا۔ ہیرو تو وہ باہر کے لوگوں اور بیگانوں کے لئے ہوگا جو اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے نہیں کہ اس کی ذاتی کمزوریاں خامیاں اور خرابیاں کیا ہیں۔ گھر والوں کو تو سب کچھ معلوم ہوتا ہے اور ان کے لئے اس کا ہیرو بننا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ لائل پور کو چونکہ میں اپنا گھر اور یہاں کے سب لوگوں کو اپنے گھر والے سمجھتا ہوں اس لئے مجھے یہ جماع دیکھ کر تعجب بھی ہوا۔ غالباً اس کا تعلق کسی ہیرو بننے بنانے سے نہیں ہے۔ محض اس محبت اور خلوص کے رشتے سے ہے جو کہ مجھے آپ لوگوں سے ہے اور مجھے انتہائی مسرت اور افتخار

ہے کہ آپ کو مجھ سے ہے۔

اس شہر کے احسانات گنانا شروع کروں تو اس میں سب سے پہلے یہ عرض کروں گا کہ جب ہم جیل خانے سے نکلے تھے اس وقت ہمارے دوستوں نے ایک تقریب کی اور میں نے احباب سے کہا تھا یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم نے زلف کی اسیری اسی شہر لائل پور میں شروع کی اور زنجیر کی اسیری بھی اسی شہر سے شروع کی۔ زلف کی اسیری بھی بڑا احسان تھا اور زنجیر کی اسیری بھی۔ اس سے بہت کچھ سیکھا اور قید و بند سے بہت کچھ حاصل کیا۔ چار ماہ جو قید تنہائی یہاں بسر کی اس میں ہمارے پاس نہ کاغذ تھا نہ قلم نہ ملاقات نہ خط۔ ہم تھے اور ہمارا جیل کا کمرہ۔ یہ چار ماہ بالکل ایسے تھے جیسے [illegible]۔ اس قید میں پتا چلا کہ دن میں آسمان کتنی دفعہ رنگ بدلتا ہے اور رات کو ستارے کہاں سے کس طرف جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ جنگلی کبوتر کی گردن پہ کتنے رنگ ہوتے ہیں۔ صبح پیپل کے درخت پر جب روشنی کا سفر شروع ہوتا ہے تو درخت کے پتے اور پتوں کے رنگ کتنی بار اور کب کب تبدیل ہوتے [illegible] ایسی خوبصورت چیزیں دیکھنے کو ملیں کہ اگر قید تنہائی نصیب نہ ہوتی تو شاید ہم نظاروں کی ان نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہتے۔

ہم جب سال سوم میں پڑھتے تھے اچانک ہمارے والد کا انتقال ہو گیا اور فاقہ مستی کے دن آ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی تعلیم کس طرح جاری رکھیں۔ بالکل قلاش تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم مہنگی تھی۔ وہاں پڑھنے کے لئے کافی سرمایہ درکار ہوتا تھا۔ ان دنوں لائل پور میں ایک خاص امدادی فنڈ ہوتا تھا جسے قلعہ فنڈ کہتے تھے۔ جب ہم پہ افتاد پڑی تو ہم نے تعلیم جاری رکھنے کے لئے مالی امداد کی درخواست دی جو منظور ہو گئی اور ہمیں اتنا وظیفہ ملنے لگا کہ اپنی بقیہ تعلیم کے لئے گھر سے کچھ لینا ہی نہ پڑا۔ اس امداد کے لئے بھی ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

اس کے بعد جب سے اب تک اور بہت سے رشتے اس شہر سے پیدا ہوئے۔ لڑکپن اور جوانی کا بہت سا حصہ یہیں گزرا۔ ہماری بڑی بہن مرحومہ کا یہاں گھر تھا اور ہماری تعطیلات کا بیشتر حصہ یہیں گزرتا تھا۔ اس ذریعہ سے یہاں کے بہت سے دوستوں سے مراسم پیدا ہوئے۔ ان میں سے چند خدا کے فضل سے موجود ہیں اور چند ایک مرحوم ہو چکے ہیں، اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں جیسے میر عبدالقیوم مرحوم تھے باری علیگ تھے۔ اور بھی کئی احباب تھے۔

مجھے آج بہت مسرت ہے کہ آپ لوگوں نے باری علیگ مرحوم کو یاد کیا۔ وہ ہمارے ہمعصر بھی تھے، دوست بھی تھے، محترم بھی تھے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں سیاست سے ذرا بھی تعلق ہو اور وہ کسی نہ کسی طرح ان کی تحریر و فکر سے متاثر نہ ہوئے ہوں آج اتفاق سے موقعہ ہاتھ آیا اور ہم نے انہیں یاد کیا۔ (فیض اپنے دوستوں کے ساتھ باری علیگ مرحوم کی قبر پر گئے، فاتحہ پڑھی اور پھولوں کی چادر چڑھائی، مرحوم کی بیگم سے ملنے کے لئے ان کے گھر بھی گئے) مجھے امید ہے کہ آپ باری مرحوم کو فراموش نہیں کریں گے۔ انہوں نے جو کچھ آپ کے شہر اور ہم سب کے لئے کیا ہے اسے یاد رکھنے کی کوئی صورت نکالنا چاہیئے۔ ہم نے لائل پور کے بہت سے دوستوں کی محبتوں سے بہت حاصل کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو تھوڑا بہت کیا ہے اور کچھ لکھا ہے اس میں آپ احباب کے احسانات کا بہت بڑا حصہ ہے، شاید اس ذریعہ سے میں نے تھوڑا بہت بدلہ اتارا ہو بدلہ لوٹایا ہو، دوستی اور رفاقت کا کچھ حق ادا کیا ہو۔ ویسے میں سوچتا ہوں کہ ہم نے کیا بھی کیا ہے۔ شعر لکھنا تو کوئی کمال نہیں، نہ اخبار کی ایڈیٹری کوئی کمال ہے۔ بہت سے لوگ ایڈیٹری کرتے ہیں۔

تھوڑا بہت جو ہم نے کیا ہے اس میں یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولیں۔ زندگی میں غالباً کبھی کبھار یہ مجبوری تو ہو جاتی ہے کہ آدمی سچ نہ بول سکے لیکن اس پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ جھوٹ بولو۔ چنانچہ اگر ہم سچ نہ بھی بول سکیں تو کم از کم جھوٹ نہ بولیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک کلمۂ حق اپنے بس میں ہے ادا کرتے رہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

چوں حرف حق بلند شود دار می رسد

حرف حق کی وجہ سے دار پہ چڑھنے کی ہمت نہیں تو کم از کم جھوٹ تو نہ بولو۔

دوسری کوشش یہ کی ہے کہ کسی قسم کی منافقت یا بد دیانتی نہ کریں کوئی ایسی بات نہ کہیں جس کی وجہ سے اپنے آپ پر یا کسی دوسرے پر اخلاقی طور سے کوئی حرف آئے۔

تیسرے یہ کہ لوگوں سے محبت کی ہے۔ سب سے۔ اس کے علاوہ تو ہم نے کچھ کیا نہیں۔ اگر آپ نے یہ سب قبول کر لیا ہے اور ان داغ ہائے سینہ کی آپ نے کوئی قیمت لگائی ہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ میں پھر ایک بار ان تمام احسانات کے لئے جو لائل پور کے مجھ پر ہیں آپ سب کا احسان مند ہوں۔

'مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخرِ کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

(دستِ تہ سنگ۔ ص ۱۴)

اور پھر بیاں اپنا

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

فیضؔ سے میری پہلی ملاقات

سن ۱۹۳۱ء تھا اور اکتوبر کا مہینہ۔ مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گذرے تھے۔ سابقہ درس گاہ کی خشک تدریسی فضا اور ضبط و نظم سے طبیعت گھٹی گھٹی سی تھی۔ نئے کالج میں آتے ہی طبیعت میں انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ ادب و شعر کا شوق پھر سے ابھرا چنانچہ "بزم سخن" کی وساطت ایک آل پارٹیز مشاعرے کی صدارت پروفیسر پطرس بخاری کے سپرد ہوئی۔ شام ہوتے ہی کالج کا ہال طلبہ سے بھر گیا۔ اسٹیج کے ایک طرف نیاز مندانِ لاہور اپنی پوری شان سے براجمان تھے۔ مقابل میں لاہور کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے صف آرا تھے۔ دونوں جانب سے خوش ذوق حریفانہ شگفتگی ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

روائتی دستور کے مطابق صدر نے اپنے کالج کے طلبا سے شعر پڑھنے کا اعلان کیا دو ایک برخوردار آئے اور بڑے ادب و انکسار سے کلام پڑھ کے چلے گئے۔ اچانک ایک دبلا پتلا منحنی سا لڑکا اسٹیج پر نمودار ہوا، سیاہ رنگ، سادہ لباس، انداز میں متانت بلکہ خشونت چہرے پر اجنبی ہونے کا شدید احساس، ادھر ادھر کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں اتنے میں اس نے کہا، عرض کیا ہے۔ کلام میں ابتدائی مشق کے باوجود پختگی اور اسلوب میں برجستگی تھی، سب نے داد دی، یہ حفیظ ہوشیار پوری تھے۔

پھر ایک نوجوان آئے، گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں شیریں روانی، آنکھیں اور لب بیک وقت ایک نیم تبسّم میں ڈوبے ہوئے۔ شعر پڑھے بڑے ڈھنگ اور تمکنت سے پڑھے، یہ فیضؔ تھے، شاگردوں استادوں سبھی نے اپنے اپنے رنگ میں داد دی۔ شعرا میں کچھ دبے دبے اشارے ہوئے، پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور کے نیاز مندوں سے باتیں کیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں کو دوبارہ اسٹیج پر بلایا، نیا کلام سنا۔ فیضؔ صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی، غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا اچھوتا اسلوب تھا۔

مشاعرہ ختم ہوا، قرار پایا کہ احباب ان دونوں کو ہمراہ لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی گذر چکی تھی، انہیں بورڈنگ میں پہنچنا تھا، بخاری صاحب نے ان کی غیر حاضری کا ذمہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لئے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں، اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا دونوں کامیاب رہے۔

ابھی پورا مہینہ نہیں گذرا تھا کہ کالج کے امتحانات کا آغاز ہوا، جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن پطرس کالج ہال میں مہتمم امتحانات تھے اور ہم جیسے نو تجربوں کو چھوٹے کمرے سپرد کئے گئے تھے۔ مجھے کالج کی دوسری منزل میں متعین کیا گیا، یہاں ایم اے انگلش کے طلبہ تھے اور ان میں فیض احمد فیض بھی تھے۔

امتحان کا کمرہ مقام احترام ہوتا ہے۔ امیدواروں کے ذہنی امتحان کے ساتھ ساتھ ضبط و تنظم کا امتحان بھی ہوتا ہے، سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ میں نے اپنی عادت کو دبانے کے لئے پان کا انتظام کر لیا تھا، مگر فیض صاحب کبھی سوالات کے پرچے پر نظر ڈالتے اور کبھی میری طرف نیم تبسم نظروں سے دیکھتے اور پھر قلم کو اٹھا کر سر کو کھجاتے اور کبھی خاموشی سے اپنے پڑوسیوں کی مزاج پرسی کرتے، کبھی کبھی ان کا بایاں ہاتھ ایسا حرکت کرتا جیسے وہ کسی نامعلوم شے کو ٹٹول رہے ہیں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا وہ اٹھے اور کہا، ہمیں یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے، میں نے کہا میں ابھی بتاتا ہوں۔

اتنے میں پطرس مختلف کمروں کا معائنہ کرتے کرتے میرے کمرے کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے میں تعظیماً پلیٹ فارم سے اتر کر دروازے پر پہنچا، پوچھا، سب کچھ ٹھیک ہے۔

میں نے کہا جی،

بولے "CARRY ON"

میں نے عرض کیا۔ پروفیسر صاحب (میں انہیں پروفیسر صاحب کہا کرتا تھا)

بعض طلبہ سگریٹ پینا چاہتے ہیں، اجازت ہے؟

پطرس نے میرے کان میں دبی آواز میں کہا۔

"جب تک پروفیسر جودھ سنگھ اس کالج پرنسپل نہیں بنتے اس وقت تک پی سکتے ہیں"

اور پھر مسکرا کر چلے گئے۔

میں نے اندر آتے ہی فیضؔ صاحب کی طرف دیکھا اور اشاروں سے سگریٹ نوشی کا اعلان کیا۔
فیضؔ صاحب کے ہاتھ میں فی الفور ایک سگریٹ نمودار ہوا، جیسے قلم ہی سے ابھر آیا ہو۔
پھر قلم کے رش اور سگریٹ کے کش میں مقابلہ شروع ہوا۔ اور اس کش مکش میں معطر دھویں کے غبارے پورے کمرے میں پھیل گئے، میں معلّم تھا میں ضبط و نظم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بیٹھا رہا اور قوام دار پان کو چھوڑ کر، اس خوشبو سے اپنے ذوق سگریٹ نوشی کی تسکین میں محو ہو گیا۔
کیا معلوم تھا کہ دھویں کے یہ غبارے کالج کی چار دیواری سے نکل کر دُور دُور تک فضا میں پھیل جائیں گے اور ان میں سگریٹ پینے والے کے معطر انفاس کی خوشبوئیں بھی لہرائیں گی اور ہنر و فن اور ادب کی دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیں گی۔

پیر حسام الدین راشدی

یہ فیض کا دور ہے

یہ جو آپ کے سامنے مرزا صاحب موجود ہیں بڑے خطرناک آدمی ہیں۔ میں محض اس نیّت سے آیا تھا کہ فیضؔ صاحب سے ملوں اور اُن سے کچھ خاص باتیں کروں۔ یہاں پہنچا تو کسی اجازت یا پیشتر اطلاع کے بغیر انھوں نے مجھے صدارت کی کرسی پر بٹھادیا۔ ایک تو اس کرسی میں استقلال نہیں، دوسرے جب انسان کو صدارت کی چاٹ پڑجاتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے خراب ہوجاتا ہے۔ مرزا صاحب مجھے خراب کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

میں آپ کے سامنے حاضر ہوں اور ہمیشہ حاضر رہتا ہوں۔ کبھی میں آپ سے لڑتا ہوں اور کبھی آپ مجھ سے۔ نوبت تو تو میں میں تک کی آجاتی اور بات اخبارات تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن یہ سب محبت کی چہلیں ہیں۔ مجھے آپ لوگوں سے محبت ہے اور آپ کو مجھ سے۔ ہم کبھی جدا نہیں ہوسکتے۔ کبھی میں دانستہ کچھ کہہ دیتا ہوں، کبھی کچھ حقیقتیں بیان کرتا ہوں دانستہ اس لئے کہ آپ کو جگاؤں تاکہ آپ کچھ سوچیں۔ میں ہمیشہ ایسے مسائل چھیڑ دیتا ہوں جن کی وجہ سے مہینوں میرے دوست بحث کرتے رہتے ہیں۔ بحث کچھ لایعنی ہوتی ہے، کچھ اس میں سے نکتے نکل آتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آج حاضر ہوا ہوں تو اپنی داستان بھی سنادوں

میں نے تاریخ ادب اردو پڑھی ہے۔ بڑے غور سے اور بہت اچھّی طرح۔ اساتذہ نے اردو ادب کے مختلف ادوار مقرر کئے ہیں مثلاً حاتمؔ، آبروؔ، دردؔ، میرؔ وغیرہ کے ادوار۔ میرے خیال میں اردو ادب کا موجودہ دور فیضؔ کا دور ہے۔ تاریخِ ادب اردو میں اسے فیضؔ ہی کا دور لکھا جائیگا۔ موجودہ دور سے میری مراد وہ

دور ہے جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا ہے۔ یا یوں کہئیے کہ جب سے ہماری اردو شاعری نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ میں اردو اور فارسی شاعری کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور اُسی حیثیت سے اپنا ذاتی نقطۂ خیال پیش کر رہا ہوں۔

میری نظر میں تین شاعر ایسے ہیں جن کے کلام کی خوبیاں گنوانا چاہیں تو الفاظ احساسات کا پوری طرح ساتھ نہیں دیتے۔ ادبی اصطلاحات کی مدد سے انھیں بیان تو کیا جاتا ہے مگر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ دلی جذبات کی پوری طرح ادائیگی نہیں ہو پاتی۔ وہ تین شاعر ہیں:۔ حافظ شیرازی، مرزا اسد اللہ خاں غالب اور فیض احمد فیض۔

حافظ کا دیوان مختصر ہے۔ اس کے کلام میں جو سُرور، نشہ اور احساس ہے وہ الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ پھر غالب کا نمبر آتا ہے۔ غالب کا دیوان اور بھی مختصر ہے۔ بہت چھوٹا۔ اور وہ خود کہتا ہے کہ میرا اردو کلام ہیچ پوچ ہے، فارسی کلام پڑھو۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے کلام میں عجیب سحر، جذب، کشش اور ندرت ہے۔ الفاظ کی تشکیل و نشست ایسی ہے کہ بلا کا جادو معلوم ہوتا ہے۔ جب مجھے تیس ۳۰ روپے کی ملازمت ملی اور میں سکھر کی چلچلاتی دھوپ برداشت کرتے ہوئے وہاں مقیم تھا تو غالب ہی کو پڑھتا اور اس سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ تیسرا شاعر فیض ہے۔ ان کے پانچ دواوین ہیں جنھیں دیوان کی بجائے دیوان زادے کہنا چاہیئے کیونکہ بہت مختصر ہیں۔ فیض نے شاعری برائے شاعری نہیں کی۔ وہ ایک مقصد کے تحت شعر کہتے ہیں۔ ان کے مقصد میں تسلسل ہے۔ ان کی شاعری موجودہ دور کے تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی تراکیب شعری میں ایک خاص کیف اور حُسن ہے۔

کچھ عرصہ ہوا لاہور کے قلعہ میں ایک سیمینار ہوا اور اس کے بعد گانے کی ایک محفل جس میں ایک خاتون نے فیض کی دو غزلیں سنائیں۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے۔ میں نے اپنی زندگی میں نہ کوئی عشق کیا ہے، نہ کوئی مجھ پر عاشق ہوا ہے۔ نہ میں نے فراق کی صعوبتیں جھیلی ہیں نہ وصال کا مژدہ سنا ہے۔ رقیب روسیاہ کو دیکھا ہے نہ دربان سے واسطہ پڑا ہے مگر خدا شاہد ہے فیض کی یہ دو غزلیں سن کر میں رات بھر روتا رہا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ کن احساسات اور جذبات نے مجھے رات بھر رلایا۔ مجھے یقین ہے آپ مجھ سے کامل اتفاق کریں گے کہ یہ دور فیض کا دور ہے۔

کرشن چندر

فیضؔ سے ملاقات

مئی ۱۹۶۷ء میں مجھے پہلی بار سوویت ادیبوں کی کانگریس میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ چینی ادیبوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر ملک کے مندوبین آئے تھے۔ ان مندوبین کی حیثیت سوویت ادیبوں سے مختلف تھی۔ ہم لوگ نہ ووٹ دے سکتے تھے، نہ الیکشن میں حصہ لے سکتے تھے۔ سوویت ادیبوں کی کانگریس میں یہ حق اور بجا طور پر یہ حق صرف سوویت ادیبوں کو حاصل تھا، مگر دوسری تمام کارروائیوں میں ہم لوگ حصہ لے سکتے تھے۔ پاکستان سے فیض احمد فیضؔ اور ہندوستان سے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔

(FEDIN) فیدن کانگریس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ سوویت ادیبوں کی چوتھی کانگریس تھی۔ اراکینِ صدارت میں شولوخوف، بورس پولی والی، رسول گم زادے، میرزا ابراہیم، کربا بیاتف اور دیگر یورپی اور ایشیائی سوویت ریاستوں کے مندوبین کو جگہ دی گئی تھی۔ کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں روسی حکومت کے صدر اور روسی حکومتِ کابینہ وزیرِ اعظم سمیت شامل تھی۔ جو بات مجھے اچھی لگی، وہ صرف یہی نہ تھی بلکہ یہ بھی کہ اس کانگریس میں شروع سے آخر تک ادیبوں کو اہمیت حاصل تھی۔ روسی کابینہ کے اراکین کو وزیرِ اعظم سمیت ادیبوں کے پریزیڈیم کے پیچھے جگہ دی گئی تھی۔ اوّلین اہمیت ادیبوں کو حاصل تھی۔ ہمارے ملک میں اوّل

تو حکومت کی طرف سے ادیبوں کی کوئی کانگریس ہی منعقد نہیں کی جاتی اور اگر کسی ادبی اجتماع میں وزراء شریک بھی ہوتے ہیں تو ڈائس پر انہیں سب سے آگے جگہ دی جاتی ہے اور ادیبوں کو پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ اخباروں میں صرف وزیروں کی تقریریں شائع ہوتی ہیں اور ادب اور کلچر کے متعلق کسی ادیب نے کسی ادبی اجتماع میں کیا کہا، اسے ایک سرے سے گول کر دیا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے وزیر قابلِ احترام نہیں ہیں لیکن ادیبوں کی محفل اور ان کے ادبی اجتماع میں ادیبوں کی بحث و تمحیص کو زیادہ اہمیت حاصل ہو تو بہتر ہے۔ سوویت ادیبوں کی یہ کانگریس چار دن تک جاری رہی اور ہر روز بیشتر سوویت اخبار اس کی کارروائیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ ہمارے یہاں کے اخبار اوّل تو ادبی خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اگر کسی ادبی اجتماع کی خبر چھاپتے بھی ہیں تو کسی غیر اہم صفحے پر، یک کالمی سُرخی کے ساتھ۔ یوں کہنے کو تو ہم پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب اور کلچر کے وارث ہیں، لیکن اس ملک میں کلچر اور تہذیب کے وارثین کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب شولوخوف تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو سارے ہال میں بیٹھے ہوئے مندوب مع روسی کابینہ اور وزیرِ اعظم ان کی عزت افزائی کے لئے کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ وہ لوگ اپنے ادیب کا منصب اور اس کی اہمیت پہچانتے ہیں اور اسے اپنے سماج میں قابلِ عزت مقام دیتے ہیں۔ شولوخوف کو تعظیم دے کر وہ لوگ دراصل اپنے ملک کے ادب اور کلچر کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔

یہ کانگریس ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے بعد منعقد ہوئی تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیئے۔ حالانکہ میرے وہم و گمان میں یہ بات نہ تھی، مگر ممکن ہے منتظمین کے ذہن میں یہ بات رہی ہو۔ میں اور فیض دونوں ہوٹل مسکوا میں ٹھہرے ہوئے تھے، مگر ایک دوسرے سے ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ پہلی شام جب میں مسکوا ہوٹل کے دسیع و عریض ڈائننگ ہال میں کھانے کے لئے گیا تو دیکھا کہ ہر ملک کے مندوبین کے لئے ایک میز الگ سے سجی ہوئی ہے اور اسی میز پر اس ملک کا ایک چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ میں نے دیکھا تو کہیں آس پاس پاکستان کی میز اور ہندوستان کی میز میں کم سے کم تیس اور میزوں کا فاصلہ تھا۔ میں مسکرا کر چپ رہا اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ فیض ابھی میز پر آئے نہ تھے۔

پہلے پندرہ بیس منٹ مشروب پینے میں گزرے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ فیض کسی دوسرے اور دور کے دروازے سے داخل ہو کر اپنی میز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے میری طرح چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ غالباً انہیں بھی کسی دوسری میز کی تلاش تھی۔ یکایک میری اور فیض کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، میں اپنی کرسی سے۔ اس وقت سارا ہال ہم دونوں کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ میں اپنی میز سے ہندوستان کا فلیگ لئے اٹھا اور فیض اپنی میز سے پاکستان کا فلیگ لئے اٹھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے میزیں پار کرتے ہوئے بیچ کی کسی میز پر آکر رک گئے۔ اس میز پر ہم دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کا جھنڈا ساتھ ساتھ لہرا دیا اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

سارا ہال تالی پیٹنے لگا۔

یہ تالی اس وقت تک بجتی رہی جب تک فیض اور اس کی ترجمان، میں اور سلمیٰ اور ہماری ترجمان ایرینا اس میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔

"کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ یہ ہم لوگ بھی کیا متعصب سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ ادب میں یہ دشمنی نہیں چلتی اور کاش کہیں بھی نہ چلے۔"

میں نے کہا "مگر اس بدقسمتی کو کیا کہیے کہ تمہاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان میں ہوتی ہے، نہ پاکستان میں۔ اور ہوتی ہے تو صرف ماسکو میں!"

"ان لوگوں کو چاہیے" فیض نے ہنس کر کہا۔ "اپنے روسی ادیبوں کی کانگریس ہر سال منعقد کیا کریں۔ اسی بہانے مل لیا کریں گے۔۔۔" میری طرف جھک کر پوچھا۔ تمہاری ترجمان تو بڑی خوبصورت ہے۔ کہاں سے اینٹھی ہے"

میں نے کہا۔ "بدل لو۔ مگر یاد رکھنا یہ یہودن ہے!"

ہم سب ہنسنے لگے۔ پھر جام سے جام ٹکرانے لگے۔ دو جھنڈے ساتھ لہرانے لگے۔ اتنے میں جنوبی افریقہ کے مشہور ناول نگار ایلیکسی لاگوما ہاتھ میں کوئی ایک کا جام اٹھائے ٹوسٹ پیش کرنے کے لئے ہماری میز پر آ گئے۔ پھر کہیں سے رسول حمزہ زادے کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ رسول

گم زادے کا شمار سوویت شاعروں کی پہلی صف میں ہوتا ہے۔ ہندوستان آ چکے ہیں اور اردو کے صرف دو لفظ جانتے ہیں: "مشہور شاعر"۔ چنانچہ ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے اور منہ چومتے ہوئے بولے: "مشہور شاعر فیض احمد فیض"۔ "مشہور شاعر کرشن چندر"۔ "مشہور شاعر سلمیٰ صدیقی"۔

پھر ہماری ترجمان کی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے ہوئے پوچھنے لگے: "مشہور شاعر ——— ؟"

میں نے کہا: "ایرینا"۔

"ایری نچکا"۔ رسول گم زادے نے اس نام کو اور بھی پیار سے لیا اور اس کے قریب کرسی گھسیٹ لی۔

پھر اور لوگ آتے گئے۔ تھوڑی دیر میں ہماری میز پر پانچ سات جھنڈے جمع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جتنے بھی دن ہم ہوٹل مسکوا میں رہے، میری اور فیض کی میز ایک ہی رہی۔ ہندوستان اور پاکستان ایک ہی میز پر کھانے کھاتے رہے۔

☆

کانگریس میں اتنے ملکوں کے اتنے ادیبوں سے ملاقات ہوئی کہ نہ اب ان کے نام یاد ہیں، نہ چہرے، صرف چند چہرے یاد ہیں۔ ان میں آنا سگھرز کا چہرہ بہت نمایاں ہے۔ حلاوت میں ڈوبا ہوا ممتا بھرا چہرہ۔ سفید بالوں میں سیدھی مانگ اور بے ترتیب بال۔ بالکل ہندوستانی خاندان کی بڑھیا لگتی تھیں۔ اور شولوخوف، مجھ سے بھی پستہ قد، مگر فراخ ماتھا آئن سٹائن سے ملتے جلتے اور ملیکسن بال، چہرے پر گہری گمبھیرتا اور پابلو نرودا کا نیم ایشیائی نیم یورپی چہرہ، آنکھوں میں گہرا کرب لئے۔ ایلیا ایرن برگ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ ان دنوں اٹلی گئے ہوئے تھے، دوبارہ جب میں روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں گیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ روسی ادیبوں میں وہ سب سے زیادہ تیکھے اور نزاعیہ لہجے میں اپنی بات کہتے تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ ان سے خفا رہتے تھے۔ روسی ادیبوں میں وہ سب سے زیادہ کانٹی نینٹل تھے اور خاصے خودسر۔ ان سے بات کرنے میں مزہ آتا تھا۔ کیونکہ برسوں پیرس میں رہ کر فرانسیسی مزاج کا رنگ بھی ان کے اسٹائل میں داخل ہو چکا تھا۔ جیسے محض بات کرنے کی خاطر بات کرنا پسند ہے۔

☆

کانگریس میں روس کی تمام اہم زبانوں کے ادب پر سیر حاصل تبصرے تو ہوئے ہی. لیکن ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی نمائندوں کو بھی ان کے اپنے ملک کے ادب پر تقریر کرنے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ وقت کم تھا اور تقریباً تمام ملکوں کے نمائندے حاضر تھے۔ اس لئے انتخاب کرنا پڑا۔ ایشیا سے آئرش منگولیا۔ جاپان۔ شمالی کوریا۔ ویت نام۔ ہندوستان اور پاکستان کو چنا گیا صرف میں نے تقریر کی۔ بعد میں میری تقریر ایک پمفلٹ کی صورت میں شولوخوف اور دوسرے دو روسی ادیبوں کے ساتھ شائع کی گئی اور یوں مجھے شولوخوف کے ساتھ چھپنے کا فخر حاصل ہوا۔

☆

کانگریس کی آخری کارروائی الوداعی ڈنر پر منتج ہوئی یہ ڈنر کریملن کے ایک بہت بڑے ہال میں رکھا گیا تھا۔ دو ہزار سے زیادہ مہمان جمع ہوں گے۔ شیمپین اور کیویی آر۔ قہقہے۔ اور لباس فاخرہ۔ دنیا بھر کے دانشور ایک ہال میں جمع تھے۔ فیدن مرکزی میز پر کھڑے مہمان خصوصی کے نام پکار رہے تھے۔ کانگریس بخیر وخوبی سرانجام پا چکی تھی اس لئے دل بالیدہ تھے اور ہونٹوں پر تبسم۔ فیدن نے سب سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مرکزی میز پر آنے کی دعوت دی۔ فیض، سلمیٰ اور میں، ایرینا اور مریم سلگانیک کو لئے وہاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں گہما گہمی اتنی بڑھ گئی کہ مرکزی اور دوسری میزوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا۔ ادیب اور دانشور ایک میز سے دوسری میز پر آ جا رہے تھے شیمپین پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ زبانیں کھل گئی تھیں۔ سلمیٰ اور ایرینا کو لوگوں نے گھیر لیا تھا اور ٹوسٹ پر ٹوسٹ پرپوز کئے جا رہے تھے، شاعرانہ انداز میں، بہکتے ہوئے جملوں میں، مختلف ملکوں کی شاعری جارجیائی شراب کی طرح اُمڈ آئی تھی۔

☆

جدائی کی گھڑی آ پہنچی۔ دوسرے دن فیض کو دلی آنا جانا تھا اور مجھے اور سلمیٰ کو آذربائیجان۔ ہم دونوں یوکرائینا ہوٹل کے وسیع وعریض لاؤنج میں ایک دوسرے سے اس شدت سے بغلگیر ہوئے اور اتنی دیر تک بغلگیر رہے کہ جب صدیوں کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے عرصے

کے بعد ایک دوسرے سے بادل نخواستہ جدا ہوئے تو ہمارے ارد گرد کوئی ساٹھ ستر دوسرے ملکوں کے ادیبوں کا گروہ اکٹھا ہو چکا تھا اور گو میری اور فیضؔ کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن ہمارے ارد گرد ہر آنکھ پُرنم تھی۔

شاید اس وقت بہت سے ملکوں کے دانشوروں کو احساس ہوا تھا کہ گو ہم ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔ لیکن اندر سے ہمارا جو اتنا پرانا رشتہ تھا وہ کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ فیضؔ نے اپنی جیب سے کاغذ کے دو پُرزے نکال کے مجھے دیئے اور کہا "یہ میری دو نئی نظمیں ہیں۔ یہ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ایک سجادؔ ظہیر کو دے دینا، دوسری سردار جعفری کو۔ یہ دونوں نظمیں کہیں نہیں چھپی ہیں۔ پاکستان میں بھی نہیں۔ میں نے ماسکو میں کہی ہیں" پھر آخری بار زور سے مصافحہ کیا اور بڑے مضبوط لہجہ میں بولے "یہ جدائی عارضی ہے دوست۔ ہم پھر ملیں گے۔"

۱۹۷۱ء کی روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں فیضؔ نہیں آئے۔ ہم نے ان کا بہت انتظار کیا۔ ایک تار بھی آیا کہ وہ آرہے ہیں۔ مگر فیضؔ نہیں آئے۔ اس دن یوکرائینا کی آخری ملاقات کے بعد میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ مگر اب لگتا ہے کہ وہ جدائی عارضی تھی، ملن کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ کیونکہ گذشتہ چوبیس برس نفرت اور جنگ و جدل کے باوجود کوئی ایک تار ہے دلوں کے اندر جو نہیں ٹوٹا ہے اور ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان میں محبت پھر ابھرے گی۔ کوئی مانے نہ مانے مگر یہ وقت کا تقاضہ ہے۔ اس لئے لوحِ تقدیر ہے۔

ابراھیم جلیس

بہت گھنا بہت سایہ دار درخت

برسوں پہلے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دوزخی جولائی کی ایک تپتی جھلستی دوپہر میں پاپیادہ راجستان کے لق و دق بھیانک ریگزار سے گذر رہا تھا۔ پسینے میں شرابور، کڑی دھوپ سے بولایا ہوا اور جاں بہ لب۔۔۔ یوں لگ رہا تھا کہ زندگانی اب جھلس کر راکھ ہوئی کہ اچانک ایک ٹیلے سے اترتے ہوئے دور ایک بڑا گھنا سایہ دار درخت مجھے نظر آیا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے سائے میں پہنچا تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھے دوسری زندگی مل ہے۔ اس درخت کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں حیات تازہ بن کر میرے جھلستے دم توڑتے ہوئے جسم کو نئی توانائی عطا کر گئی ہے۔

پھر جب میں آبادیوں میں پہنچ گیا تو اس زندگی بخش سایہ دار درخت کو اس وقت تک بھولا رہا جب تک کہ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان نہ پہنچا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ بھرے پرے شہر لاہور کے بیچوں بیچ بے گھری، بے سروسامانی اور بے روزگاری کی چلچلاتی کڑی دھوپ اور ہمیشہ سائے کی طرح ساتھ چمٹی ہوئی خفیہ پولیس کے عقاب میں پھنس کر دم توڑا جاتا تھا کہ پھر اچانک ایک اور چھتنار ایک اور سایہ دار درخت مجھے نظر آیا۔ جس کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کی محبت بھری باہوں میں مجھے ایک بار پھر حیات تازہ مل گئی تھی۔

وہ دوسرا چھتنار درخت بہت گھنا اور بہت ہی سایہ دار درخت فیض احمد فیضؔ ہے۔

اوروں کے لئے تو فیض کی شخصیت زندگی بخش ہے۔ ان دنوں عوامی جمہوریہ چین کو آزاد ہوئے سال بھر کا عرصہ بھی نہیں گذرا تھا۔ دادا فیروز الدین منصور مرحوم نے مجھے ہدایت کی کہ میں چین کے بارے میں ایک جلسۂ عام میں اپنا مضمون پڑھوں۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ اس جلسہ کی صدارت فیض احمد فیضؔ کریں گے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس جلسے میں میں نے ایک بڑا جوشیلا مضمون پڑھا جس کے آخری جملے یہ تھے۔

"تو اب چیانگ کائی شک ہو یا پنڈت چیانگ کائی شک انہیں جنرلسمو چیانگ کائی شک

کا حشر اپنے سامنے رکھنا ہوگا اور وہ دن دور نہیں جب راوی اور گنگا کے ساحلوں پر خمیدہ کمر کسان ایک بار تن کر کھڑا ہو جائے گا تو ان چانگ کائی شکوں کو سر چھپانے کے لئے کوئی فارموسا بھی نہیں ملے گا۔"

فیض صاحب نے جلسے کے بعد مجھے گلے لگا لیا۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ دادا منصور کے کہنے پر فیض صاحب نے مجھے امروز کی سب ایڈیٹری پر مامور کر دیا اور انہی دنوں امروز چونکہ کراچی سے نکلنے والا تھا اس لئے میں بھی کراچی آ گیا۔

پھر بار بار فیض صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اور میری حسرت ہی رہ گئی کہ میں فیض صاحب کو کبھی غصے میں دیکھوں، کبھی اداس اور پژمردہ دیکھوں۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہمیشہ پرسکون مسکراتا چہرہ چھوٹوں کے لئے بڑی پر شفقت مسکراہٹ۔

صرف میرے اکیلے ہی کے لئے نہیں، اور صرف پاکستان یا ہندوستان کی نئی نسل کے لئے ہی نہیں بلکہ کراچی سے کیوبا اور کیوبا سے ٹوکیو تک رجعت پرستی کی چلچلاتی کڑی دھوپ میں تیسری دنیا کے ادب اور سیاست کے لق و دق ریگزاروں کے بیچوں بیچ فیض احمد فیض جلتی بھنتی جھلستی ترقی پسند نئی نسل کے لئے بھی بلاشبہ ٹھنڈی میٹھی حیات بخش چھاؤں والا ایک گھنیرا درخت ہی ہے۔

دنیا میں بعض لوگ بلکہ اکثر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جس سایہ دار درخت کی چھاؤں میں سوتے ستاتے اور تازہ دم ہوتے ہیں اسی محسن اور اسی حیات تازہ بخشنے والے درخت کی جڑ پر کلھاڑے چلاتے ہیں اس کی ٹہنیاں توڑتے ہیں اور اس کے پتے نوچتے ہیں۔ مگر جس طرح کلہاڑوں کی ضرب کے باوجود درخت ہوا میں جھومتا لہراتا رہتا ہے اور کلہاڑے برسانے والوں کو بھی سایہ پہنچاتا ہے اسی طرح فیض بھی اپنے ایذا رسانوں کو اپنے سایۂ شفقت سے کبھی محروم نہیں کرتا۔

کہتے ہیں کہ ہر انسان محبت اور نفرت دونوں جذبوں کی خمیر سے اٹھتا ہے لیکن میں نے فیض صاحب کی آنکھوں میں کبھی بھی اپنے بڑے سے بڑے دشمن کے لئے نفرت کی ہلکی سی آنچ بھی نہیں دیکھی۔ ہمیشہ مسکراتے ہونٹ، سراپا پرسکون چہرہ اور مخصوص انداز میں کھنکھارنا اور شیریں لہجے میں پوچھنا۔

"کہو بھئی...... کیسے ہو؟"

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میں پیار، خلوص، نیکی، سچائی اور ہمدردی کو اکھٹا دیکھنا چاہتا ہوں تو میں

اسے فوراً مشورہ دوں گا کہ پہلی فرصت میں فیض احمد فیضؔ سے مل لے۔

اس دور میں فیضؔ کا دم بڑا غنیمت ہے یارو۔ ہماری زمین پر اس اندھیرے میں اب فیضؔ اکیلا ہی تو بڑا روشن اور بڑا راہ نما چراغ ہے۔ اور اس چلچلاتی دھوپ میں فیضؔ تنہا ہی تو بڑا حیات افزا سایہ ہے یارو۔

آؤ یارو.... زندگی کی اس تیز چلچلاتی دھوپ میں اس ٹھنڈے میٹھے سائے میں تازہ دم ہولیں۔

آؤ کہ دعا کریں کہ فیضؔ کی زندگی کے چراغ کی لو اور بڑھے، اتنی بڑھے کہ اس کے اجالے کے ساتھ ساتھ ترقی کا راستہ بھی بڑھتا ہی بڑھتا نکھرتا ہی نکھرتا چلا جائے۔

یارو.... یہ چراغ بہت جلے

یارو.... یہ زندگی بہت جئے

اٹھاؤ یارو.. فیضؔ کی حیات دوام کے لئے ایک بھرپور چھلکتا جام

اختر جمال

بھائی کی کہانی، بہن کی زبانی

فیض کی سب سے بڑی بہن بیگم شجاع الدین کی عمر اس وقت اسی برس ہے خاندان میں بی بی گل کہلاتی ہیں۔ اختر جمال نے میری درخواست پر ایبٹ آباد میں بی بی گل سے مل کر فیض اور ان کے خاندان کی بابت گفتگو کی اور یہ مضمون تیار کیا جس کے لئے میں ان کا احسان مند ہوں۔ م ط ح۔

ایبٹ آباد میں داخل ہوتے ہی پہاڑوں کا ایک سلسلہ دائیں اور بائیں جانب سے گلے لگاتا نظر آتا ہے۔ دائیں طرف کا سلسلہ سربن کہلاتا ہے، اس کی ڈھلانوں پر کچے مکان ہیں جن میں سر شام دیئے روشن ہوجاتے ہیں۔ اس وقت یہ پہاڑ اپنے دامن میں شرارے لئے ملگجے اندھیرے میں نہایت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ سردیوں میں جب برف گرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے پہاڑ اپنے قوی شانوں پر سفید چادر لپیٹے بڑے وقار سے کھڑا ہے اور سورج کی پہلی کرن آسمان سے اتر کر سب سے پہلے اس کے قدم چومتی ہے اور ہر طرف صبح کا دودھیالہ اجالا پھیل جاتا ہے۔ یہاں کے باسی اس کے گلے لگ کر اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں یہ پہاڑ حوصلے اور استقامت کی علامت بنا ہوا ہے۔

سربن کے دامن میں ہمارے محبوب شاعر فیض احمد فیض کی بڑی بہن بی بی گل کا گھر ہے۔ کسی زمانے میں ان کے گھر کی کنڈی بجاتے ہی خونخوار شکاری کتوں کی بھوں بھوں سنائی دیتی تھی۔ بڑی بڑی بطخیں اپنی لمبی لمبی چونچیں اٹھا کر قطار میں قیں قیں کرتی اس طرح آگے بڑھتی تھیں گویا دروازہ کھلتے ہی حملہ کر دیں گی۔ ان دنوں یہ گھر اچھا خاصا چڑیا گھر لگتا تھا۔ بی بی گل کے چہرے پر عبادت اور ریاضت کا نور ہے، دل میں شفقت اور محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو ان کی بیٹی اور نواسیوں ہی کو نہیں گھر کے پلے ہوئے پرندوں چرندوں کو بھی محسوس ہوتا ہوگا۔

میں نے بی بی گل کو پہلی بار اس دعوت میں دیکھا جو انہوں نے اپنی بیٹی سعادت کی (میجر سرور سے)

شادی کے سلسلے میں دی تھی۔ سفید لباس میں جنت کی حور معلوم ہو رہی تھیں۔ شادی کے بعد سعادت اسکول آئیں اور ہم سب نے ان سے بی بی گل کی تعریف کی تو ہنس کر بولیں بھئی یہ بڑی زیادتی ہے۔ دلہن میں بنی تھی اور تعریف تم لوگ میری ماں کی کر رہے ہو۔ پھر کہنے لگیں۔ یہ سچ ہے میری ماں بہت خوبصورت ہیں۔ ذرا سوچو وہ جوانی میں کتنی حسین ہوں گی۔

اسکول چھوڑا تو سعادت کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ کچھ عرصے بعد سعادت نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔ لیکن جب میرا گجرات سے ایبٹ آباد کالج تبادلہ ہوا تو کالج کی دیوار اور سعادت کے گھر کی دیوار ایک تھی۔ جب بھی ادھر ادھر ملاقات ہوتی بہت محبت سے گھر بلاتیں اور کہتیں فرصت کے اوقات میں آجایا کرو۔ گپ لگائیں گے لیکن مصروفیت کی وجہ سے میں صرف دو تین بار ہی ان کے گھر جا سکی۔ اب کی بار جو گئی تو خیال تھا کہ بی بی گل مجھے بھول گئی ہوں گی۔ سعادت نے میرا تعارف کرانا چاہا تو بولیں "ہمیں آپ بہت اچھی طرح یاد ہیں بلکہ کاکول کے مینا بازار میں پان کی ایک دوکان پر آپ نے ہمیں پان کھلایا اور کہا تھا فیض کے متعلق آپ کا کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ ہمیں آپ کا بہت انتظار رہا مگر آپ اس کے بعد نہیں آئیں۔ ہم سمجھے بھول بھال گئی ہونگی" نہیں بھولی نہیں۔ دیکھئے آ ہی گئی"!

باتیں کرنا ایک فن ہے۔ سعادت جیسی دلچسپ باتیں کرنا مشکل فن ہے۔ ہمارے اسٹاف روم کی رونق ان کے دم سے تھی۔ بیتے دنوں کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ استانیاں، پادری بچے وغیرہ۔ میں نے سعادت سے کہا اب تم مجھے بی بی گل سے فیض صاحب کی کہانی سننے دو۔ سعادت نے کہا ہماری اماں بہت اچھی کہانیاں سناتی ہیں۔ بی بی گل نے مسکراتے ہوئے کہا "فیض کو بچپن میں کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا" سعادت نے ہماری دعوت کے لئے خود جو پکایا تیار کیا تھا ہمیں کھلانے لگیں باتوں باتوں میں جوش صاحب کی دعوت کا قصہ سنایا کہ وہ جب ایبٹ آباد آئے تو میں نے اس خیال سے کہ انکل فیض سے ان کے گہرے تعلقات ہیں ان کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان کے لئے سب کچھ خود پکایا۔ مگر جوش صاحب وعدے کے باوجود نہیں آئے۔

اس پر مجھے یاد آیا گجرات کالج میں طالبات کے بہبودی فنڈ کے لئے ایک مشاعرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہماری فارسی کی لیکچرار مسز سعیدہ عروج مظہر جو خود بھی شاعرہ ہیں اس کام میں پیش پیش تھیں۔ طالبات نے بڑی محنت کی تھی۔ کالج کو خوب سجایا اور پنڈال کو خوب آراستہ کیا۔ مشاعرے کے بعد فیض صاحب

اور دوسرے شاعروں کی کھانے کی دعوت تھی۔ لڑکیوں کو انہیں دیکھنے سننے اور ان کے دستخط لینے کی بڑی آرزو تھی۔ سارا دن لڑکیاں فیض ہی کا کلام گا گا کر کھانا پکاتی رہیں اور دوسرے کام کرتی رہیں۔ مغرب کے وقت مسز عروج باورچی خانے میں آئیں اور مجھ سے بولیں تم ناحق دھوئیں میں آنکھیں لال کر رہی ہو فیض صاحب نہیں آئیں گے"۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر کیوں نہیں آئیں گے؟"

"انہیں تو گجرات کے ڈپٹی کمشنر اپنے ساتھ لے گئے ہیں"۔ "آپ نے جانے کیوں دیا؟ روکا ہوتا اور بتایا ہوتا کہ لڑکیاں..." "میں کیا کہتی۔ ڈپٹی کمشنر نے پورے اسٹاف کو مدعو کیا ہے، تم بھی چلنا" "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ نے فیض صاحب کو یہ تو بتایا ہوتا کہ لڑکیوں نے ان کی دعوت کا اہتمام کیا ہے وہ شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ سب کا ڈپٹی کمشنر کے ہاں انتظام ہے"۔

مسز عروج کو طیش آگیا۔ بولیں "تم نے تو آرام سے سگھڑ گھر ستن بن کر باورچی خانہ سنبھال لیا۔ میں اتنے دنوں سے شاعروں کے پیچھے دھوپ میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ تم ایک شاعر کو بھی بلاؤ تو پتا چلے کہ کتنا مشکل کام ہے۔ فیض صاحب کے ہاں چلچلاتی دھوپ میں گئی تو انہیں ترس آگیا اور حاضرین میں سے کسی سے کہا بھئی پہلے انہیں اندر لے جا کر ان کا منہ ہاتھ دھلواؤ پھر بات کریں گے بے چاری کا گرمی سے برا حال ہے۔ اگر میں ہمت نہ کرتی تو مشاعرہ ہی نہ ہوتا"۔

میں نے مسز عروج کو منانے کی کوشش کی اور لڑکیوں کو بھی سمجھا بجھا کر راضی کیا اور انہیں یقین دلایا کہ فیض صاحب وعدہ خلاف نہیں ہیں ضرور آئیں گے۔ میں سب کے آٹوگراف البم اسٹیج پر پہنچا دوں گی اور مسز عروج ان پر فیض صاحب کے دستخط لے لیں گی۔ اس دعوے سے طالبات کی تسلی ہوئی اور لڑکیاں پھر اسی طرح فیض کا کلام گا گا کر کام کرنے لگیں۔

اس مشاعرے کے لئے فیض صاحب اپنی گاڑی میں آئے تھے اور سلیمہ اور شبنم عابد علی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سلیمہ ہم سب کو بہت پسند آئیں اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ فیض صاحب کی شاعری کا سارا حسن ان کی بیٹی میں زندہ ہو کر سانس لے رہا ہے۔ یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ شہر والوں نے اسے گجرات کی تاریخ کا یادگار مشاعرہ قرار دیا۔

آپ کو یاد ہوگا جوش صاحب اور فیض کی دعوت اور مشاعرے کی باتوں سے پہلے بی بی گل کا تذکرہ

ہو رہا تھا۔ ہاں تو بی بی گل نے بتایا "کسی زمانے میں ایک راجپوت راجہ ہوا کرتا تھا اس کا نام راجہ سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارنپور سے تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا۔ ہمارے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ ہمارے پردادا کا نام سربلند دادا کا صاحبزادہ خاں اور والد کا سلطان محمد خاں تھا۔"

"ہمارے والد کی شخصیت بہت شاندار تھی، صحت مند اور گورے چٹے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی ڈاکٹر مسز ہملٹن نے ایک ناول[1] لکھا ہے جس میں ہمارے ابا کا ذکر ہے۔ افغانستان میں ۱۲ سال ملازمت کی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنی بھتیجی سے شادی جن کا نام سائر جان تھا اور وہ سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی تھیں مگر شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا اور کابل سے چار پانچ میل دور ایک جگہ بدھ خاک ہے جہاں انہیں دفن کیا گیا۔"

سائر جان کے جہیز میں گھر کی ایک منتظمہ، غلام اور لونڈیاں تک دی گئی تھیں۔ منتظمہ کو سب ناناجان کہتے تھے مگر اصلی نام سردار جان تھا۔ ان کا تعلق شاہ شجاع کے خاندان سے اس طرح تھا کہ انہوں نے شجاع کی بیٹی کو پالا تھا ان کی بیٹی کا نام آغاکلاں تھا۔ سردار جان کی شاہی حرم میں پرورش ہوئی تھی، عربی، فارسی خوب جانتی تھیں، بہت عابد پرہیزگار اور نیک خاتون تھیں، آداب شاہی اچھی طرح جانتی تھیں، انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ فیض کی پرورش میں ناناجان (سردار جان) کا بہت حصہ تھا، انہیں بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ بادشاہوں کی فیاضی، جلال، انصاف اور سزا کے قصے بڑی تفصیل سے سناتی تھیں اور فیض شوق سے سنا کرتے تھے۔"

"افغان دربار کی سیاست سے سلطان محمد خاں تنگ آ کر بلکہ گھبرا کر ہندوستان آ گئے اور جہلم میں دریا کے کنارے ایک بنگلہ کرائے پر لیا جس کا نام "ساحل" تھا۔ یہ بنگلہ اب ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس زیدی صاحب کے پاس ہے۔ ہمارے والد کو انگریزی حکومت نے سرگودھا اور منٹگمری میں زمینات

---

[1] ناول کا نام ویزیرس ڈاٹر ہے۔ برٹش میوزیم لائبریری سے اس ناول کی مائیکرو فلم منگوائی گئی ہے۔
ایلس فیض کے پاس ایک گروپ فوٹو ہے جس میں ملکہ وکٹوریہ اور سلطان محمد خاں بھی شامل ہیں۔ م۔ ظ۔ ح۔

دیں جہاں گھوڑوں کی افزائش نسل کے فارم تھے۔ کچھ مدت بعد وہ اپنے خاندان والوں کو افغانستان سے بلانا چاہتے تھے اور امیر کابل نے انہیں ان کے ساز و سامان لونڈیوں، غلاموں اور چالیس باوردی سپاہیوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ درہ خیبر میں لنڈی کوتل تک یہ سپاہی ہمیں چھوڑ کر واپس کابل چلے گئے۔"

"والد کے خاص ملازم کا نام لالہ بہرام تھا۔ کچھ لونڈیوں کے نام بھی یاد ہیں۔ صنوبر، کلثوم، مروارید آپا بانو اور آپا سلیمہ۔ نانا جان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے وہ بھی خاندان کی خواتین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آئیں۔ جہلم میں ابا کے ایک رشتہ دار تھے جو گھر کا انتظام کرتے تھے۔ ان کا نام ضیاءالدین تحصیلدار تھا۔ گھر کے اندر کے معاملات نانا جان کے ہاتھ میں تھے۔ ابا بیرسٹری کے کاموں میں لگے ہوتے۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گئی تھی کہ ابا کابل سے آنے کے بعد لندن گئے وہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر جہلم آکر وکالت کرنے لگے۔ اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد سے بہت پریشان رہتے تھے۔ جہلم میں جی نہ لگا تو پھر سیالکوٹ بس گئے۔ ہم لوگ بھی چلے گئے۔"

"خاندان والوں نے کہہ سن کر ابا کی دوسری شادی کرا دی۔ ہماری دوسری والدہ کا تعلق ایک گاؤں جسڑ سے تھا جو نارووال تحصیل میں ہے۔ زمیندار خاندان کی تھیں اور والد کا نام عدالت خاں تھا۔ ان کا قد چھوٹا تھا، رنگت بہت صاف تھی، ذہین اور تیز تھیں۔ ان سے ایک بیٹے طفیل اور ان کے تین سال بعد فیض پیدا ہوئے۔ ہمارے چھوٹے بھائی کا نام عنایت ہے۔"

"فیض جب پیدا ہوئے تو بہت سرخ، سفید اور موٹے تازے تھے۔ بچپن سے ہی خاموش مزاج اور حلیم الطبع تھے، صاف ستھرے رہنے کا بہت شوق تھا۔ کہانیاں سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ نانا جان انہیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ایسی کہانیاں جو بادشاہوں کے زمانے کی اور پشت در پشت سے چلی آ رہی ہیں۔ ان میں بعض تو عجیب ہی ہوتی تھیں۔ ایک قصہ بلکہ واقعہ جو فیض بچپن میں بہت اشتیاق سے سنتے تھے دو ڈاکوؤں کی بابت تھا۔ دادو اور سادو اپنے زمانے کے بڑے ظالم ڈاکو تھے۔ بڑی لوٹ مار مچائی اور ظلم و ستم کیئے تھے۔ امیر عبدالرحمان نے انہیں پکڑوا کر لوہے کے ایک پنجرے میں بند کرا دیا اور وہ پنجرہ عبرت کے لئے ایک اونچی ویران پہاڑی پر رکھوا دیا۔ دونوں بھوک پیاس اور دہشت سے مر گئے ان کا گوشت پوست گل سڑ گیا اور ہڈیوں کا پنجر وہیں پڑا رہا۔"

"ہمارے ابا کے ایک چچازاد بھائی تھے۔ چودھری نبی بخش وکیل ہائی کورٹ۔ وہ اپنے بھائی

سے ملنے کابل آئے اور ابا کے ساتھ امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں گئے۔ اتفاق سے اسی دن ایک آدمی کو اپنی صفائی کا موقع دیئے بغیر امیر نے موت کی سزا سنا دی۔ اس ظالمانہ سزا کا فیصلہ سن کر چودھری صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ امیر نے ابا سے پوچھا اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ ابا نے جواب دیا "آپ کے جلال کے باعث"۔ ابا نے دوراندیشی سے کام لے کر ایسا جواب دیا ورنہ تو بادشاہ کے حکم کے خلاف آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کئے جا سکتے تھے"۔

سلطان محمد خاں نے جب سیالکوٹ میں وکالت شروع کی جو خوب چمکی تو گھر میں عزیزوں اور مہمانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ایک من آٹے کی روٹیاں پکتی تھیں۔ چھ بھینسیں تھیں اور چار گھوڑوں کی ایک گاڑی۔ نوکروں کی ریل پیل اور روپوں کی بارش۔ ایسے ماحول میں فیض کی پرورش ہوئی اور بڑے ناز و نعم سے۔ گھر میں مذہب کا بڑا زور تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔ پورے روزے رکھے جاتے تھے۔ کلام پاک کی تلاوت ہر صبح باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ بی بی گل بتاتی ہیں "فیض نے دو سپارے حفظ کیئے مگر جب اس کی آنکھیں دکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا۔ ہم سب بہن بھائیوں میں بہت پیار تھا اور مل جل کر رہتے تھے"۔

بی بی گل ماضی کی یاد میں کھو گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ سیالکوٹ کے کنک منڈی والے مکان میں وہ اپنے حافظے کے سہارے چل اور ہنس بول رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اپنے شوہر شجاع الدین بیرسٹر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا "وہ پانچ سال ولایت میں رہے، انہیں سولہ سال کی عمر میں کنگس کمیشن ملا۔ انگریز کی فوج میں میجر کے عہدے تک پہنچے، ایک انگریز بیوی بھی تھی"۔ بی بی گل کہتی ہیں "میں نے مڈل تک پڑھا تھا، گھر پر ایک استانی بھی آتی تھیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت قدامت پسند تھا۔ پردے کی سخت پابندی تھی۔ میں نے ایک عمر تک افغانوں کا سا لباس پہنا جس میں سر کی ٹوپی بھی شامل تھی"۔

اپنی شادی کے بعد کے حالات سناتے ہوئے کہا "ہندوستان میں دھرم سالہ ایک بہت خوبصورت جگہ ہے جہاں ہم شادی کے بعد چلے گئے۔ فیض ان دنوں مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چھٹیاں ہوتیں تو ہمارے پاس آ جاتے۔ ان کے بہنوئی انہیں بہت چاہتے تھے اور ان کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ فیض کے ساتھ ان کے دو ایک دوست بھی آتے تھے جیسے خواجہ خورشید انور، خواجہ مسعود اور ایس ایم دین پیر۔ فیض کا زیادہ وقت سیر و تفریح اور موسیقی

میں صرف ہوتا تھا۔ جب یہ سب دوست اکٹھے ہوتے تو گریموفون ریکارڈ بجائے جاتے۔ خورشید انور کو جو ریکارڈ ناپسند ہوتا وہ اسے توڑ ڈالتے۔ پکے گانے سب ہی کو پسند تھے اور وہی سنا کرتے تھے۔ جیسے جمنا کے تیر۔ لاگی کر یجوا میں چوٹ، یا نسبت راگ۔ جب ہنسنے ہنسانے کو جی چاہتا تو سب لڑکے مل کر ایک گانا گاتے "میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا"۔

"فیض اپنے بھانجے اور بھانجی کو بہت پیار کرتے تھے۔ انہیں میز پر مکا مار مار کر یہ سکھایا تھا۔

"ٹوڈی بچہ ہائے ہائے

مال ولایتی بائیکاٹ"

"سالے بہنوئی دونوں انگریزوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ہمارے میاں کا انگریزوں سے میل جول تھا۔ ان کے ساتھ ٹینس برج وغیرہ کھیلتے تھے۔ البتہ انہیں ترکوں سے بہت ہمدردی تھی ہمارے دھرم سالہ کے گھر میں مصطفےٰ کمال پاشا، انور پاشا مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی تصویریں ٹنگی تھیں"۔

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بی بی گل نے کہا "ہمارے والد بھی انگریزوں سے متاثر تھے مگر اولاد پر الٹا اثر پڑا۔ فیض اپنے والد کے کہنے پر آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے امتحان سے پہلے انہیں ہیضہ ہو گیا اس لئے امتحان نہ دے سکے۔ پھر خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور انگریزوں کے اتنے خلاف ہو گئے کہ آئی سی ایس کا امتحان ہی نہ دیا۔ خورشید انور آئی سی ایس میں اول آئے مگر بم بنانے کی وجہ سے انہیں ملازمت نہیں ملی بلکہ سزا ہوئی۔ فیض کے باقی دوست سرکاری ملازمت میں شامل رہے"۔

"ایک سال فیض دھرم سالہ آئے تو ایک دلچسپ اتفاق ہوا۔ ایک دن چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہن کر سیر کے لئے نکلے تو کچھ ہندوؤں نے غلط فہمی میں ان کو گھیر لیا اور کہا آپ کب تشریف لائے اور کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ فیض نے جواب دیا بیرسٹر شجاع الدین کے ہاں۔ اس پر لوگوں نے کہا ان کے ہاں ٹھہرنے سے مذہب بھرشٹ ہوتا ہے۔ اتنے میں کچھ عورتیں تھالوں میں مٹھائیاں سجا کر لے آئیں۔ فیض نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی کہ میں پنڈت نہرو نہیں ہوں فیض احمد ہوں اور اپنے بہنوئی بیرسٹر شجاع الدین کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ان بڈھے لوگوں کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ جس کا سواگت

ے فیض کی آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری یا شرکت کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں کیونکہ کبھی آئی سی ایس کا کوئی ذکر فیض سے نہیں ہوا۔ (م ط ح)

کرتے چلے تھے وہ نہرو نہیں فیض نکلے۔ دھرم سالے میں بہت بڑا میلہ لگتا تھا اور فیض کو ہمیشہ میلوں ٹھیلوں سے دلچسپی رہی" اس لئے میلے میں اکثر جایا کرتے تھے!!

بی بی گل نے اپنی بیٹی سعادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ فیض کو بہت تنگ کرتی تھی کہ کوئی کہانی سناؤ۔ جان چھڑانے کے لئے وہ اسے آدمی کا ایک قصہ سناتے تھے۔ اس طرح شروع کرتے" ایک آدمی تھا۔ تم سمجھ گئیں نا ایک آدمی۔ وہی آدمی جو بالکل آدمی کی طرح ہوتا ہے۔ آدمی تو پھر آدمی ہی ہوتا ہے نا۔" بی بی گل بتاتی ہیں" فیض نے ہمیشہ اس آدمی کا اتنا ہی قصہ سنایا اور کبھی پورا نہ کیا ادھورا ہی رکھا۔ آدمی کی کہانی آدمی سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ سعادت اس کہانی کو یاد کرکے بہت ہنسیں۔

بی بی گل ماضی کی مشعل تھامے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان جگہوں پر گئیں جہاں وقت نے بہت سی چیزوں کو مٹا دیا ہے اور جب کوئی نقش اجالا جائے تو پھر یکایک یادوں کا کوندا سا لپک آتا ہے اور بہت سے دوسرے نقش چمکنے لگتے ہیں۔ لوگ جو رخصت ہو گئے۔ ان کے مرحوم شوہر، عزیز و اقارب چھوٹے بڑے واقعات۔ یادوں کے پردے پر ایک متحرک فلم خاموشی سے چلنے لگتی ہے۔

"میں دھرم سالہ میں تھی فیض کی چھوٹی بہن کی شادی تھی اباجی کا خط آیا لکھا تھا۔ مجھے زندہ دیکھنا ہے تو بہن کی شادی پر آؤ ورنہ زندہ نہ دیکھوگی" میں سیالکوٹ پہنچ گئی۔ انہوں نے شادی کا مکمل انتظام کرایا۔ دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کے قیام وطعام کا اہتمام کیا، گھر کی رونق اور چہل پہل سے بہت خوش تھے اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر کے آنے آنے تک ختم ہو گئے۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔"

فیض صاحب کی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے بی بی گل کہنے لگیں۔" انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ ان کا خط بہت خوبصورت تھا اور مجھے ہمیشہ پیاری بیٹی لکھتی تھیں کچھ خط میں نے سنبھال کے رکھے ہیں آپ کو دکھاؤں گی۔ انہیں فیض سب سے پیارا تھا اور اس سے بہت توقعات وابستہ تھیں۔ ان کے جیتے جی فیض نے جو عزت اور شہرت حاصل کی اس سے بہت خوش ہوتی تھیں لیکن جب یہ جیل گیا تو بہت پریشان بھی رہیں۔" ان کے مزاج کے متعلق کہا" خاموش طبیعت تھی، سمجھدار، عبادت گذار بلکہ تہجد گذار تھیں"۔

والد کے انتقال کے بعد پے در پے مشکلات پیش آئیں۔ زمینوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا چالیس ملازموں کی پلٹن کو آہستہ آہستہ رخصت کیا صرف مہردین رہ گیا جس نے جانے سے انکار کر دیا۔

گاؤں کی ایک عورت تھی جسے سب پھوپی بھولی کہتے تھے وہ بھی رہ گئی۔ دونوں نے کہا ہم تنخواہ کے بغیر کام کریں گے۔ پھوپی بھولی گھر کا انتظام کرتی تھی اور مہر دین باہر کا کام۔ فیض نے ان حالات میں بڑی سمجھداری سے کام لیا۔"

کسی بات پر کھانے کا ذکر چھڑا تو بی بی گل نے بتایا "فیض کو افغانی کھانے بہت پسند تھے، شب دیگ، قورمہ پلاؤ، حبشی پلاؤ مگر خود کبھی فرمائش نہیں کی جو مل گیا کھا لیا۔ بلکہ اس کے مزاج کا یہ حال تھا جن دنوں حکم تھا کہ لڑکے اگر کھانے کے وقت پر یعنی رات نو بجے تک گھر نہ آئیں تو کھانا نہ دو تو محمد طفیل مجھے یا کسی اور کو جگا کر کھانا لیتے اور گرم کرا کے کھاتے، چھوٹے بھائی عنایت خود باورچی خانے جا کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیٹ بھر لیتے مگر فیض آتے تو نہ کسی کو جگاتے اور نہ کھانا تلاش کرتے بلکہ چپ چاپ بھوکے سو جاتے۔ مجھے اس کے مزاج پر رحم آتا اور میں پوچھتی فیض کھانا کھاؤ گے؟ جواب دیتے ہاں مل گیا تو کھا لیں گے"۔

بی بی گل کہتی ہیں "فیض کو اپنے سب بھائی بہنوں میں مجھ سے بہت محبت تھی اور اپنے بہنوئی سے بھی۔ ان کا انتقال ہوا تو کئی دن تک بالکل خاموش اور گم سم رہے اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ اپنی بھانجی کو اسکول میں داخل کرایا اور مجھے سمجھایا بچوں کو اچھی تعلیم دلوانی چاہیئے۔ ہمیشہ ہر طرح کی مدد کی اور ہر ضرورت کے وقت نیک رائے دی اور نصیحت کی"۔

شادی کے متعلق میرے ایک سوال کے جواب میں بی بی گل نے بتایا "فیض کے لئے بہت رشتے تھے مگر جہاں والدہ اور بہنیں چاہتی تھیں فیض نے شادی نہیں کی۔ ایلس کا انتخاب کیا۔ والدہ نے مشرقی روایات کے مطابق انہیں دلہن بنایا۔ چینی بروکیڈ کا غرارہ تھا اور گوٹے کناری والا دوپٹہ، جوڑا سرخ تھا جیسا کہ شادیوں میں پہنایا جاتا ہے۔ ایلس نے کہا تھا میں سب کچھ مانوں گی برقع نہیں پہنوں گی"۔

ایلس کے متعلق کہا "ان کی بہت سادہ طبیعت ہے۔ بہت خلیق اور محبت کرنے والی ثابت ہوئیں۔ انہوں نے سسرال میں قدم رکھتے ہی سب کا دل جیت لیا اور خاندان میں اس طرح گھل مل گئیں جیسے اسی گھر کی لڑکی ہیں۔ وہی لباس اختیار کیا"۔ یہاں سعادت نے کہا "ہم سب کی یہ چہیتی ممانی ہیں"۔ ساس بہو کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے بی بی گل نے کہا "ساس نے بہو کو محبت دی اور بہو نے ساس کی عزت کی"۔

"ایلس نے ثابت کر دکھایا کہ وفا، ایثار اور محبت تنہا مشرق کی روایات نہیں ہیں یہ تو عورت کی سیرت کا حصہ ہیں"۔

شیر محمد حمید

فیض سے میری رفاقت کی چند یادیں

[محبانِ فیض نے جمعہ ۹ مارچ ۱۹۷۶ء کو لائل پور کے ڈسٹرکٹ کونسل ہال کے سبزہ زار پر فیض کی ۶۵ ویں سالگرہ کا جشن منایا۔ فیض کے ہمدم دیرینہ اور ہم جماعت شیر محمد حمید نے یہ مضمون اُس تقریب میں پڑھ کر دوستی کا ایک اور حق ادا کیا۔ م ظ ح]

۱۹۲۹ء کی بات ہے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تیسرے سال کا طالب علم تھا۔ چودھری نبی احمد اور آغا عبدالحمید میرے دوست تھے۔ ہم سب نیو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہر شام ہم سیر کو نکلتے تو ایک نوجوان کو دیکھتے جو باہر جنگلے کے پاس تنہا کھڑا، گرد و پیش سے بے خبر کالج ٹاور کی سمت نظریں جمائے، دور کہیں افق کی بلندیوں کو دیکھ رہا ہوتا۔ اس کے سراپا دلکش اور محویت جاذب توجہ۔ تین چار دنوں کے بعد نبی احمد کے ذوقِ جستجو نے ہمیں اس نوجوان سے ہمکلام ہونے پر آمادہ کر لیا۔ قریب جا کر نبی احمد نے پوچھا "معاف کیجیئے گا آپ کون ہیں اور یوں گم سم تنہا کھڑے کیا دیکھا کرتے ہیں؟" نوجوان محویت کے عالم سے چونکا اور کہنے لگا "میرا نام فیض ہے، میں نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کر کے یہاں تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا ہے، یہاں میرا کوئی واقف آشنا نہیں ہے۔" نبی احمد نے معاً کہا "آؤ آج سے آپ ہمارے دوست ہیں، یہ شیر محمد حمید ہیں، یہ آغا حمید ہیں، یہ بھی آپ کے ہم جماعت ہیں۔" وہ دن اور آج کا دن تین کم پچاس برس بیت

چکے ہیں زندگی ہزاروں نشیب وفراز سے گزری، فیض کی دوستی کا وہ بندھن بدستور برقرار ہے اور یہ دوستی ہمارے لیے فخر ومسرّت کا باعث رہی ہے۔

فیض کے والد خان بہادر سلطان محمد خاں سیالکوٹ کے سرکردہ وکیل، معزز ومخیر شہری، ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین تھے، وجاہت وشرافت کا پیکر تھے، گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی، فیض نے ناز ونعمت میں آنکھ کھولی، لاڈ پیار میں پرورش اور گھریلو رکھ رکھاؤ اور ناز برداریوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی، لاہور آئے تو ماحول مختلف پایا، کچھ گھٹے گھٹے سے رہتے، ہمیں کافی جدوجہد کرنا پڑی کہ فیض اپنے خول سے باہر نکلیں، چھ سات ماہ کے بعد ہم کامیاب ہوئے اور فیض حلقۂ احباب میں چہچہانے لگے،

وہ زمانہ گورنمنٹ کالج کا سنہری دور تھا۔ بڑے بڑے نامور اساتذہ مختلف شعبوں کے سربراہ تھے۔ پروفیسر لینگ ہارن انگریزی کے صدر شعبہ تھے۔ تھرڈ ایئر کے امتحان میں انھوں نے ہمارے انگریزی کے پرچے دیکھے۔ پرچے واپس ملے تو فیض کے پرچے پر ایک سو پینتیھ نمبر لگے تھے۔ ایک لڑکے نے اُٹھ کر پروفیسر موصوف سے پوچھا جناب فیض کو ایک سو پچاس میں سے ایک سو پینتیھ نمبر کیسے مل گئے؟ جواب ملا "Because I could not give more"

فیض کی انگریزی دانی کے متعلق ایک نامور انگریز استاد کے یہ الفاظ سند رہیں گے۔

انھی دنوں پطرس بخاری کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر گورنمنٹ کالج آئے۔ کالج کی علمی وادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا، بخاری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اُن کی دلفریب شخصیت کا پرتو کالج کے ہر شعبے پر پڑا۔ کالج میں 'بزم سخن' نام کی ایک اردو انجمن موجود تھی۔ اس کے اجلاس مشاعروں اور رسمی تقاریب تک محدود تھے، بخاری نے ناکافی سمجھ کر 'مجلس' کے نام سے ایک نئی انجمن کا اجرا کیا۔ اردو علم وادب سے شغف رکھنے والے طلبا کو چن چن کر اس کا رکن بنایا، فیض، راشد، آغا حمید، نبی احمد، حفیظ ہوشیار پوری اور یہ خاکسار اس کے بانی اراکین میں سے تھے، طالب علموں کے علاوہ بخاری صاحب کے ایما اور دعوت پر لاہور کے برگزیدہ ادیب و دانشور شریکِ مجلس ہوتے۔ ڈاکٹر تاثیر۔ مولانا سالک۔ امتیاز علی تاج۔ صوفی تبسم۔ چراغ حسن حسرت ۔ بالالتزام اور حفیظ جالندھری کبھی کبھار تشریف لاتے۔ اجلاس اکثر وبیشتر بخاری صاحب

کے دولت کدے پر ہوتے، ایک طالب علم مقالہ پڑھتا، ایک دو نظم یا غزل پیش کرتے۔ پھر سوال و جواب، تنقید و تبصرے کا دور چلتا، صاحبِ مقالہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور نئے نئے گوشوں کی طرف رہنمائی بھی۔ موضوع کے ہر پہلو کو کھنگالا جاتا اور مشرق و مغرب کے اسالیب تنقید قدیم و جدید اصولوں کے معیار پر پرکھا جاتا۔ غرض کوئی زاویہ کوئی پہلو نظر انداز نہ کیا جاتا۔ اس دوران زمامِ بحث اکثر بخاری کے چابکدست ہاتھوں میں رہتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کی یہ نشست مہینوں کی دیدہ ریزی پر حاوی ہوتی ہم لوگ انشراحِ قلب کی کیفیت لیے واپس لوٹتے۔ یہ بخاری کی کرشمہ زائی تھی کہ مدفون امکانات کو اجاگر کرکے فیضؔ اور راشدؔ جیسے نامور اکابر مجلس نے پیدا کیے۔

فیضؔ میں شاعری کا مادہ فطری ودیعت تھا۔ ہم لوگوں میں بھی فیضؔ کی صحبت اور بخاری تاثیرؔ اور تبسمؔ جیسے جیّد اساتذہ کے التفاتِ نظر کے باعث شعر و ادب سے کچھ لگن پیدا ہوگئی۔ احباب کا حلقہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ ہر شام ہوسٹل کے کسی کمرہ میں محفلِ مشاعرہ برپا کر بیٹھتے طرح مصرع پر ہر کوئی دو چار شعر لکھ کر لاتا۔ محفل کے اختتام پر ہر غزل میں سے شعر انتخاب کر کے ایک غزلِ مرکب تیار کر لیتے جو کالج کے مجلّہ راوی میں "احباب" کے نام سے چھپتی۔ ظاہر ہے اس غزلِ مرکب میں حصّہ وافر فیضؔ کا ہوتا۔ "دی احباب" کے عنوان سے ایک طنزیہ فیضؔ نے 'راوی' میں لکھا تھا جو اب اُن کی کتاب "متاعِ لوح و قلم" میں شامل ہے۔

فیضؔ کی شاعری پروان چڑھتی رہی، بین الکلیاتی مشاعروں میں فیضؔ اکثر انعامات سمیٹتے رہے، ابھی کالج کا زمانہ تھا کہ فیضؔ صفِ شاگرداں سے اٹھ کر مجلس اساتذہ میں شریک ہو گئے اور بخاری تاثیرؔ اور تبسمؔ کے احباب میں جگہ پالی۔

ہم فورتھ ایر میں تھے دسمبر کی چھٹیوں میں فیضؔ کی ہمشیرہ کی شادی تھی، وہ سیالکوٹ چلے گئے، ان کے والد اس تقریب کی تیاری میں مصروف تھے، جس صبح برات کو آنا تھا اسی رات حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُس قیامت کا اندازہ کیجیے جو اس ناگہانی موت سے خاندان پر گزر گئی۔ فیضؔ نے ایک فقرہ کا خط لکھا "تمہارا فیضؔ یتیم ہو گیا۔" اُن حشر سامانیوں کو کون سمجھے جو اس ایک فقرہ کی تہ میں موجود ہیں، اس سانحۂ عظیم نے گویا زندگی کی بساط اُلٹ دی فیضؔ کی زندگی کی کایا پلٹ گئی، اس کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب آ گیا، یہاں سے اس کی سوچ اور

فکر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری نے بھی نیا رُخ اختیار کیا' غمِ جاناں کے ساتھ غمِ روزگار کا جاں گُسل پیوند لگ جانے سے سوچ کے دھارے نئی سمت میں بہنے لگے۔

فیضؔ نے انگریزی اور عربی میں ایم اے کر لینے کے بعد ایم اے او کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا' وہاں ڈاکٹر تاثیر بطور پرنسپل اور صاحبزادہ محمود الظفر بطور وائس پرنسپل آ گئے' صاحبزادہ کی معروف رفیقۂ حیات ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے زمرہ کے دوسرے لوگوں سے میل جول بڑھا تو فکر و نظر کو اور وسعت ملی' ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اجرا انھی دنوں ہوا فیض اس کے بانی رکن ہیں' اب وہ غمِ جاناں اور غمِ روزگار سے گزر کر غمِ وطن اور غمِ جہان کی سنگلاخ راہوں پر چل نکلے۔ اپنی ذات کا دکھ عالمگیر دُکھ کے سامنے ہیچ اور اُس آفاقی دکھ کا ایک معمولی حصہ نظر آیا۔ فیضؔ وطن دوستی اور انسان دوستی کی جس راہ پر گامزن ہوئے اس میں ہزار آفتوں کا سامنا تھا۔ جسم و جان کی قربانیاں درکار تھیں' الحمدللہ کہ فیضؔ کسی مصیبت کا سامنا کرنے سے نہیں ہچکچایا' نگارِ وطن کی حرمت آزادی اور پھر تزئین و تجمیل کے شوق نے جس جس قربانی کا تقاضا کیا' پیش کر دی۔ یہ راہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی' لیکن راہرو عشق کے قدموں میں نہ لغزش آئی اور نہ تھکن محسوس کی۔

تحریک آزادی کا یہ جیالا تحریک پاکستان کے معرکوں میں بھی ہراول میں رہا۔ پاکستان ٹائمز کے اجرا پر مدیر اعلیٰ مقرر ہوا تو صحافتی محاذ پر قلمی جہاد کے معرکے سر کرتا رہا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو تعمیرِ وطن کے مراحل سامنے آئے' جس پاکستان کے خواب دیکھے تھے' ان کی تعبیر حسبِ مراد نظر نہ آئی تو احتجاج کی صدا بلند کی' اربابِ اقتدار کو یہ طرزِ نوا پسند نہ آئی تو سازش کیس میں دھر لیے گئے اور قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے' سازش کیس کا معمّا کیا تھا' اس کے متعلق نہ کبھی ہم نے دریافت کیا اور نہ ہی فیضؔ نے بتایا' معلوم یہی ہوتا ہے کہ

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

اچانک گرفتاری' خوف و دہشت کی فضا' قید تنہائی اور پھر سنٹرل جیل حیدرآباد میں مقدمے کی سماعت' عجب گومگو کا عالم تھا۔ فیضؔ کے اعزّا اور اقربا دوست احباب سب

پریشان تھے۔ حالات بڑے حوصلہ شکن تھے۔ فیضؔ کے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد، جو میرے بھی کرم فرما تھے، حیدر آباد جیل میں فیضؔ سے ملاقات کو گئے اور وہیں حرکت قلب رک جانے سے انتقال کر گئے، میں تعزیت اور دلجوئی کے لیے فیضؔ سے ملنے حیدر آباد گیا، جیل کے اندر ملاقات ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ مقدمے کی سنگینی، جیل کی مصیبت اور اب شفیق بھائی کی ناگہانی موت نے فیضؔ کو سخت مضمحل اور بدحال کر رکھا ہوگا۔ میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ فیضؔ کی ظاہری شکل و صورت میں کسی غیر معمولی تبدیلی کے آثار نظر نہ آئے، اضمحلال و پریشانی کا کوئی خاص نشان نہ تھا۔

فیضؔ ٹھنڈے مزاج کے بیحد صلح پسند آدمی ہیں، بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے بھی ناساز گار ہوں، وہ نہ برہم ہوتے ہیں اور نہ مایوس، سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں، نہ کوئی شکوہ نہ کسی کا گلہ۔ نہ چڑچڑاہٹ نہ بدگوئی۔ میں نے فیضؔ کو نہ کبھی طیش میں دیکھا ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ شکایت کرتے سنا ہے، اُن کے دل کی گہرائیوں میں لاکھ ہیجان برپا ہوں، چہرے پر بھی کی یا پریشانی کی کوئی لکیر نظر نہ آئے گی۔ فیضؔ کا ظرف کتنا وسیع ہے؟ سمندر کی تہ میں طوفانوں کی رستاخیز ہے، سطح پُرسکون ہے۔ یہ عظمت ہر کسی کو کہاں نصیب۔

ہر معتدل آدمی کی طرح فیضؔ پر بھی عشق و محبت کے حادثے گزرے ہیں، کچھ عام نوعیت کے رومانی واقعات جن کا دیرپا اثر فیضؔ کی زندگی اور شاعری پر نہیں پڑا۔ لیکن دو ایک وارداتیں اس قدر شدید تھیں کہ فیضؔ کے قلب و جگر کو برما کے رکھ گئیں۔ نقشِ فریادی کی نظمیں 'رقیب سے'، 'ایک راہگزار پر'، ایک ایسے ہی حادثہ کی یادگار ہیں جس کا اختتام مرگِ سوزِ محبت' پر ہوا۔ ایسے حادثے ہر کسی پر گزرتے ہیں لیکن فیضؔ جیسے حسن پرست، حسن بین اور حسن آفریں حساس فن کار پر ان کے جو گہرے اثرات مترتب ہوئے اُن کا سراغ جا بجا اُن کی شعری تخلیقات میں مل جاتا ہے۔

میرے نزدیک فیضؔ کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں ایلس جارج سے اُن کی شادی ہے۔ بظاہر ایک مشرقی نوجوان کا ایک فرنگی نژاد خاتون سے نکاح ہے۔ ایسے نکاح آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن حقیقتاً یہ مشرقی قلب و روح اور مغربی جسم و دل کا وہ بار آور پیوند ہے جس نے مشرق و مغرب کی رعنائیاں یکجا کر دی ہیں۔ فیضؔ ایک لاابالی، بے نیاز، این و آں اور خود فراموش سا نوجوان تھا ایلس نے اس کی زندگی میں ترتیب و سنوار پیدا کر دی، اُس کی بے قرار

روح کو ایک حسین قالب میسّر آگیا' ایلس نے مغرب اور اس کی تہذیبی روایات کو خیر باد کہہ کر مشرق اور اس کی ثقافتی اقدار کو اپنا لیا۔ دیس کے ساتھ بھیس اور وطن کے ساتھ زبان تک بدل لی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ایلس نے فیض کے فکر و نظر' جذبات و حسّیات اور آدرش تک اپنا لیے' قید و بند کی جن جن آزمائشوں سے فیض گزرے ہیں ایلس کی غمخواری اور حوصلہ مندی کے بغیر ان جاں لیوا مراحل سے یوں اعتماد اور یقین و محکم کے ساتھ گزرنا مشکل ہوتا۔

فیض کا پیدائشی شہر سیالکوٹ ہے' رہائشی شہر لاہور کہہ لیجیے' لیکن ہم جانتے ہیں کہ لائل پور سے بھی اُن کو نسبتِ خاص ہے' اُن کی جوانی کی کئی حسین یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں' اُن کے مداح اور پرستار ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہیں' لیکن لائل پور کے باسی اُن سے دوگونہ التفات کے مستحق ہیں' اس لیے یہ آرزو کرنا کوئی بڑی جسارت نہ ہوگی کہ فیض ہمیں دل کے کسی محفوظ اور مخصوص گوشے میں جگہ دیے رکھیں۔

خدیجہ بیگم

یادوں سے معطّر

[اس مضمون میں جن رشیدہ کا ذکر ہے وہ ممتاز و معروف افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں ہیں۔ مضمون کے آخر میں فیض کا ایک خط ان ہی رشیدہ کے متعلق ہے۔ م ط ح]

یاد نہیں کہ وہ امرتسر میں ۱۹۳۵ء کے اکتوبر کی شام تھی یا ۱۹۳۶ء کی ـــــ رشیدہ آپا اپنی ننھی سی کالے رنگ کی موٹر سے شور مچاتی ہوئی اتریں اور ان کے قہقہوں سے بھائی جان کا گھر گونج اٹھا۔ چمکتی آنکھوں نے پورے گھر کو روشن کر دیا۔ ہم سب محو ہو گئے اور رشیدہ کو سننے اور دیکھنے لگے۔ کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ ایک دبلا پتلا نوجوان کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے اپنی خاموش مسکراہٹ کے ساتھ دروازے پہ رکا ہوا ہے۔ یکایک رشیدہ آپا نے چونک کر کہا "خدیجہ ان سے ملو یہ فیض ہیں۔ ہمارے نوجوان شاعر۔" ہم نے سر سے پیر تک ان پر نظر ڈالی، دل کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ یہ شاعر ہیں مگر دل نے انھیں صرف نوجوان مانا شاعر نہیں۔ ہمارے تصوّر میں اس وقت شاعر کا حلیہ کچھ اور ہی تھا۔ لمبے لمبے بال والا۔ جھومتا جھامتا۔ کھویا کھویا سا۔ اور جگر جیسا۔ یہ سوچ کر کہ یہ شاعر واعر نہیں ہیں نہ ان کی طرف دوبارہ دیکھا اور نہ ان سے کوئی بات کی۔ فیض نے نہ شراب پی نہ شعر سنایا نہ شور مچایا پھر یہ شاعر کس قسم کے ہوئے؟ کھانے

کے بعد رشیدہ آپا کے ساتھ لاہور چلے گئے اور ہم بالکل بھول بھال گئے کہ کسی شاعر سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

۱۹۴۲ء میں رشیدہ آپا کے پاس لکھنؤ گئی جہاں اِدھر اُدھر کی گھریلو باتوں کے بعد انہوں نے سوال کیا "تم فیضؔ کو تو جانتی ہو نا؟" میں حیران کہ یہ فیضؔ کون ہیں اور رشیدہ آپا نے کیوں مان لیا کہ میں انھیں جانتی ہوں۔ رشیدہ آپا کی عادت تھی کہ وہ سوال کرنے کے بعد اس کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھیں بلکہ فوراً کوئی دوسرا سوال پوچھ ڈالتیں یا بات کہہ ڈالتیں چنانچہ فوراً الماری سے پیلے اور نیلے رنگ کی ایک کتاب نکال کر دی جس کے سرورق پر فیضؔ کی تصویر تھی۔ دل سے مشورہ کیا جواب ملا ہم فیضؔ کو نہیں جانتے۔ کتاب کے اندر نہایت خوبصورت خط میں لکھا تھا "رشیدہ آپا کے لئے —— فیضؔ" اندر کے صفحات الٹے، پڑھے اور ان چار مصرعوں نے چونکا دیا جگا دیا

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں، چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

بات انوکھی، زبان سادہ، لہجہ نرم —— بہت اثر ہوا اور بار بار یہ اشعار پڑھے۔ تیسرے دن جب لکھنؤ سے روانہ ہوئی تو رشیدہ آپا نے ناشتہ اور نقش فریادی ہمارے ساتھ کیا۔ اس کے بعد ہر رسالے میں فیضؔ کا کلام تلاش کیا مگر کم ہی نظر آیا۔

۱۹۴۷ء میں حالی سے دہلی میں ملاقات ہوئی اور گہری دوستی ہو گئی اور اکثر ملنا ہوتا تھا۔ حالی نے جب پہلی مرتبہ

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

گا کر سنایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فیضؔ کی عظمت پوری کائنات پر چھا گئی ہے اور شوق پیدا ہوا کہ اس شاعر سے ملا جائے۔ دن گزرتے گئے اور ملاقات نہ ہونے کے باوجود ہم دوستوں کی محفلوں میں فیضؔ کے اشعار گائے اور سنائے جاتے تو ایسا لگتا فیضؔ بہ نفسِ نفیس شریکِ محفل ہیں۔ ان کا ایک ایک شعر مجھے زبانی یاد ہو گیا۔ بالکل محاورے اور کہاوت کی طرح ہم لوگ فیضؔ کا حوالہ دینے لگے۔ نہ جانے ایک دن کسی نے کہہ دیا کہ فیضؔ جیسے کہ وہ اپنے اشعار میں نظر آتے ہیں واقعی وہ ویسے ہیں نہیں۔ میں نے اپنے دل میں فیضؔ کا جو مجسمہ بنایا تھا اسے کسی قیمت پر بدلنے کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے ٹھان لیا کہ ان سے کبھی نہیں ملوں گی۔

ایک زمانے کی بات ہے میں لاہور میں اپنے بھائی کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ ہم سب شامیانے میں بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا فیضؔ آرہے ہیں۔ میں ایک دم وہاں سے اُٹھ کر اندر چلی گئی اور اس وقت تک باہر نہیں نکلی جب تک کہ فیضؔ چلے نہیں گئے۔ بات وہی تھی کہ اپنے تصوّر میں ان کا جو مجسمہ تیار کیا تھا کہیں وہ پاش پاش نہ ہو جائے۔

۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے دہلی حالی کے یہاں گئی اور ارادہ تھا کہ ایک ہفتہ قیام کر کے لاہور لوٹوں گی لیکن حالی نے اپنی دانست میں "خوشخبری" سنائی کہ پرسوں فیضؔ آرہے ہیں۔ چنانچہ میں پرسوں کے آنے سے پہلے دہلی سے بھاگ نکلی۔ میں نقشِ فریادی اور دستِ صبا والے اس فیضؔ کے علاوہ جس کی خاص تصویر میرے دل میں اتری ہوئی تھی کسی دوسرے فیضؔ سے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ میں فیضؔ کے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات معلوم کرنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ میں بھی جیل کی چہار دیواری میں وقت گزار آئی ہوں ان کی طرح زمانے کی سختیاں جھیلی ہیں۔ وہ صبح و شام اور وہ چاند تارے میں نے بھی دیکھے ہیں جو شاعر کا حصّہ تھے۔ زنداں نامہ شائع

ہوتی تو یوں لگا ہمارے نام کوئی پیام آیا ہے۔

۱۹۶۱ء کی ایک شام آئی جب میں کراچی میں باجی[1] سے ملنے گئی۔ باجی کہنے لگیں "ارے تم ذرا پہلے آتیں۔ فیض آیا ہوا ہے۔ اس سے مل لیتیں۔" میں نے شکر کیا کہ اس وقت وہ حضرت باہر گئے ہوئے ہیں ورنہ یہاں تو ٹکراؤ ہو ہی جاتا۔ باجی کی گفتگو یک طرفہ ٹریفک ہوتی ہے۔ وہ دوسرے کو گفتگو کا موقع ہی نہیں دیتیں اور نہ سننے کا موقع۔ فیض کے متعلق بس ایک جملہ کہہ کر دوسرا موضوع چھیڑ دیا کہ ہائے قیامت کا زمانہ آگیا ہے۔ سگریٹ ملتے ہی نہیں۔ بعض بعض دن تو آنکھیں ترس جاتی ہیں سگریٹ کو۔ ہم نے تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت لی اور قریب کے بازار کی دکان دکان پھر کر باجی کے لئے تھری کاسل سگریٹ کی دو ڈبیاں خریدیں اور دوبارہ گئے تاکہ باجی کو دیدیں۔ اب جو پہنچے۔ دروازہ کھولا تو دیکھا باجی تو دیوان پر براجمان ہیں لیکن ایک صاحب سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ٹہل رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر کچھ ٹھٹکی وہ صاحب مجھے دیکھ کر کچھ مسکرائے۔ باجی بولیں "فیض تم خدیجہ سے کبھی نہیں ملے ہو؟"

فیض صاحب نے باجی کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ ایک نرم و نازک "ہوں" کے ساتھ میٹھی آواز اور مدھم لہجے میں سوال کیا: "ارے ہم اب تک ملے کیوں نہیں؟" اس پر مجھے کچھ ہنسی آئی مگر کھسیانی ہنسی۔ باجی کو سگریٹ دیئے اور کوئی جھوٹا بہانہ کرکے جلدی سے باہر آگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض صاحب لاہور آرٹ کونسل میں بڑے بڑے کارنامے انجام دے رہے تھے۔

تیسرے چوتھے روز صبح گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب میرے

---

[1] آمنہ مجید ملک

گھر آئے اور بولے فیض صاحب آئے ہیں اور آپ کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سٹ پٹائی۔ اپنی ایک سے زیادہ حیرانیوں، پریشانیوں اور پشیمانیوں کو سمیٹنے بھی نہ پائی تھی کہ فیض صاحب اور ان کے ساتھ ان کے تین چار حالی موالی گھر میں گھس آئے۔ فیض صاحب آئے اور خاموش بیٹھ گئے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پی رہے ہیں اور منھ ہی منھ میں کچھ فرما رہے ہیں۔ کیا مجال جو ایک جملہ بھی پورا سنائی دیا ہو۔ کبھی شروع کے اور کبھی آخر کے الفاظ غائب اور کبھی بیچ کے دو چار لفظ۔ آدھ گھنٹہ ٹھہرے اور چلے گئے۔

تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں دو چار بار اور ملنا ہوا۔ افتتاح کے بعد میں، زاہد بھائی اور میری بھاوج فیض صاحب کے دفتر میں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ ایک دو اور اصحاب بھی موجود تھے۔ سب ہی بولتے رہے سوائے فیض صاحب کے۔ صرف مسکراتے رہے اور سگریٹ سے شوق فرماتے رہے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں مجھ سے میری تصویروں کا ذکر نہ کر دیں۔ ایک لمحہ ایسا آیا جب باقی سب کسی موضوع پر گفتگو میں مصروف ہو گئے اور فیض صاحب نے میری طرف جھک کر نہایت دھیمی آواز میں کہا "ضروری ہے کہ آپ کی تصویروں کا میں ذکر کروں؟" میں نے جواب دیا "بالکل ضروری نہیں" اس کے بعد میں نے چین کی سانس لی کہ چلو یہ موضوع تو ختم ہوا۔ کوئی تعجب نہیں جو خود فیض صاحب نے بھی یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی ہو کہ انھوں نے بھی تصویروں کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کر لی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

بعد کے دنوں کی بہت سی شاموں اور ملاقاتوں کی جو باتیں یاد ہیں ان میں قابلِ ذکر یا فیض صاحب کی خاموش مسکراہٹ ہے یا مسلسل سگریٹ نوشی اگر اتفاق سے یا فیض صاحب کے نقطۂ نگاہ سے کوئی قابلِ گفتگو موضوع نکل آیا یا بحث چھڑ گئی تو بس کچھ اس قسم کی باتیں کیں "ٹھیک ہے"۔ "ٹھیک ہو جائے گا"۔ "یوں بھی ہو سکتا ہے"۔ بیشتر محسوس ہوا کہ فیض صاحب

نے بحث کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا "جب آپ کو معلوم ہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے تو آپ ٹھیک ہے کیوں کہتے ہیں ایک غلط بات ٹھیک کیسے ہو سکتی ہے جبکہ آپ اس کا غلط ہونا تسلیم کر لیں۔" اس بار بھی وہی جواب دہرایا "ٹھیک ہے"۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لفظ ٹھیک پر ذرا زیادہ زور دیا تھا۔

فیضؔ صاحب کی امن پسند طبیعت اور صلح آمیز مزاج دیکھ کر اور پر سکون باتیں سن کر میں حیران ہوتی ہوں کہ یہ ترقی پسند باغی شاعر تو کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔ جو شخص دوست سے زبانی اختلاف تک سے گریز کرتا ہے سماج اور نظام سے کیسے ٹکر لے سکتا ہے۔

دوستی اور بے تکلفی بڑھ جانے کے باوجود میں انھیں ہمیشہ "فیضؔ صاحب" کہتی ہوں۔ کبھی فیضؔ نہیں کہتی۔ آپ جناب سے بات کرتی ہوں۔ ہمیشہ با ادب با ملاحظہ۔ انھیں اپنے لئے یہ احترام اور ایسا ادب ناگوار گزرتا ہے۔ ایک روز مسکراتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے۔ "اگر تم مجھے اسی طرح فیضؔ صاحب کہا کرو گی تو ہمیں بھی خدیجہ بیگم صاحبہ کہنا پڑے گا۔" ان کا مزاج دیکھئے اس کے بعد بھی میں نے کبھی فیضؔ نہیں کہا مگر اس روز کے بعد نہ انھوں نے مجھے ٹوکا اور نہ مجھے خدیجہ بیگم صاحبہ وغیرہ کہا۔

شروع دوستی کی بات ہے کھانے کی طرف ہماری بے التفاتی دیکھ کر ایک دن کہنے لگے "تمھاری ہماری دوستی نبھے گی کس طرح؟ تمہیں نہ کھانے کا شوق ہے اور نہ کھلانے کا۔" میں نے کہا: "یہ تو دوستی میں رکاوٹ یا خلل کا سبب نہیں ہو سکتا۔" چنانچہ لندن تک میں فیضؔ صاحب کو بہت مزے مزے کے کھانے خود پکا کر کھلائے۔ اور بڑے چاؤ چاہت کے ساتھ مگر ہر بار دیکھا کہ جو چیز بہت نزدیک ہوتی بس وہی کھاتے رہتے۔ دال قریب ہے تو وہ کھا رہے ہیں، مچھلی دور ہے تو طلب نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی فرق ہی

محسوس نہیں کیا کہ بیگن کا بھرتہ نوش جان کر رہے ہیں کہ بھیجہ۔ شاہی ٹکڑے لے لئے ہیں کہ بگھارے آلو۔ فیضؔ صاحب کی اس اچھی یا بری عادت کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اگر اچانک آ گئے تو ہمیں کھانے کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اچھا برا جو بھی پکا تھا پیش کر دیا۔ انہوں نے مزے لے کر کھا لیا۔ جب بھی ٹیلفون پہ کہا "ہم آ جائیں کھانا کھلاؤ گی؟" میں نے جواب دیا "ضرور" وہ آئے حاضر میں کوئی حجت نہ کی اور کھا لیا۔

فیضؔ صاحب بڑے اچھے مہمان ہیں۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے آتے ہیں۔ آنے کے بعد اگر ان سے پوچھیں "چائے، کافی، شربت یا کوئی اور چیز؟" تو کہہ دیتے ہیں "چائے" اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اگر ہر چیز سے انکار کر دیں تو میزبان کی دل شکنی ہوتی ہے اور چائے ایسی چیز ہے جو کم سے کم وقت میں تیار ہو جاتی ہے۔ باقی چیزوں میں کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے تو اس جھنجھٹ میں کون اپنے میزبان کو ڈالے۔

ان کی میزبانی کا شرف ہر ایک حاصل کر سکتا ہے۔ جو بھی دعوت پر بلائے چلے جاتے ہیں انکار نہیں کرتے۔ اگر کوئی کہے کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے اور انھیں اس دن کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو دعوت قبول کر لیتے ہیں یا پھر میزبان ہی کی بتائی ہوئی کوئی دوسری تاریخ مان لیتے ہیں۔ ہم نے انھیں ایسی بہت سی دعوتوں میں جاتے ہوئے دیکھا ہے جن سے انھیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہاں بہت بور ہوئے مگر گئے ضرور۔ معلوم ہوتا ہے "نہیں" کا لفظ ان کی ڈکشنری میں موجود نہیں۔ انکار سے گریز اور اس اقرار کے صرف دو سبب سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک تو وہ کسی کو ناخوش نہیں کر سکتے۔ دوسرے لمبی چوڑی بحث کے بعد مان لینے سے بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ فوراً ہاں کہدو اور چلے جاؤ دعوت میں۔ میں نے ایک دن کہا "فیضؔ صاحب یہ جو آپ ہر ایک کے گھر چلے جاتے ہیں اگر خدانخواستہ عورت ہوتے تو نہ جانے کب

کیا گڑ بڑ ہو جاتی۔" اس پر بہت محظوظ ہوئے۔

ہم پر مدتوں فیضؔ صاحب کی عظمت اور قابلیت کا رعب رہا۔ رعب تو اب بھی اتنا ہی ہے مگر اب اُسے چھپانے کا سلیقہ آگیا ہے۔ پہلے تو بہت سوچ سمجھ کر کوئی علمی یا ادبی مسئلہ چھیڑتے اور ان کے خیالات اور گفتگو سنتے تھے تاکہ محفل میں کچھ گرمی رہے، کوئی تو کچھ بولے اور فیضؔ صاحب سے اس کا کوئی جواب سنے۔ بعد کے تجربے سے یہ سبق سیکھا کہ ہم دونوں اکیلے ہوں تو ضروری نہیں کہ کوئی بات ضرور ہی کی جائے۔ وہ بیشتر خاموش رہتے ہیں اس لئے ہم کو بھی خاموشی اختیار کرنے کا ڈھنگ آگیا۔ چنانچہ ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھے ہیں وہ بھی چُپ ہم بھی چُپ۔

ایک بار انھیں آزمانے کے لئے کہ وہ ہماری گفتگو سنتے بھی ہیں یا محض سننے کی ایکٹنگ کرتے ہیں، میں نے اپنے بچپن کی سنی ہوئی چڑیا اور چڈے کی کہانی شروع کی۔ ان کی محویت میری سمجھ میں نہ آئی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مجھے خیال ہوا لیلیٔ شعر و سخن انھیں کسی اور دنیا کی گشت کرانے لے گئی ہے اور اب وہ میری محفل میں ذہنی طور پر حاضر نہیں ہیں۔ میں نے اچانک ایک جگہ وہ کہانی روک دی اور بالکل خاموش ہوگئی۔ سگریٹ کے دس بیس کش لگا کر بولے: "پھر اس سفید چڑیا نے پہلے چڈے کا خیال دل سے کیسے نکال دیا؟" اس استفسار پر مجھے یقین ہوگیا کہ کہانی سن رہے تھے۔ چنانچہ انھیں پوری کہانی سنانی پڑی۔

سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہ کیسے فیضؔ ہیں جن سے ہم ملتے ہیں۔ اگر نقشِ فریادی، دستِ صبا اور زنداں نامہ ان کے تخیلات و تجربات کا آئینہ ہیں تو پھر ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے فیضؔ صاحب اپنے خول کے باہر نکلتے ہی نہیں۔ وہی خول جس کے بغیر انھوں نے ایک سے ایک شاہکار تخلیق کیا۔ نہ گفتگو میں گرمی نہ تلتف میں تیزی۔ نہ کبھی کوئی شوخی دکھائیں نہ کہیں کوئی تڑپ محسوس کریں

نہ غم نہ غصہ۔ نہ شور نہ شکوہ یہ کیسے انقلابی شاعر ہیں کہ کبھی گفتگو میں سیاست کا رنگ ہی نہیں جھلکتا۔ شعر میں موتی رولتے ہیں محفل میں چپ چاپ رہتے ہیں۔ یہ تو سراسر بخیلی ہے۔ میرے تخیل میں جو 'بانکا' اور اپنی شعری تراکیب کی طرح سجیلا شاعر تھا وہ تو یہ فیض صاحب نہیں ہیں۔ یہ تو بے حد دوست قسم کے انسان ہیں۔ شاعر بھی دوست ہوتا ہے، بہت اچھا دوست مگر یہ تو اتنے اچھے دوست نکلے کہ اندر کا شاعر ہی غائب ہو گیا۔

یک طرفہ دوستی کے باوجود کبھی جی نہ چاہا کہ صرف فیض کہوں۔ ان کی خاموش طبیعت سے کبھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مہینوں نہ آئیں یا ٹیلیفون نہ کریں تو کبھی شکایت کی ہمت نہ ہوئی۔ خط کے جواب نہ دیں تو شکوہ کرنے کی جرارت نہ ہوئی۔ یہ سب غالباً مزاج شناسی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ انہوں نے ہمیں پہچانا ہو یا نہ ہو ہم تو انھیں جان گئے پہچان گئے۔

ایک بات پر میرا ان کا اختلاف موجود ہے وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ دوستی ہوتی تو خود بخود ہے مگر اسے قائم رکھنے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ کہتے ہیں محنت مشقت کی دوستی، دوستی نہیں فیکٹری کا بنا بنایا مال ہے۔

لاہور کے قیام کے زمانے میں ایک بار فیض صاحب کا فون آیا اور خلاف عادت بات شکایت سے شروع کی "تم نے ہمیں فون کیوں نہیں کیا" ہم حیران کہ آخر بلا وجہ فون کیوں کرتے۔ کبھی شکایت نہ کرنے والے سے کہا "اس شکایت کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟" "کیا آپ کو کوئی خاص بات کہنی تھی جو میں فون کرتی تو کہہ دیتے؟" فرمایا "ہم آجائیں۔ کیا کھلاؤ گی؟"

"دال روٹی"

"تو پھر نہیں آتے۔"

"اور اگر نرگسی کوفتے، سیخ کباب اور مرغِ مسلّم ہو تو؟"

"آجائیں گے۔"

ایک بجے تشریف لائے۔ معمول سے زیادہ خوش مگر خموشی بھی نمایاں۔ اس بشاشت کا سبب دریافت کرنے کو جی چاہا مگر برسوں کی سنگت نے سکھایا ہے کہ فیض صاحب سے کم سے کم سوال پوچھنا چاہیے تاکہ انھیں جواب کی زحمت نہ ہو۔

کھانے کے بعد دھوپ میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ باہر سبزہ زار پر کرسیاں رکھوا کر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ یوکلپٹس کے بڑے بڑے درخت چاروں طرف خوبصورت رنگوں کے بیسیوں موسمی پھول، ان کی مہک، چڑیوں کی چہکار شاعر کی مسرتوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ کبھی درختوں کو دیکھتے کبھی پھولوں پر غور کرتے کبھی بے سبب مسکراتے کبھی بے وجہ ٹہلتے۔ پھر ایک بار دھیمے سے بولے۔

"شعر کہنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

معلوم نہیں مجھ جیسا کوئی اور خوش نصیب ہے جس نے فیض صاحب کی زبان سے یہ جملہ سنا ہو، ایسا منظر دیکھا ہو ان کا ایسا موڈ دیکھا ہو۔ میرے لئے یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ دیکھتے دیکھتے آسمان سے پھول برسیں گے، ستارے اتریں گے۔

درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا یوکلپٹس کے درخت کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟" شکر ہے حافظے نے ساتھ دیا اور میں نے کہا" شاید لغت میں یہ لفظ ملے یا نہ ملے اس کو سفیدہ کہتے ہیں اور مالی بھی یہی نام بتاتے ہیں۔" معلوم نہیں فیض صاحب نے یہ جواب سُنا یا نہیں سنا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی، ہاتھ میں ڈبیہ تھی مگر خالی۔ کھوئے کھوئے سے دکھائی دینے لگے۔ میں اندر گئی اور ان کے لئے سگریٹ لے آئی۔ سگریٹ کے چند کش لئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ مسکرائے اور اس کے بعد گنگنانے لگے۔ میں سمجھ گئی نزول شعر کا لمحہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ چائے کا بہانہ کرکے اندر چلی گئی۔ اطمینان سے چائے بنائی اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد باہر آئی تو دیکھا گنگناتے ہوئے ٹہل رہے ہیں۔ چائے کی پیالی رکھ کر پھر اندر چلی گئی۔ دوبارہ بھی بہت دیر بعد باہر آئی تو دیکھا اب پہلے سے بہت زیادہ مسرور ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس دن فیضؔ صاحب نے شعر کہے یا نہیں - اگر کہے تو کون سے - بس ہماری ان کی دوستی ایسی ہے - نہ ہم پوچھیں نہ وہ بتائیں -

اتنا کچھ انھیں جاننے اور ان کے اتنے قریب رہنے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم فیضؔ صاحب کو جانتے ہی نہیں - واقعی کتنا جانتے ہیں اور کیا جانتے ہیں - اگر آج رشیدہ آپا ہوتیں اور پوچھتیں "فیضؔ کو تو تم جانتی ہو نا؟" تو ہم اثبات میں جواب نہ دے سکتے -

خوش قسمت ہیں کہ ہم رشیدہ آپا کو جانتے تھے اور وہ فیضؔ کو جانتی تھیں - اس لئے ان ہی کے رشتے ناتے سے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فیضؔ صاحب کو جانتے ہیں -

---

مرزا ظفر الحسن

ساٹھویں سے پینسٹھویں سالگرہ تک

(اس مضمون کا کچھ حصہ جشن فیض میں پڑھا گیا جو لاہور میں جمعہ ۱۳/ فروری ۱۹۷۶ء کو فیض کی ۶۵ ویں سالگرہ پر محبان فیض نے منایا تھا۔)

جناب فیض احمد فیض پر مضمون لکھنے کا مسلسل وعدہ کرنے اور متواتر وعدہ خلافی کرنے والے ہمارے ایک دوست ہیں اس محفل میں تشریف فرما ہیں، میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا ورنہ آپ جان جائیں گے کہ وہ حمید اختر ہیں۔ ان ہی حمید اختر کا حکم کراچی پہنچا کہ مجھے آج کی اس تقریب میں حاضر ہو کر کچھ عرض کرنا ہے۔

ہائے کراچی اور اس کا وہ صدر مقام کہ ایک زمانے میں سارے حکم احکام وہیں سے نکلا کرتے تھے اور آج اس کا یہ مقدر کہ ہم جیسوں کو بھی پکڑ بلواتے ہیں اس لفظ "ہم" پر اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ تم کس باغ کی مولی ہو تو۔ جناب ڈومنی کو مار نہ رکھنے کے باوجود مرزا غالب کی طرح مغل بچہ ہوں۔

ڈومنی ڈومنی کی بھی بات ہوتی ہے۔ غالب کے زمانے میں جیسی ڈومنیاں ہوتی تھیں اب کہاں ملتی ہیں، نہ ڈومنی نہ قرض کی مے مگر فاقہ مستی جاری ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ میں کس باغ کی مولی ہوں مورخین تحقیق کریں شاید انہیں شالامار باغ میں کبھی اگنے والی مولی کا کوئی سراغ مل جائے۔ اس مولی سے کوئی تعلق نہیں تو باغ کے کسی مالی ہی سے ہمارا رشتہ نکل آئے۔

مالی کو آپ کم حیثیت آدمی نہ جانیں۔ جب سے مولوی عبدالحق نے اپنے ہم عصر نام

دیومالی کا تذکرہ لکھا ہے محققین مسلسل تحقیق میں مبتلا ہیں کہ اردو ادب میں مالی کا تذکرہ کہاں آیا ہے کن شعراء نے مالی پر نظمیں کہی ہیں اور کن رسائل نے خاص مالی نمبر شائع کئے ہیں۔ ماہرین لسانیات یہ دریافت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ باغ کے مالی اور مملکت مالی میں لسانی نسبت کیا ہے مالی کے رہنے والے صرف بہ اعتبار قوم مالی کہلاتے ہیں۔ یا بہ اعتبار پیشہ بھی مالی ہیں اگر پوری قوم پیشہ ور مالی ہے تو اب تک ہمارے مالیوں نے کوئی پاک مالی انجمن کیوں نہیں بنائی۔

لاہور پہنچنے کے حکمنامے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ کوئی مضمون لکھ کر لاؤں۔ مہلت دو دن موضوع فیض مضمون مفصل اور حاکم حمید اختر جو خود گذشتہ آٹھ ماہ سے سوچ ہی رہے ہیں کہ وہ فیض کے فن یا زندگی کے کس پہلو پر لکھیں گے۔ فی البدیہہ تقریر میں آئیں بائیں شائیں جو جی میں آئے کہہ دیجئے۔ مجال ہے جو مقرر یا تقریروں کا منتظم کسی کی گرفت میں آئے ورنہ نیشنل سینٹر کب کے بند ہو گئے ہوتے۔ سوائے کشور ناہید کے سینٹر کے جنہوں نے سینٹر کی ایک ادبی تقریب میں مہمان خصوصی بنا کر میری بہت تعریف کی تھی۔ فی البدیہہ تقریر کے مقابلے میں مضمون کا معاملہ مختلف ہے اور وہ بھی اگر فیض پر ہو کیونکہ خود فیض جو کہتے ہیں ہمارے اخبار چھاپتے نہیں اور فیض جو نہیں کہتے وہ اپنی طرف سے چھاپ دیتے ہیں۔ میں نے ایک اخبار نویس سے پوچھا بھئی جب تمہارے پاس چھاپنے کو تیلو، نشو موجود ہیں تو تم فیض کی بابت جھوٹ موٹ کی باتیں کیوں شائع کرتے ہو؟ جواب دیا۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے۔ میں نے پوچھا اپنے یا ناظرین کے منہ کا؟ کہنے لگے تیلو اور نشو کے منہ کا۔

فیض پر فوراً کوئی نیا مضمون لکھنے میں مجھے دقت یہ ہو رہی تھی کہ اسی وقت میں ایک اور مضمون لکھ رہا تھا جس میں سبط حسن کا ذکر تھا۔ سبط حسن اس شہر نگاراں میں برسوں رہ چکے ہیں اور آپ میں سے بیشتر ان کی علانیہ عادتوں اور خفیہ خرابیوں سے واقف ہیں مگر آپ کو یہ نہیں معلوم ہو گا کہ اپنے حلقۂ احباب میں سبطے صرف مجھے اس امر کا مستحق سمجھتے ہیں کہ مجھے ڈانٹنا ان کا پیدائشی حق ہے اور اس ڈانٹ کو بخوشی

قبول کرنا میرا انسانی فرض ہے۔ سبطے ہمیشہ سے حق کے علمبردار اور فرض کے محافظ رہے ہیں اس لئے ڈانٹ کی قبولیت کے معاملے میں چینیوں کی طرح ترمیم ناپسند ہیں۔

حق حاصل کیا جاتا ہے اس لئے مجھے ڈانٹنے کا حق سبطے نے اپنے لئے حاصل کر لیا۔ فرض عاید کیا جاتا ہے اور وہ انہوں نے مجھ پر عاید کر دیا۔ اسے کہتے ہیں چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی۔ اس کی مثال میں اس طرح دوں گا کہ ایک میز پر اپنے سامنے دو کیلے رکھے دو دوست بیٹھے تھے۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا فرض کرو ایک کیلا تم نے مجھے دے دیا اور دوسرا کیلا میں نے خود لے لیا تو بتاؤ تم کیا کھاؤ گے؟ دوسرے نے جواب دیا۔ غم۔ یہ الفاظ دیگر میں غم کھا رہا ہوں اور سبطِ حسن وہ دونوں کیلے جس میں سے ایک کیلے کا نام "حق" اور دوسرے کا نام "فرض" ہے۔ کیلوں کے اس طرح نام رکھنے پر آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ایک سابق انسپکٹر پولیس نے جو خیر سے شاعر بھی ہیں، راز تخلص کرتے ہیں، مرادآبادی نہیں گجراتی۔ راز گجراتی۔ انہوں نے اپنے باغ کے ایک آم کا نام "غالب پسند" رکھا اور اس پر ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ جس کے دو نسخے غالب لائبریری میں اس خیال سے بھی محفوظ کر لئے گئے ہیں کہ بوقتِ ضرورت ہم ثابت کر سکیں کہ کوتوال شہر سے غالب کی ان بن تھی تو کیا ہوا۔ ہماری آشنائی پولیس انسپکٹروں سے ہے۔ پرانے زمانے میں کوتوال اہم آدمی ہوتا تھا۔ آجکل تھانیدار ہوتا ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں جو حلقۂ اثر مختلف ہونے کے باوجود محض اختیار و اقتدار کی مناسبت سے کچھ لوگ خود کو تھانوی کہنے لگے ہوں حالانکہ نہ وہ اصلاً تھانوی ہیں نہ نسلاً۔

ڈانٹنے کی عادت پر ایک دن میں نے سبطے سے احتجاج کیا تو جواب میں فرمایا "یہ تو گذشتہ پینتیس برس سے ہو رہا ہے۔ اب نہ میرا مزاج بدل سکتا ہے نہ تم اپنی طبیعت میں تبدیلی لاؤ۔"

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر ڈانٹ ڈپٹ کی موجودہ صورت حال الٹ ہو گئی یعنی سبطے کو ڈانٹنا میں اپنا انسانی حق اور اس ڈانٹ کو قبول کرنا سبطے کا پیدائشی فرض

سمجھنے لگوں تو کیا ہوگا ؟ ایک حسینہ نے جارج برنارڈ شا سے کہا " میں حسن میں یکتا
آپ علم و دانش میں یگانہ ہم دونوں شادی کرلیں تو ہماری اولاد میں میری شباہت اور
آپ کی قابلیت آئے گی " برنارڈ شا نے جواب دیا " محترمہ اگر اس کا الٹ ہو گیا یعنی آپ
کی سمجھ اور میری صورت آگئی تو کیا ہوگا ؟ " شادی کا ذکر آیا ہے تو قاضی صاحب کا تذکرہ
بھی کردوں۔ سبطے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ قاضی عبدالغفار مرحوم کے ممنون ہیں جنہوں
نے سبطے کو مخدوم محی الدین سے متعارف کرایا۔ میں سبطے کا احسانمند ہوں انہوں نے مجھے
فیض سے ملایا یعنی میری اور فیض کی دوستی کا نکاح قاضی سبط حسن نے پڑھایا۔ فیض
اور سبطے کراچی میں کبھی ہم محلہ تھے۔ ایک دوسرے کے گھر روز کا آنا جانا تھا جس دن سبطے
مجھے فیض کے گھر لے گئے اسی دن ادارۂ یادگار غالب کی بنیاد پڑی۔ ادارۂ یادگار غالب کی
کہانی طویل، داستان فیض طویل تر اور اس وقت جبکہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مجھے
پریشانی ہے کہ لاہور کے لئے رخت سفر بھی باندھنا ہے۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ چوالیس
پونڈ میں سامان سفر ہی کتنا ہوگا تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم سب جب سفر
کرتے ہیں چاہے وہ ہوائی ہو یا ریلوائی تو چوالیس پونڈ وزن تو فکروں اور پریشانیوں
کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں آپ کو ایک سفر کا قصہ سناتا ہوں۔

غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ایک کل پاکستان مشاعرہ بھی کرنا تھا۔
سب سے زیادہ مہمان شعراء لاہور سے آنے والے تھے۔ سوال یہ تھا کہ ان سب
کو ایک ساتھ کراچی لانے کی ذمہ داری کس کے سپرد کی جائے۔ میں سبطے وغیرہ تو لاہور
سے شاعروں کو لانے والے مرد شعر افگن کا نام سوچ رہے تھے۔ یہاں شعر افگن
میں ش ی ر والا شیر نہیں بلکہ ش ع ر والا شعر ہے۔ ہاں تو ہم اس مرد شعر افگن کا
کا نام سوچ رہے تھے اور فیض نے سوچے بغیر کہہ دیا وہاں اپنا حمید اختر جو
ہے بناؤ اسے قافلہ سالار۔ وہ سب سے بڑا ش ع ر والا شعر افگن ہے چنانچہ
ان حضرت کو ٹیلی فون کیا گیا اور موصوف نے تین چار دن بعد میں اطلاع دی کہ
فلاں فلاں شاعر آرہے ہیں۔ حمید اختر نے کس مصیبت سے ان تمام شاعروں

کو ان کے گھروں یا اڈوں سے اٹھایا اور ریل پہ لادا وہ ان ہی سے پوچھیئے۔

جب ریل چلی اور میرے محترم صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب نے شاعروں کی مدارات خاص کے سامان کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ نوش جاں کرنے کے لئے اور سب کچھ موجود ہے سوائے برف کے۔ مئی کی گرمی میں برف کے بغیر بھلا کوئی چیز پی جا سکتی تھی؟ پوچھا حمید اختر برف کہاں ہے؟ حمید اختر کو یاد آ گیا تو نظریں نیچی کئے جواب دیا صوفی صاحب غلطی ہوگئی برف لانا بھول گیا۔ ریل چل پڑی ہے حاضر میں حجت نہیں جیسے تیسے گذارہ کرلیں گے۔ صوفی صاحب نے ذرا اونچی آواز میں فرمایا کس نالائق نے تمہیں منتظم سفر بنایا؟ حمید اختر نے ذرا ہمت سے جواب دیا آپ کے شاگرد رشید فیض صاحب نے۔ صوفی صاحب کڑک کر بولے تم فوراً برف کا انتظام کرتے ہو یا میں خطرے کی زنجیر کھینچوں۔ جوں جوں ریل کی رفتار تیز ہو صوفی صاحب کا پارہ چڑھتا جائے۔ ریل بہت تیز چلنے لگی تو کچھ صوفی صاحب دھیمے ہوئے کچھ حمید اختر اور زیادہ ڈھیلے اور طے یہ ہوا کہ اگلے اسٹیشن پر ریل رکتے ہی حمید اختر برف فراہم کریں گے یا ریل کو لاہور لوٹا دیں گے۔

اسٹیشن آیا، ریل رکی، حمید اختر نے پلیٹ فارم پر چھلانگ لگائی۔ برف والے کے پاس گئے اور غصے میں اس کی ساری برف خرید لی۔ ادھر صوفی صاحب ریل کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے نگرانی کر رہے تھے کہ حمید اختر برف لانے کی بجائے کسی دوسرے ڈبے میں نہ گھس جائیں اور اپنی رننگ کامنٹری میں کہہ رہے تھے جو شخص برف کا انتظام نہیں کر سکتا وہ اخبار میں کیا خاک کام کرتا ہوگا۔ گویا فیض احمد فیض کامیاب چیف ایڈیٹر اسی لئے کہلائے کہ میاں افتخار الدین مرحوم والے پاکستان ٹائمز کے دفتر میں برف کا کارخانہ بھی چلاتے تھے۔ حمید اختر کو برف لانے میں جب دیر ہوگئی تو صوفی صاحب نے فرمایا میں تو پہلے سے جانتا تھا کہ اس شخص میں تو برف خریدنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔

خریدنے کو تو برف خرید لی مگر حمید اختر کے لئے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ دکان سے

اٹھا کر ریل کے ڈبّے تک برف لائیں کس برتن میں اور رکھیں کہاں۔ برف والے سے کہا یہ جو تمہاری بکیٹ ہے ہمیں دے دو۔ اور ہم سے اس کے دام لے لو۔ برف والے نے جواب دیا واہ صاحب یہ بکیٹ تو ہمارے دادا کے زمانے کی ہے اور اسی کی برکت سے ہمارا کاروبار چلتا ہے ہم یہ کس طرح دے دیں۔ حمید اختر نے اس کے دام بڑھانے شروع کئے دو تین روپے سے بڑھاتے ہوئے دس بارہ روپے تک پہنچ گئے مگر دادا کا وہ پوتا ٹس سے مس نہ ہوا۔

اتنے میں گارڈ نے سیٹی بجادی اور ادھر صوفی صاحب نے آواز لگائی کہ اسی باعث تو اس شخص کا اخبار نہیں چلتا ہے۔ دیکھ لو ذرا سی برف کا معاملہ نہ کر سکا۔ اب حمید اختر نے مول تول کی ترکیب ترک کر کے دوسرا نسخہ استعمال کیا۔ بڑی منت سماجت کے لہجے میں اس سے کہا بالو جی خدارا اس کھڑکی کی طرف دیکھو جس میں سے میرے دادا تمہیں اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ انہیں ایک سخت قسم کی بیماری ہے جو بار بار برف نہ کھلائی جائے تو خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے اس میں بیمار کا تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا مگر ہم تیمارداروں کی جان نکل جاتی ہے۔ اسی بیماری کا علاج کرانے کے لئے ہم اپنے دادا حضرت کو کراچی لے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر راستے میں انہیں برف نہ دی گئی تو یا یہ کراچی نہیں پہنچیں گے یا ہم۔ خدارا رحم کرو اور دے دو یہ خالی بکیٹ۔ گارڈ نے دوسری سیٹی بجائی لوگوں نے برف والے کو شرم دلائی کہ تیرے دادا کی بکیٹ زیادہ اہم ہے کہ ان کے دادا کی جان تو اس نے بکیٹ دے دی اور حمید اختر صوفی صاحب کو منہ دکھانے کے قابل ہوئے۔ ریل کراچی پہنچی فیض کے ساتھ ہم سب استقبال کے لئے اسٹیشن گئے دیکھا سب سے پہلے حمید اختر اتر رہے ہیں ان کے ایک ہاتھ میں بکیٹ ہے اور دوسرے میں حقّہ۔ پوچھا صوفی صاحب نہیں آئے؟ غصے میں جواب دیا یہ حقّہ کس کا ہے پہچانتے نہیں بکیٹ بھی ان ہی کی ہے۔ واپسی کے سفر پھر استعمال ہوگی۔"

آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے اور بالکل آج ہی کی تاریخ یعنی ۱۳ فروری کو فیض

کی ساٹھویں سالگرہ کے دن ایلس فیض نے میرے گھر ایک چٹھی بھیجی جس میں لکھا تھا۔ فیض آج ساٹھ سال کے ہو گئے ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی سوانح لکھ ڈالیں۔ اس کام کے لئے انہیں ایک مددگار کی ضرورت ہے۔ میں نے تمہارا نام لیا تو وہ خوش ہو گئے۔ کیا تم کوئی مدد کر سکتے ہو۔ اگر کر سکتے ہو تو کل فیض سے مل لو۔ شام کراچی کے ایک کالج میں ساٹھویں سالگرہ کی ایک بہت بڑی تقریب ہوئی اور رات کو ایک عشائیہ۔ دوسرے دن صبح دس بجے میں فیض کے گھر دھمک گیا کہ صاحب بیٹھیں ذرا بات کریں سوانح عمری کی۔ ابھی مجھ میں زیادہ ڈھٹائی پیدا نہیں ہوئی تھی، اس لئے فیض نے اپنی اسیری کے خطوط مجھے دیئے اور یہ کہہ کر ٹرخا دیا پہلے انہیں پڑھ لو اس کے بعد کوئی تفصیلی بات کریں گے۔ میں نے ایک دن میں وہ ۱۳۵ خطوط پڑھ ڈالے، سوانح عمری کی بات عارضیتاً ٹل گئی اور تین ماہ کے اندر صلیبیں مرے دریچے میں کے عنوان سے وہ خطوط شائع ہو گئے۔ چونکہ ان خطوط کا ترجمہ فیض ہی سے کرانا تھا اس لئے میں نے سوانح عمری کا تذکرہ عمداً نہیں کیا تاکہ کہیں فیض بدک نہ جائیں اور ساری کی خاطر آدھی بھی ہاتھ سے جاتی رہے۔

خطوط چھپ گئے تو میں نے کہا جناب اب گفتگو کریں سوانح عمری کی فرمانے لگے یار تین مہینے ترجمے پر محنت کی ہے کچھ تو مہلت دو۔ چنانچہ مسلسل مہلت لیتے لیتے فیض اسلام آباد چلے گئے اور میری دسترس سے باہر ہو گئے۔ ایک آدھ سال کے بعد میں اسلام آباد نازل ہوا اور وہاں پکڑا کہ بیٹھیں اور لکھیں اپنی سوانح۔ وہاں فیض کی طرح طرح کی مصروفیتیں تھیں۔ گھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا اور خود فیض کی ظہرانوں عصرانوں عشائیوں اور ادبی تقریبوں میں لازمی شرکت۔ کچھ کام ہوا کچھ نہیں ہوا اور میں کراچی لوٹ آیا۔

فیض مہینے میں ایک آدھ بار کراچی آتے رہے اور ان کا کرم کہ ہر مرتبہ آنے سے پہلے مجھے اطلاع دیتے رہے کہ ہم آ رہے ہیں۔ فیض جب بھی آئے گرمی بازار کی نوعیت مختلف رہی۔ کبھی فلم کا چکر، کبھی آرٹ کا شوشہ، کہیں نمائش کا افتتاح تو

کہیں تقریب کا بہانہ۔ کوئی کلام سننے خود آرہا ہے کوئی سنانے کے لئے انہیں اپنے گھر لے جا رہا ہے۔ اس لئے کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ میری نیت یہ تھی اور اب بھی ہے کہ فیض کی تین سوانح عمریاں لکھی جائیں جو وقت کا تقاضا ہے۔ ایک تو خود نوشت جس کا نام میں نے عمرِ گذشتہ کی کتاب رکھا ہے اور جو فیض کو بے حد پسند ہے۔ دوسری سوانح انگریزی میں ہو جو ایلس فیض لکھیں اور تیسری ذکرِ فیض جو میں خود لکھوں۔ بلکہ آج کل لکھ رہا ہوں اور یہ تینوں ایسی سوانح عمریاں ہوں جنہیں یکے بعد دیگرے پڑھا جائے تو فیض کی زندگی اور فن دونوں کا مکمل جائزہ ملے۔

فیض چونکہ کم نویس ہیں اس لئے ان سے امید نہیں اور ہم آپ چاہتے بھی نہیں کہ خود نوشت میں یادوں کی برات نکالی جائے۔ ایلس کی لکھی ہوئی سوانح میں فیض کو، جیسے وہ اپنے گھر میں ہوتے ہیں، پیش کیا جائے جو ایلیس کے سوا کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ میری مجوزہ سوانح میں، میں ایسی باتیں لکھوں جو فیض اور ایلس کے بیان کردہ حالات سے مختلف ہوں مثلاً فیض کی شہرۂ آفاق نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" سے متعلق جو میں اور بھی کہیں لکھ چکا ہوں۔

جن دنوں فیض فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھے اور دلّی میں رہتے تھے ان کے پاس ایک سول مجسٹریٹ نے سمن بھیجا کہ آپ فلاں تاریخ حاضرِ عدالت ہوں۔ الزام یہ کہ فیض نے اپنے ریڈیو کا لائسنس نہیں بنوایا تھا۔ انگریز کی بنوائی ہوئی وردی میں ملبوس لیفٹیننٹ کرنل نے سوچا کہ سول مجسٹریٹ کی یہ جرأت کہ برطانوی ہند کے فوجی افسر کے نام حاضری کا سمن بھیجتا ہے۔ مگر کرنل کی وردی کے اندر جو ایک شخص چھپا بیٹھا تھا فیض احمد فیض۔ اس نے کہا سمن عدالت کا ہے اور جرم ہم سے سرزد ہوا ہے اس لئے جانا چاہیئے۔ چنانچہ فیض عدالت پہنچے۔ مجسٹریٹ انہیں اپنے کمرۂ خاص میں لے گیا اور بولا فیض صاحب یہ میری خوش بختی ہے کہ آپ سے ریڈیو کا لائسنس نہ بنوانے کا قصور ہوا اور میں آپ کو اپنی عدالت میں طلب کرسکا۔ بہ حیثیت شاعر آپ کا جو مقام ہے اس کے پیش نظر مجھے آپ

کو طلب تو نہ کرنا چاہئے تھا مگر بات یوں ہے کہ میری بیوی کو آپ کی نظم مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ بے حد پسند ہے اور وہ مجھے ہمیشہ طعنہ دیتی ہے کہ تم تو دو کوڑی کے مجسٹریٹ ہو ایک شاعر کو بلوا کر اس سے ہمیں اس کی نظم بھی نہیں سنوا سکتے۔ بس اس لمحے کو غنیمت جان کر میں نے سمن بھیجدیا کہ آپ تشریف لائیں تو عرض کروں کہ کسی دن میرے غریب خانے چل کر میری بیوی کو اپنی نظم سنا دیں تاکہ وہ خوش بھی ہو جائے اور ہماری مجسٹریٹی کا بھرم بھی برقرار رہے۔ فیضؔ نے جواب دیا آپ ویسے بھی مجھے بلاتے تو میں حاضر ہو کر نظم سنا دیتا اچھا بتائیے ہم سے جو جرم سرزد ہوا ہے اس کی کیا سزا آپ نے تجویز کی ہے۔ مجسٹریٹ نے جواب دیا آپ کی یہ نظم آپ کی تمام پچھلی خطاؤں کی معافی کے لئے کافی ہے۔

میرے عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات نہ فیضؔ لکھیں گے اور نہ ایلیس فیضؔ، اور خودستائی معاف صرف میں ہی لکھ سکتا ہوں کیوں راز دنیاز کی ایسی باتیں کرید کر نکالنے کا جو گر مجھے آتا ہے فیضؔ کے کسی دوست کو نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو وہ فیضؔ کے ایک خاص گر سے ناواقف ہیں اور یہی وہ گر ہے جس کا نام شعیب ہاشمی نے اپنے ٹی وی کے پروگرام کے لئے استعمال کیا۔ ٹال مٹول۔

ایک دن میں نے فیضؔ سے کہا ڈاکٹر جانسن نے مسلسل بیس سال تک باسویل سے تعاون کیا تب جا کر باسویل جانسن کی سوانح لکھ سکا۔ زیادہ نہیں آپ صرف بیس ہفتے مجھ سے اشتراک کر لیں آپ کی خود نوشت بھی تیار ہو جائے گی اور اس کے ساتھ آپ کی دوسری دو سوانح عمریاں بھی۔ کہنے لگے سب ٹھیک ہو جائے گا یار فکر کیوں کرتے ہو اس پر میں نے کہا فکر اس لئے کرتا ہوں مجھے پانچ سال پہلے ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے چاہتا ہوں کہ یہ کام جلد سمیٹ لوں۔ فرمانے لگے ہارٹ اٹیک، وہ تو کوئی بات نہیں ہمیں بھی ہو چکا ہے اور ہم اس پر نظم بھی لکھ چکے ہیں۔

فیضؔ کے فن پر ابھی تک ایک بھی مستقل کتاب شائع نہیں ہوئی اور جو شائع ہوئی وہ انگریزی میں اور یونیسکو کی طرف سے ہے۔ پوئمس ہائی فیضؔ۔ مصنف فیضؔ کے

دوست ڈاکٹر کیرن ہیں جو کہتے ہیں فیض کے دوستوں کو ان سے ہر ہفتے پوچھتے رہنا چاہیئے۔ کہ انھوں نے کتنا تخلیقی کام کیا ہے۔ اس کتاب میں فیض کے فن کا کوئی تفصیلی اور مکمل جائزہ نہیں ہے بلکہ بیشتر تو ان کی نظموں کے تراجم ہیں۔ بریں ہم اس قابل قدر کتاب کے لئے محبان فیض کیرن کے شکر گذار ہیں۔ اردو میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تو اس کا فوری شکوہ کرنے کی یوں ضرورت نہیں کہ فیض کا فن مطبوعات کی صورت میں محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔ جس پر اب نہیں تو مستقبل قریب میں کام ہو سکتا ہے مگر فیض کی زندگی پر کم لکھا گیا یا نہیں لکھا گیا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آئندہ کے ادبی مورخین کو کتنی زحمت ہو گی۔ کل کی بات یاد کیجئے کہ علامہ اقبال جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے یوم پیدائش کا تعین کرنے کے لئے ایک کمیٹی بٹھانی پڑی۔ ہمارے پڑوسی ملک میں فیض سے کمتر ادبی حیثیت رکھنے والوں پر کام کرنے کے صلے میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی گئی ہیں۔ کراچی میں، میں خود فیض پر کچھ کام کر رہا ہوں اور اپنے چند رفقائے کار سے کام لے رہا ہوں۔ کراچی جیسے صنعتی شہر کے مقابلے میں لاہور علم و ادب کا بہت بڑا اور قدیم گہوارہ ہے مجھے لاہور والوں سے پوچھنا ہے کہ اس شہر میں فیض پر کیا کام ہو رہا ہے؟

دوسری اہم بات جو۔ تکلف برطرف۔ مجھے کھل کر اور کسی رعایت کے بغیر کہنی ہے یہ ہے کہ آرٹ، کلچر، فلم، تھیٹر، موسیقی، نمائش، جلسے، تقریبیں یہ سب بالکل ضمنی چیزیں ہیں۔ فیض کا اصل اور اہم مقام ادب ہے۔ فیض احمد فیض کے جملہ مالکانہ حقوق صرف اور صرف ادب کو حاصل ہیں۔ وجہ چاہے پیار و محبت ہو یا احترام و عزت اگر ہم رنجگوں، شبینوں اور دوسری سرگرمیوں کی بناء پر فیض اور ادب کے درمیان قرب کی بجائے بُعد پیدا کریں گے جو ہم کر رہے ہیں تو یہ نہ صرف فیض کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ ادب کے ساتھ دشمنی ہو گی۔ بلکہ ہم سب اس جرم کے مرتکب ہوں گے کہ ہم نے ادب کا حق غصب کر لیا۔ فیض کو ورغلا کر ان سے الم غلم کام لینے کی بجائے ہمیں چاہیئے کہ ہم انہیں تخلیقی کاموں کی طرف متوجہ کریں اور ڈاکٹر کیرن کے قول کے مطابق ان سے پوچھتے رہیں کہ انھوں نے کتنا تخلیقی کام نظم اور نثر میں کیا ہے۔ فیض بڑی آسانی سے اغوا ہو جاتے ہیں اور اغوا کرنے میں ہم لوگ اپنی مثال

آپ ہیں۔

میں آخر میں اپنی گفتگو ایک فلمی گانے پر ختم کروں گا جس کے شروع کے بول ہیں ــ

ہم تم
اک کمرے میں بند ہوں
اور چابی کھو جائے

اگر ایسا ہو اور چابی کھو جائے تو فیضؔ کی سوانح عمری مکمّل ہو جائے گی۔ میں اس کا یقین دلاتا ہوں۔

شہر بہ شہر

نصراللہ خاں

فیض امرتسر میں

فیض صاحب جب امرتسر کے ایم۔اے۔او۔کالج میں لیکچرار مقرر ہو کر آئے تو میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور صحافت کی تربیت حاصل کرنے کے لئے روزانہ لاہور آتا جاتا اور مولانا ظفر علی خاں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

میرے والد خواجہ محمد عمر خاں مرحوم مسلم ہائی اسکول امرتسر کے ہیڈ ماسٹر تھے، شہر میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے اور اپنے شاگردوں کے لئے مثل باپ کے تھے۔ انتہائی شفیق استاد تھے۔ اور طالب علم ان پر جان چھڑکا کرتے تھے۔

لاہور میں کٹڑہ خزانے کا اسلامیہ ہائی اسکول ہے۔ اُسی کی طرح والد نے امرتسر کے کٹڑہ خزانے میں اسکول کھولا تھا۔ امرتسر کے سارے تعلیمی ادارے انجمن اسلامیہ چلاتی تھی جس میں کشمیری برادری کے تجار اور مالدار لوگ شامل تھے۔ کسی زمانے میں یہ دستور تھا کہ مالدار اشخاص کی دولت کا کچھ حصہ ان کی وصیت کے مطابق مسلمانوں کے فروغِ علم کے لئے انجمن اسلامیہ کو دے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے ہال بازار کی جامع مسجد اور اس کے نیچے کی ساری دوکانیں شیخ خیرالدین مرحوم کے عطایا کا مجسّم ثبوت ہیں جن سے انھوں نے انجمن اسلامیہ امرتسر کو نوازا۔ اسی طرح سبزی منڈی کا میدان بھی انجمن کا تھا جس سے روزانہ ہزاروں روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ انجمن کبھی کسی سے چندہ نہیں لیتی تھی۔ اس کے دوامی اراکین کے باپ دادا کی عطا کردہ جائیدادوں کی آمدنی سے انجمن کی ضرورتیں پوری ہوتیں بلکہ وہ آمدنی

ضرورتوں سے زیادہ ہی تھی۔ خواجہ غلام صادق اور شیخ صادق حسن کے بزرگوں نے بھی انجمن کے لئے بڑی بڑی جاگیریں چھوڑی تھیں۔

میرے والد دوبارہ امرتسر آئے تو اس وقت انجمن کا ایک مڈل اسکول ایم اے او مڈل اسکول اور ایک ایم اے او ہائی اسکول تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک اینگلو انڈین ایس مرکیڈو تھے جو سورج مکھی تھے۔ بالکل انگریز معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جہاں جہاں ان کی اصلی کھال کے ٹکڑے رہ گئے تھے انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کسی زمانے میں کالے ہوں گے۔ امرتسر میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا ایسا ہو جو مسٹر مرکیڈو کا شاگرد نہ رہا ہو۔ شیخ صادق حسن، خواجہ غلام یٰسین، شیخ محمد صادق، میر مقبول محمود، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور خود میرے والد ان کے شاگرد تھے۔ ان کا انتظام و انصرام بھی اعلیٰ اور نظم و نسق بھی۔ تعلیم کا معیار بھی خاصا اونچا رکھا تھا۔ میرے والد نے ایم اے او مڈل اسکول کو ہائی اسکول بنایا اور اس کا نام مسلم ہائی اسکول رکھا گیا۔ پھر اس کی شاخ جو کٹرہ خزانے میں کھولی گئی تھی ہائی اسکول کے درجے تک پہنچ گئی۔ مسلمان طالب علم ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ہندوؤں کے ہندو سبھا کالج یا سکھوں کے خالصہ کالج میں تعلیم پایا کرتے تھے اس لئے امرتسر میں مسلمانوں کے لئے کوئی کالج کھولنا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ ایم اے او کالج قائم کیا گیا اور مسٹر مرکیڈو کو اس کا پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ان کے نام سے کالج میں مرکیڈو ہال بھی تعمیر کیا گیا کیونکہ وہ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔

اس کالج کے لکچراروں کی اکثریت میرے مکان کے سامنے والے مکان کی دوسری منزل میں رہا کرتی تھی جن میں پروفیسر کرامت حسین، پروفیسر پال، پروفیسر نثیر احمد اور اپنے فیض احمد فیض بھی شامل تھے۔ یہ گھر گیا تھا ایک میس تھا۔ یہ لکچرار صاحبان لاہور کے کالجوں سے اچھے ڈویژن اور اچھے نمبروں سے نکلے تھے۔ فیض صاحب ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ یوں سمجھئے بس ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔

ان دنوں کے فیض بڑے چھیلے چھبیلے اور رنگ رنگیلے تھے۔ دبلے پتلے۔ لبوں پر مسکراہٹ ہر وقت کھیلتی رہتی۔ آنکھیں بھی مسکراتی ہوئی۔ پھر ان آنکھوں میں ہلکے ہلکے نشیلے سرخ ڈورے۔ گھنگریالے بال۔ رنگ اب سے زیادہ سپید۔ کپڑے اجلے ورق۔ قمیض کی آستین میں کف اور کف میں رومال۔

بظاہر جتنے شرمیلے تھے ، بے تکلف دوستوں کی محفل میں اتنے ہی کھل کھیلتے ۔ دل صاف شفاف۔
نہ کسی کی برائی کرتے اور نہ برائی سنتے ۔

موسیقی اور مصوّری سے شروع سے بڑا لگاؤ تھا ۔ رفیق غزنوی مرحوم کے دوست ان کی
موسیقی کی وجہ سے اور بالے سے مراسم ان کی مصوّری کی بناء پر ۔ اور یہ دونوں فیض کی حاضر
جوابیوں اور جملے بازیوں کی وجہ سے ان کے دوست ۔ اصلی نام مبارک حسین رضا ہے مگر احباب
اور اعزّہ پیار سے بالے کہتے تھے ۔

فیض صاحب ایم اے او کالج میں بڑے دھوم دھڑکّے سے آئے تھے ۔ ان کے آنے سے
پہلے کالج کھلنے کے سلسلے میں انجمن اسلامیہ کی طرف سے ایک قدِ آدم پوسٹر لگایا گیا تھا ۔ جس میں
پرنسپل اور اساتذہ کے نام اور ڈگریاں وغیرہ لکھی گئی تھیں ۔ اس میں فیض کا نامِ نامی بھی درج تھا
پروفیسر ایم ڈی تاثیر کو اس کالج کا پرنسپل بنایا گیا جو کیمبرج سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کرنے
والے پہلے ہندوستانی تھے ۔

جب میں نے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا تو فیض صاحب دوست ہونے کے علاوہ میرے
استاد بھی ہوگئے ۔ کچھ عرصے اس کالج کے نائب پرنسپل صاحبزادہ محمود الظفر بھی رہے جو مشہور ادیبہ
افسانہ نگار اور سوشلسٹ پارٹی کی مشہور کارکن ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر تھے ۔ رشید جہاں کا مطب
ہندو سبھا کالج کے قریب ڈھاب کھٹیکاں میں تھا ۔ قریب ہی ان کا مکان بھی تھا ۔ پھر وہ سول لائن
میں اُٹھ آئیں ۔ ڈاکٹر رشید جہاں جس شہر میں رہتیں ان کا مکان شہر کے دانشوروں ، ادیبوں ، شاعروں
اور فلمکاروں کا مرکز بن جاتا ۔ ایسی محفل ساز اور جانِ محفل اور اپنے سب دوست احباب اور ملنے
والوں سے بے غرض اور بے پناہ محبّت کرنے والی خاتون آج تک میری نظر سے نہیں گزری ۔ رشید
جہاں نے امرتسر کو لکھنؤ اور دکن بنا دیا تھا ۔ فیض صاحب کی فکری تربیت اور ان کے مزاج کی نرمی
میں رشید جہاں کی شخصیت کا بڑا حصّہ ہے ۔

امرتسر میں منٹو کا زمانہ آیا ۔ وہ مسلم اسکول میں پڑھتا تھا اور مجھ سے سینئر تھا ۔ اس اسکول
سے بے شمار ادیب نکلے منٹو ۔ سیف ۔ اے حمید ۔ اور یہ سب ہمارے اُردو فارسی کے استاد رانا مبارک
خاں ، سالک صہبائی مرحوم کے فیضِ صحبت کا اثر تھا ۔ منٹو انٹرنس پاس کرکے علی گڈھ چلا گیا ۔

اُسی زمانے میں غازی عبدالرحمٰن نے ایک روزنامہ مساوات نکالا جس میں باری علیگ اور حاجی لق لق کام کرتے تھے۔ اب نوجوانوں کے گروپ میں باری صاحب بھی شریک ہو گئے۔ جو ان کے بے تکلّف دوست بھی تھے اور استاد اور رہنما بھی۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ اور تیز ہو گیا۔

منٹو علی گڑھ چھوڑ کر امرتسر میں کوچۂ وکیلان والے اپنے گھر واپس آ گیا۔ اس کے دیوان خانے میں شہر کے اُبھرتے ہوئے اور نامور ادیبوں کی محفلیں جمنے لگیں۔ یہیں منٹو چھاپ کے نئے چونکا دینے والے مختصر افسانے لکھے جاتے تھے منٹو کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ عمدہ سفید اور بے داغ کاغذ پر پنسل سے لکھا کرتا تھا۔ لکھنا کیا تھا الفاظ کے خوبصورت موتی پرو تا تھا۔ تحریر میں بڑی روانی اور فکر پر اعتماد تھا اس لئے لکھ کر کبھی کاٹتا نہیں تھا۔ اسے اپنے لکھے ہوئے افسانے سنانے کا بہت شوق تھا۔ مجھ سے بڑا تھا، میں اس کا ادب کرتا تھا مگر جب بھی آتا ایک نشست میں دو چار افسانے ضرور سناتا تھا۔

اب منٹو نے ترجموں کا ڈول ڈالا۔ روسی اور فرانسیسی مختصر افسانوں کے بے شمار مجموعے اٹھا لایا، ان کی جلدیں توڑیں اور وہ افسانے اپنے دوستوں میں ترجمہ کرنے کے لئے بانٹ دیئے۔ آغا خلش کاشمیری مرحوم کے سامنے طویل منظوم افسانے رکھ کر فرمائش کی کہ ان کا منظوم ترجمہ کر دیں جو انھوں نے دو نشستوں میں کر ڈالا۔ منٹو فیض صاحب سے بڑا متاثر تھا۔ دونوں ہم عمر تھے لیکن منٹو کہا کرتا تھا فیض بہت پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ میرے افسانوں میں جو نیا پن اور گہرائی ہے وہی فیض کی شاعری میں ہے۔

فیض شہرت سے بھاگتے تھے مگر وقت قریب آ رہا تھا جب شہرت ان کے پیچھے بھاگے۔ وہ اپنے اور اپنے دوستوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھتے تھے۔ شاید اسی سے ان کی انفرادیت برقرار رہی۔ ویسے بھی فیض صاحب اگر گھل مل جاتے تو رہتے سب سے علیحدہ۔ کبھی دوسرے کے پھڈّے میں ٹانگ نہ اڑاتے۔ خود ان کا اپنا کوئی پھڈّا تھا نہیں۔ بعض لوگ ان کو ماسکو نظریات کا سوشلسٹ سمجھتے ہیں۔ یہ ان پر اور سوشلزم دونوں پر الزام ہے۔ آپ چلئے سوشلزم کی بات کیجئے، اسلام کی بات کیجئے وہ اختلاف نہیں کریں گے۔ صُلح کل آدمی ہیں۔ آپ ان کے خلاف ہزار اعتراض کیجئے مضامین لکھئے یا دوسری مخالف سرگرمیاں دکھائیے فیض صاحب پر کوئی اثر نہیں ہو گا اور ان کے پیار میں کوئی کمی نہیں آئے گی، محبّت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے

فیضؔ صاحب کی شاعری پر نکتہ چینی کی تو میں نے فیضؔ صاحب سے کہا آپ اس کا جواب کیوں نہیں دیتے تو بولے بھئی یہ ان کا اپنا خیال ہے اور ہر شخص کو اپنے خیال کے اظہار کا حق ہے یہ سب اُس زمانے کے امرتسر کا پس منظر تھا جس میں فیضؔ کی شخصیت اور شاعری پروان چڑھتی رہی فیضؔ صاحب کے عشق عاشقی کے قصے تو فیضؔ صاحب نے اتنا عشق نہیں کیا جتنا خود ان سے عشق کیا گیا ہے۔ عشق کے لیے تو اپنے خول سے نکلنا پڑتا ہے اور فیضؔ صاحب کو عشق سے زیادہ اپنا خول عزیز رہا ہے۔ وہ صرف شاعری ہی میں اپنے خول سے باہر نکلتے ہیں۔ اور یہ جو ان کا مصرع ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ

تو ہمیں تو اس "پہلی سی محبت" پہ بھی شبہ ہے۔ البتہ یہ یقین ہے کہ محبّت کی مانگ ان کی محبوبہ ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔

فیضؔ صاحب افلاطونی محبّت کے آدمی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبوبائیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ جہاں جبر آتا ہے وہاں ہر مظلوم ان کے محبوبوں کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ فیضؔ صاحب کی ساری زندگی کوچۂ یار سے سرِ دار تک کے سفر میں گزر گئی لیکن ہم نے فیضؔ کے یار کو فیضؔ ہی کے کوچے میں اپنے ہاتھ میں صلیب اٹھائے دیکھا ہے۔ جو کچھ ہوا سو ہوا، راستہ چلتا رہا اور مسافر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ البتہ ان کی شاعری میں وہ کچھ ہے جو ان کی شخصیت میں نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں ان کا عمل ہے۔ ان کی زبان ہے۔ ان کے افکار ہیں، اور ان کے ناکردہ گناہوں کی لذّت۔

اخترؔ شیرانی مرحوم ہفتے میں ایک آدھ بار امرتسر کا چکر ضرور لگایا کرتے تھے۔ یا تو بالے کے یہاں ٹھہرا کرتے یا شیراز ہوٹل میں یا میرے غریب خانے پر۔ شاعری کی جو نہج فیضؔ نے اختیار کی اس کی ابتدا اخترؔ نے کی تھی چنانچہ ہم اخترؔ شیرانی کے بعد کے تمام شاعروں کی شاعری میں ان ہی کا رنگ دیکھتے ہیں۔ اخترؔ کو ان کی رومانیت امرتسر کھینچ لائی۔ یہاں بھی ان کی سلمائیں موجود تھیں۔ جس خوبصورت لڑکی کو دیکھتے اُسے سلمیٰ بنا لیتے اور اس کا پیچھا کرتے اور جب وہ سامنے آتی تو شرما جاتے۔ امرتسر کے بارے میں انھوں نے کہا تھا

امرتسر اُس پری کا نشیمن ہے آج کل

ایک مرتبہ ان سے ملنے شیراز ہوٹل گیا تو دیکھا بہت آزردہ بیٹھے ہیں۔ پاؤں برف کے پانی کے ٹب میں ڈالے بیئر اور سگریٹ پی رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اداسی کا سبب پوچھا تو بولے دیکھو مجھے یہاں آئے چار دن ہو چکے ہیں، فیضؔ اور تاثیر کو اس کی اطلاع ہے مگر وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ میری شراب نوشی اور آوارگی کا مذاق اڑاتے اور مجھ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ تو ایک وہ بھی زمانہ تھا جب ہمارا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گذرا کرتا تھا اور پھر یہ فی البدیہہ شعر کہا ؎

کسی کو کیا خبر حالِ دلِ ناکام کیا ہوگا
میں اکثر غور کرتا ہوں مرا انجام کیا ہوگا

اختر شیرانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اختر شیرانی اصل میں فیضؔ اور تاثیر سے "پہلی سی محبت" مانگتے تھے۔ جو لوگ کام کاج سے لگ جاتے ہیں ان کے پاس پہلی سی محبت کے لئے وقت کہاں ہوتا ہے۔

فیضؔ اور تاثیر امرتسر میں لاہور کی مخصوص تہذیب کے نمائندے تھے۔ امرتسر تاجروں اور پہلوانوں کا شہر تھا۔ ویسے علامہ طغرائی مرحوم کے شاگردوں نے ایک وسیع ادبی حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ علاّمہ طغرائی اور ابوالکلام آزاد نے روزنامہ وکیل کے ذریعہ تاجروں اور پہلوانوں کے اس شہر میں سیاسی شعور اور ایک سوچنے والا حلقہ پیدا کر دیا تھا مگر لاہور کی علمی و ادبی چہل پہل یہاں کس طرح ہوتی فیضؔ اور تاثیر نے اپنے کالج کو علم و ادب کا مرکز بنایا۔ ان ہی کے ذریعے علمی ادبی رجحانات پھیلے۔ لاہور پطرس بخاری کی ادبی اقلیم تھی۔ تاثیر نے امرتسر میں اپنی ادبی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ فیضؔ دونوں کے نیاز مند تھے۔ تاثیر ماضی میں ڈوب رہے تھے، فیضؔ مستقبل میں ابھر رہے تھے۔

مجھے فیضؔ کے ساتھ بے شمار مرتبہ امرتسر کے مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایک تو ان کا حُسن، پھر اُن کا لباس، ان کے لہجے میں نرمی اور ٹھہراؤ۔ وہ اپنا کلام سناتے تو مجمع میں سناٹا ہو جاتا۔ نئے انداز کی شاعری انوکھے انداز کی ادائیگی۔ ایک صاحب نے پہلی مرتبہ فیضؔ کو دیکھ کر کہا یوں لگتا ہے کسی انگریز نے شلوار قمیص پہن لیا ہے۔ دوسرے صاحب نے فرمایا "اُردو شاعری کی یہ نئی اٹھان ہے۔"

شروع شروع میں فیض نے اپنے اشعار سنائے تو لوگ خاموش رہے اور اشعار ختم ہوئے تب بھی خاموش رہے۔ غزلوں کے ایسے اشعار پر تو انہیں داد مل جاتی تھی جو روایات کے مطابق ہوتے مگر بعض اشعار پر پرانے زمانے کے شعرا آپس میں اشارے کرتے لیکن نوجوانوں کی فیض پرستی دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔ پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے مشرقی ادب کے علاوہ مغربی ادبیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا وہ کہتے تھے فیض کی نظر روح عصر پر ہے اور ایک دن روح عصر پر اس کی مکمل گرفت ہو گی۔

فیض سے اکثر شام کے بعد کوچۂ عزیز الدین میں مجید وکیل مرحوم کے یہاں ملاقات ہوتی تھی۔ یہ مجید وکیل ڈپٹی عزیز الدین کے صاحبزادے تھے اور بچپن سے گانے بجانے کے شوقین۔ ان کی آواز بھی اچھی تھی۔ رفیق غزنوی جس کا ریڈیو اور فلم کی دنیا میں طوطی بول رہا تھا جب کبھی امرتسر آتا تو مجید وکیل کے یہاں ضرور آتا۔ یہاں میں، بالا اور فیض پہنچ جاتے۔ مختار بیگم کے استاد جرنیل عاشق علی خاں کو بلوا لیا جاتا اور یوں ساری ساری رات گانے بجانے میں گذر جاتی۔

ہمارے محلّے میں ایک صاحب خادم مصطفیٰ رہا کرتے تھے جو عمر میں فیض صاحب سے بڑے لیکن ان کے شاگرد تھے۔ انتہائی مسخرے اور حاضر جواب قسم کے آدمی۔ تفریح طبع کے لیے شعر کہتے اور مشاعروں میں پڑھا بھی کرتے تھے۔ کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا ہو جاتا تو اوپر کے اپنے دو نقلی دانت نکال کر کہتے یہ ابھی فٹ نہیں ہوئے ہیں۔ اپنا کلام فیض صاحب کو دکھاتے تو فیض کہتے اس میں کچھ ہو تو میں اصلاح دوں۔ اس پر خادم جواب دیتے اگر اس میں کچھ ہوتا تو میں آپ کے پاس کیوں لاتا۔ اگر آپ نے اصلاح نہ دی تو میں آپ کی کوئی غزل اپنے نام سے پڑھ دوں گا۔ یہ حضرت ڈاکٹر رشید جہاں کے یہاں بھی پہنچ جاتے جہاں محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے۔

فیض ہمارے محلّے حسین پورے سے اٹھ کر قریب کے ایک محلّے میں چلے گئے جو کمپنی باغ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ وہاں بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد پھر ہم بکھر گئے اور مدتوں سامنا نہیں ہوا۔

۱۹۴۸ء کا ایک دن تھا۔ میں امروز لاہور کے دفتر میں مولانا چراغ حسن حسرت کے کمرے میں بیٹھا مولانا سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک صاحب آئے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور پوچھا "کیسے ہو؟" جب وہ چلے گئے تو میں نے مولانا سے پوچھا یہ کون صاحب تھے؟ مولانا نے کہا "فیض"۔ میں نے جس فیض کو امرتسر میں آخری بار دیکھا وہ یہ فیض نہیں تھے۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

فیض بمبئی میں

(۱)

مسز کلثوم سایانی کی شخصیت بمبئی والوں کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہے ان کی ساری زندگی سماجی تعلیم کو عام کرنے اور عورتوں کی سماجی حالت کو سدھارنے میں گزری۔ انھوں نے تحریک آزادی میں ہندوستان کی صف اوّل کے لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا۔ وہ گاندھی جی کے نظریہ "ہندوستانی" کی پرجوش حامی ہیں اور ناگری کے ساتھ اردو رسم خط کو عام کرنے میں ان کے ہفتہ وار "رہبر" نے بڑا کام کیا۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں جب جمہوریۂ ہند کے لیے صدر اور نائب صدر کے چناؤ کا مسئلہ پیش آیا تو ہندوستان کی رائے عامہ کی طرف سے نائب صدر کے لیے جو چند نام تجویز ہوئے ان میں ایک مسز سایانی کا نام بھی تھا۔ ہندوستانی اخبارات نے بھی اس تجویز کی تائید کی اور بڑی سرخیوں کے ساتھ ان کے حالات اور ان کی تصویریں چھاپیں، ریڈیو سیلون کے دو ہردلعزیز فن کار حمید سایانی (مرحوم) اور امین سایانی انھیں کے صاحبزادے ہیں۔ وہ ہر مسئلے کو وقتی سیاست سے بلند ہوکر انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں صلح کل ان کا مسلک اور بلالحاظ مذہب و ملت سب کی خدمت ان کا مطمح نظر ہے۔

سنہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے کہ "ہندوستانی" کی اشاعت کی غرض سے ہندوستانی پرچار سبھا بمبئی کی طرف سے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کا قیام عمل میں آیا تھا، ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور میں ابھی ابھی اس میں ملازم ہوئے تھے۔ اور نئے جذبات اور نئی امنگوں کے ساتھ اس کے مقاصد کی اشاعت میں کوشاں تھے۔ مسز سایانی بھی سبھا کی مجلس عاملہ کی ایک سرگرم

ممبر تھیں اور ہم دونوں کے ساتھ ان کا سلوک بڑا مشفقانہ تھا وہ اکثر ادارے میں آتیں ہمارے پروگراموں کے بارے میں ہم کو مشورے دیتیں اور خود اپنے مسائل اور مشکلات کے بارے میں ہم سے مشورہ کرتی تھیں۔

ایک دن وہ سویرے ہی ہمارے دفتر میں تشریف لے آئیں اور کہنے لگیں بیٹے! میں ساجن بھائی پیر علی گرلز ہائی اسکول کے لیے بڑی پریشان ہوں' اس کی عمارت بوسیدہ ہے مالی حالت اچھی نہیں۔ اسٹاف بھی ضرورت سے کم ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے لیے کچھ کروں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ ہم دونوں نے فوراً مشورہ دیا کہ بمبئی میں فنڈ اکٹھا کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ آپ مشاعرہ یا قوالی کا پروگرام منعقد کریں'

اور پروگرام میں صاحب ثروت لوگوں کو بلا کر ان سے عطایا لیں اور یہ آپ جیسی با اثر ہستی کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ انھیں ہمارا مشورہ پسند آیا اور فوراً ایک خاکہ بھی تیار ہوگیا۔ سردار جعفری اور سلطانہ اُن کے اپنے بچے تھے' انھوں نے ان سے بھی مشورہ کیا سردار نے قوالی کے مقابلے میں مشاعرے کو ترجیح دی اور مشورہ دیا کہ اگر آپ پاکستان سے صرف ایک فیض کو بلا سکتی ہوں تو پھر سارے مسائل آپ سے آپ حل ہوجائیں گے۔ اور آپ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہیں گی۔

ان دنوں فیض کو ہندوستان بلانا جوئے شیر سے کچھ کم نہ تھا۔ سنہ ۶۵ء کی دوسری کشمیر جھڑپ نے دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت ہی کشیدہ کردیئے تھے۔ صلح نامہ تاشقند نے بھی دونوں کی خلیج پاٹنے میں کوئی خاص کردار ادا نہ کیا تھا' سرحدیں بند تھیں' رسل و رسائل بند تھے' اور لوگوں کا آنا جانا بند تھا۔ صرف دل کھلے تھے۔ مگر دلوں کی بات کون سنتا ہے۔ ایسے میں فیض کو ہندوستان آنے کی دعوت دی جائے کیونکر؟

لیکن مسز سایانی کے لیے یہ کام مشکل نہ تھا۔ پاکستان کے صدر ایوب ان کے دوست تھے اور ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا ان کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے فوراً ایک خط اپنے دوست کو اور دوسرا اپنی بیٹی کو لکھا۔ درخواست چھوٹی سی تھی۔ مگر درخواست کرنے والا بڑا۔ اور اس سے بھی بڑے وہ لوگ جو دیر و حرم کی پاسبانی کر رہے تھے۔ حرم کا دروازہ کھلا دیر میں

گھنٹے بجے اور ہر طرف شور مچ گیا فیض آ رہے ہیں، فیض آ رہے ہیں۔[1]

سردار کا مشورہ درست تھا۔ فیض کی آمد فیضان عام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان بھر سے ادیب اور شاعر کھنچ کھنچ کر بمبئی چلے آئے۔ صابر صدیق پولی ٹکنیک گراؤنڈ فیض کے پرستاروں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ سردار آئے، ناصر آئے، اعجاز آئے، وجد آئے، جاں نثار اختر آئے، مجروح آئے اور نہ جانے بمبئی اور بیرون بمبئی کے کتنے شاعر اور ادیب وہاں جمع ہو گئے۔ فضا خاموش تھی اور مجمع گوش بر آواز۔ مشاعرہ صدارتی تقریر سے شروع ہوا۔ اناؤنسر کے فرائض وجد نے انجام دیے۔ ایک کے بعد ایک شاعر آتا اور اپنے نوائے سرمدی سے مجمع کو مسحور کر جاتا تھا، یہاں تک کہ جب رات کافی گزر چکی اور راستے سنسان ہو گئے تو فیض کا نام پکارا گیا اور لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر سراپا گوش ہو کر بیٹھ گئے۔

فیض مائیک پر آئے، مختصر الفاظ میں اپنے ہندوستان آنے اور دوستوں سے مل کر خوش ہونے کا تذکرہ کیا اور فرمائشی کلام سنانے لگے:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا

---

[1] اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ فیض کو پہلا دعوت نامہ ملا اور انھوں نے ہندوستان جانے کی اجازت طلب کی تو حکومت وقت نے انکار کر دیا جس پر فیض نے مسز سایانی کو مطلع کر دیا اور معذرت چاہ لی۔ مسز سایانی نے اس کے بعد مسز اندرا گاندھی سے رابطہ قائم کیا اور انھوں نے "ہاٹ لائن" پر ایوب خاں صاحب سے فرمائش کی کہ فیض کو ہندوستان بھیجا جائے۔ ایک رات کوئی گیارہ بجے اس وقت کے کمشنر نے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ آپ فوراً ایئرپورٹ پہنچ جائیں آپ کو بمبئی جانا ہے۔ فیض نے کہا میرے پاس نہ تو ویزا ہے نہ پی فارم اور نہ ٹکٹ۔ کمشنر نے جواب دیا آپ کوئی فکر نہ کریں ایئرپورٹ پر سب کچھ مل جائے گا۔ چنانچہ فیض چلے گئے۔ نہ صرف بمبئی گئے بلکہ بمبئی سے مخدوم محی الدین کسی ویزا وغیرہ کے بغیر حیدرآباد دکن لے گئے۔ جہاں ایک زبردست مشاعرہ کیا گیا جس کے متعلق فیض کہتے ہیں "شعر سننے سنانے کا جو لطف حیدرآباد میں آیا کہیں اور نہیں آیا"۔ م ط ح

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھادو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

جونہی فیض نے اپنی نظم ختم کی ہر طرف شور ہوا "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" پھر فضا فیض کی مدھم آواز سے گونجی:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

فیض جس قدر سناتے تھے فرمائشیں اتنی ہی بڑھتی جاتی تھیں یہاں تک کہ رات کے دو بج گئے۔ مائیک کے استعمال پر پابندی تھی چار و ناچار مشاعرہ ختم کرنا پڑا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ لیکن مشاعرے کی گرمی اور فیض کی خوشی میں لوگ یہ بھی بھول چکے تھے کہ جاڑے کی راتیں ہیں اور وہ ایک خوش گوار یاد اپنے دلوں میں لے کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔

ہمارے ایک دوست افسر امروہوی بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نظام الدین گوریکر کی نگرانی میں فیض پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ فیض کا بمبئی آنا ان کے لیے ایک بن مانگے کی نعمت ثابت ہوا، انھوں نے فوراً فیض سے رابطہ قائم کر لیا اور وقتاً فوقتاً اپنے مسائل لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ فیض کا دروازہ ان کے لیے ہر وقت کھلا تھا۔

افسر بمبئی کے مشہور جعفر سلیمان ہوسٹل میں رہتے تھے۔ وہاں جو لوگ بھی قیام پذیر تھے وہ افسر ہی کی طرح پوسٹ گریجویٹ طلباء تھے۔ بمبئی میں فیض کی آمد اور مشاعرے کی کامیابی کا ہر طرف چرچا تھا، ہوسٹل کے طلبہ اور منتظمین کو بھی خواہش ہوئی کہ فیض کی موجودگی سے فایدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ افسر کو بیچ میں ڈالا گیا۔ فیض اپنے دوستوں اور چاہنے والوں سے ملنے کے لیے ہوسٹل آنے پر تیار ہو گئے۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے ہوسٹل میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اُن کی آمد کی خبر سن کر ہوسٹل کے طلبہ کے علاوہ باہر کے بھی بہت سے شاعر اور ادیب وہاں جمع ہو گئے۔ جن میں باقر مہدی، ندا فاضلی، بشر نواز، احمد انصاری اور محمود چھاپڑا وغیرہ پیش پیش تھے۔

ان دنوں بمبئی میں جدید ادب اور جدید شاعری کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ باقر مہدی اور ندا فاضلی اس کے علمبردار تھے، اور جہاں یہ دونوں پہنچ جاتے وہاں زیادہ تر جدید شاعری اور جدید ادب کی بحث چل پڑتی تھی۔ اس نشست میں بھی یہی ہوا باقر مہدی اور ندا فاضلی نے اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا وہ اکثر فیض کے جواب کا انتظار بھی نہ کرتے تھے۔ بلکہ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی جواب بھی دے لیتے تھے۔ اس طرح بارہ بج گئے۔ فیض کو بھی جانا تھا۔ ہوسٹل کے نگراں جناب اشتیاق نے شکریہ ادا کیا۔ گروپ فوٹو لیے گئے اور محفل برخاست ہو گئی۔

ہم لوگوں نے اسی وقت فیض سے مل کر انھیں مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر آنے کی دعوت دے دی تھی انھوں نے اس کو بخوشی منظور بھی کر لیا اور دوسرے دن صبح دس بجے کا وقت مقرر ہو گیا۔

(۳)

وقت بہت کم تھا، ہمیں فیض کے چاہنے والے تمام دوستوں کو جمع کرنے کا پورا موقع نہ ملا۔ پھر بھی ٹیلی فون اور دوسرے ذرائع سے جتنے دوستوں کو ہم جمع کر سکتے تھے ہم نے جمع کیے۔ چونکہ ہمارا ادارہ ادبی اور سماجی سے زیادہ تعلیمی تھا اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو ہندی کی اشاعت کے لیے قائم کیا گیا تھا اس لیے ان دوستوں میں زیادہ

تعداد کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ کی تھی۔ چنانچہ حمیدہ اختر، مہر محمد خاں شہاب، ڈاکٹر عالی جعفری ڈاکٹر میمونہ دہلوی، ڈاکٹر نورالسعید اختر، ڈاکٹر اختر حسین، ڈاکٹر نائک، پروفیسر احمد انصاری پروفیسر فقیر محمد کلے، پروفیسر داؤد کاشمیری زین العابدین، عابد راج اور ایسے مختلف تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے بہت سارے دوست جمع ہو گئے تھے۔ اساتذہ و طلبہ کے علاوہ بعض مقامی اخبارات کے نامہ نگار بھی ہماری دعوت پر تشریف لے آئے تھے۔

ان دوستوں نے فیض کو ایک ہر دلعزیز شاعر اور ادیب کے علاوہ ایک مشہور کالج کے پرنسپل کے روپ میں دیکھا، اس لیے ان کے سوالات بھی زیادہ تر معیار تعلیم، ذریعۂ تعلیم، طلبہ کی بے چینی اور پاکستان میں اردو اور بنگلہ کی رسہ کشی سے متعلق تھے۔ یہ سارے سوالات سرتاسر تعلیمی اور لسانی تھے اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ فیض کے سامنے رکھے گئے۔ فیض نے بھی اپنی ٹھنڈی آواز میں بڑے سلجھے ہوئے طریقے پر ایک ایک سوال کا جواب دیا۔ وہ تعلیم کے ناقص نظام اور اس کے گرتے ہوئے معیار پر متاسف تو ضرور تھے۔ مگر طلبہ کے شاندار مستقبل پر انھیں پورا یقین تھا۔ اردو بنگلہ تعلقات کے بارے میں بھی وہ پُرامید تھے، ان کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ زخم بھر جائیں گے اور دونوں زبانوں کو پاکستان میں پھلنے پھولنے کا پورا پورا موقع ملے گا۔

ایک دوست نے تعلیمات سے ہٹ کر ان شعرا کا نام اُن سے پوچھ لیا جن سے وہ متاثر تھے۔ فیض نے بلا جھجک حافظ، غالب اور اقبال کا نام لے دیا۔ اور پھر انھوں نے اپنی چند مشہور نظموں کے بعض خاص خاص شعر سنا کر بتایا کہ ان میں حافظ کا خیال، غالب کی ترکیبیں اور اقبال کا جذبہ کس طرح بول رہا ہے۔

وقت ختم ہونے کو آیا تھا۔ ایک دوست نے درخواست کی کہ اس یادگار نشست کا خاتمہ فیض صاحب کی کسی یادگار نظم پر ہونا چاہیے۔ فیض نے بخوشی اس کو منظور کر لیا۔

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے	تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب	وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا	وہ بات اس کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے — عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری — قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

یہ خوش گوار نشست ٹھیک ایک بجے ختم ہوئی، ہم نے ان سے نہ بھولنے کا وعدہ لیا۔ اور حمیدہ اختر انھیں اپنی کار میں لے گئیں۔

(۴)

فیض درمیان میں دو دن کے لیے دلی چلے گئے۔ واپس ہوئے تو فلمی دنیا والوں نے انھیں گھیرا۔ اور رات کے دس بجے انڈین مرچنٹس چیمبر کے خوبصورت ایرکنڈیشنڈ ہال میں ایک مخصوص اور چھوٹی سی شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ فلمی دنیا کے بہت سے جگمگاتے ستارے وہاں موجود تھے۔ فلمی دنیا کے علاوہ بھی قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، جاں نثار اختر جیسے نہ معلوم کتنے اور نامور ادیب اور شاعر وہاں جمع ہو گئے تھے سردار جعفری نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ مینا کماری سردار اور فیض کے بیچ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ خاموش، چپ چاپ، حاضرین کی نظریں یا تو فیض کی طرف اٹھتیں یا مینا کماری کی طرف، ایک طرف ادب تھا، دوسری طرف حسن، دونوں کی موجودگی نے محفل کو بے حد دل کش بنا دیا تھا۔

سردار نے اپنی مختصر سی تعارفی تقریر کے بعد مشاعرے کا آغاز کیا اور شعرا اپنا کلام سنانے لگے۔ باری باری شہ نشیں پر شاعر آتے اور اپنی پسندیدہ نظم سنا جاتے تھے۔ نظمیں تو سب کی اچھی تھیں لیکن جاں نثار اختر کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ جب انھوں نے اپنی پسندیدہ نظم "سایے" اپنے مخصوص والہانہ انداز میں سنانا شروع کیا تو ایک سماں سا بندھ گیا۔

جب سارے شعرا سنا چکے تو سردار نے فیض سے درخواست کی کہ حاضرین اب آپ کو سننے کے لیے بے چین ہیں انھیں اور انتظار میں رکھنا اچھا نہیں۔ اسٹیج بلند تھا اور مجلس مختصر، فیض نے بیٹھ کر ہی اپنی مخصوص آواز میں اپنا کلام سنانا شروع کیا۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے — وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں | تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن | دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا | تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ | مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

آخری شعر پر مینا کماری کا سکوت ٹوٹا۔ لب ہلے، گلاب اور سرخ ہو گیا۔

(۵)

فیضؔ کو ہندوستان بلانے کا سہرا مسز سایانی کے سر تھا اسی لیے اپنے دورانِ قیام میں فیضؔ جہاں بھی رہے گویا انھیں کے مہمان رہے۔ جب ان کا یہ مختصر علمی ادبی دورہ ختم ہونے کو آیا۔ تو اس کا حسنِ اختتام بھی مسز سایانی ہی کے ہاتھوں ہوا۔ انھوں نے اپنے کھیالاہل کے صاف ستھرے، وسیع و عریض اور ہوادار مکان میں ایک چھوٹی سی الوداعی تقریب منعقد کی۔ اس میں شہر کے اکثر عمائدین مدعو تھے، ان میں سیاسی لیڈر بھی تھے۔ سماجی کارکن بھی، نامور ادیب بھی تھے اور مشہور شاعر بھی، یونیورسٹی کے طلبا بھی تھے اور ریڈیو آرٹسٹ بھی۔ اور کچھ فیضؔ کے ساتھ دلی سے آئے ہوئے حسین مہمان بھی۔

لیکن وہاں نہ کوئی مشاعرہ ہوا اور نہ کوئی ادبی محفل سجائی گئی۔ شام کا وقت تھا کھانے پینے کی چیزیں بے شمار تھیں، اور سب کو ایک دوسرے سے خود ہی متعارف ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ سب کھا پی رہے تھے اور آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے گھل مل رہے تھے۔ وہاں فیضؔ کو کسی نے اپنا کلام سنانے کے لیے پریشان کیا، نہ آٹوگراف لینے کے لیے۔ سب بے پیے ہی مست تھے اور جھوم رہے تھے۔ انھیں یہ احساس تو تھا کہ وہ فیضؔ کے قریب ہیں اور بہت ہی قریب لیکن انھیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ اُن سے جلد ہی دور بہت دور ہو جائیں گے۔

فیضؔ کو بمبئی کا سفر کیے آج سات سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ اس درمیان میں کتنے طوفان آئے کتنی آندھیاں چلیں، برصغیر کا نقشہ ہی بدل گیا لیکن وہ نقش نہ بدل سکا جو فیضؔ کی اس آمد سے ہمارے دلوں پر بیٹھا۔ ان کے قدم کی برکت سے

ساجن بھائی مہر علی گرلز ہائی اسکول کی بوسیدہ عمارت اب ایک شاندار عمارت کا روپ دھار چکی ہے۔ جعفر سلیمانی ہوسٹل، ذاکر ہوسٹل کے نام سے ایک نئی منزل میں قدم رکھ چکا ہے اور مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر اردو، ہندی، اسلامک کلچر اور لنگوسٹک کے لیے مہاراشٹرا کا ایک مثالی ادارہ بن چکا ہے۔ لیکن مسز سایانی جن کی وجہ سے فیض بمبئی آئے، اور ان اداروں کو نیا روپ، نئی زندگی ملی آج بہت مغموم ہیں، بہت اداس ہیں۔ ان کا لائق بیٹا "حمید سایانی" ان سے جدا ہو گیا ہے، وہ روتی ہیں اور کہتی ہیں "میں اکہتر سال کی بڑھیا یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ ہوں، لیکن میرا اڑتالیس سال کا لخت جگر مجھ سے چھن گیا ہے۔ اے خدا میں کیا کروں"

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

سلیم تمنائی

فیض بنگلور میں

ڈاکٹر اقبال کے بعد جناب فیض احمد فیض ہی کی ایک خوش قسمت ہستی ایسی ہے جن کے جیتے جی انہیں جانا پہچانا گیا۔ ان کی عزت ہوئی۔ چاہے ترقی پسند ہوں یا جدیدیت کے علمبردار، ادب برائے ادب کے دلدادہ ہوں یا ادب برائے زندگی کے، ہر مسلک کے لوگوں نے آپ کو پسند کیا اور ہر مجلس میں آپ کا ذکر خیر ہوا۔ سب نے آپ کا کلام پڑھا، پسند کیا اور سر دھنا۔ ایسی مقبولیت بہت کم شعراء ادبا کو نصیب ہوئی۔ اور آپ کی شہرت برصغیر ہند و پاک کی چار دیواری میں ہی نہیں رہی بلکہ خوشبو کی طرح دور دیس بھی جا پہنچی۔

جناب فیض سے فیض اٹھانے کے کئی مواقع ان کے بھارتی دوست و احباب کو ملے اور آپ کی آمد شمال تک ہی ہوتی تھی۔ جنوب اکثر اس سے محروم رہا۔ لیکن ماہ مئی ۱۹۷۰ء ہمارے لئے چاند کا ہی نہیں چودھویں رات کا مہینہ ثابت ہوا، ہمارے لئے یہ ماہ بارہ مہینوں میں سے ایک نہیں بلکہ مہتاب تھا۔

مئی کے آخری ہفتے میں فیض صاحب بھارت آئے اور ۲ جون ۱۹۷۰ء کو نیشنل بک ٹرسٹ کی جانب سے منعقد کئے گئے رائٹرس کیمپ میں شرکت کے لئے شری کرتار سنگھ دگل کے ساتھ سلطان ٹیپو کی بستی تشریف لائے۔ میسور کے اردو دان آپ کی آمد کی خبر سے پھولے نہ سمائے۔ کچھ ہی دن پہلے ننّے بھائی (سجاد ظہیر) ایسے میں اگر چھم سے کوئی آئے تو کیا ہو، کے مصداق غیر متوقع چلے آئے تھے۔ ان کی آمد کی خوشی میں ایک مشاعرہ ہو گیا تھا۔ ان کا کلام بھی سنا

اور تقریر بھی۔ مرحوم کو کافی مخلص پایا۔ صرف چند خواص کے ہو کر نہ رہے جیسا کہ اکثر دانشور قسم کے مہمانوں اور شہرت یافتہ شعراء۔ ادباء کا خاصہ ہوتا ہے بلکہ ہر ایک سے کھُل کر ملے۔

سخن فہم حضرات نے سوچا کہ ایک عام اجلاس طلب کیا جائے اور اس میں فیضؔ صاحب کو شرکت کی دعوت دی جائے۔ مگر پتا چلا کہ وقت بندھا بندھایا ہے۔ اور فرصت کے لمحات و اوقات میں آپ کے چند عقیدت مند آپ سے قریب بلکہ قریب تر رہنا چاہتے ہیں۔ یار لوگوں نے انہیں خود غرض ہی سمجھا۔ وہ اہلِ دماغ ضرور تھے مگر اہلِ دل ہرگز نہیں تھے کیونکہ اہلِ دل کے ہاں رزاقی زیادہ اور بخیلی بالکل نہیں ہوتی ہے۔ ان کے دل میں کائنات بستی ہے۔ وہ دوسروں کی خوشی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسروں کی خوشی سے خوش ہونا چھوٹی نہیں بہت بڑی بات ہے۔

۲ ر جون ۱۹۷۰ء کو میری عزیز بہن نیلو فر رشید نے حقیقت کو خواب سمجھ کر جب یہ کہا کہ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت جو آپ کو اتنے قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا" تو فیضؔ صاحب نے پدرانہ شفقت سے انہیں سینے سے لگا لیا۔ اس شفقت و پیار سے فائدہ اٹھا کر اپنی والدہ محترمہ پروفیسر حبیب النساء بیگم کی جانب سے ۳ ر جون گیارہ بجے صبح ان کے گھر وا پیار امیں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی۔ فیض صاحب نے آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت کا خاص خیال رکھتے ہوئے دُوگل صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ ہم تو ان کے ہاتھوں میں ہیں' مہربان۔ سارا پروگرام طے شدہ تھا، مشکل سے وقت نکالا گیا، مہربان میزبان نے یہ طے کیا کہ فیضؔ صاحب گیارہ بجے سے دوپہر کے تین بجے تک گھوم پھر سکتے ہیں۔

مشہور قومی وسماجی کارکن بھائی محمد اسحاق صاحب اہلِ ذوق حضرات کا ایک اجلاس بلوانا چاہتے تھے مگر تنگیٔ وقت نے اس کا موقعہ نہ دیا۔ چند مشہور شعراء وادباء۔ اور اہلِ ذوق نے یہ منصوبہ بنایا کہ راستے میں چند منٹ کے لئے آپ کی کار رکوا کر فیض صاحب کی گل پوشی کی جائے اور آپ کی دید کی مشتاق پبلک سے انہیں ملایا جائے۔ یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہوسکا تو ریاست کے معروف شاعر حضرت ضمیرؔ عاقل شاہی مصنف "لالہ وصحرا" نے ایک قطعہ فی البدیہہ کہہ کر جناب اسحاق کے ہاتھوں تھما دیا کہ حضرت فیضؔ کے ہاتھوں پہنچ جائے۔

ترجمانِ دلِ حسرت زدگاں ہے یہ ضمیرؔ   یہ الگ بات کہ کچھ بات بنی یا نہ بنی

خوش تھے آنے کی خبر سن کے مریض — اف کہ دیدارِ مسیحا نہ ہوا
ٹھیک ہے عشق کی دنیا میں کبھی — وصل شرمندۂ معنی نہ ہوا

اس سے مقصود یہ تھا کہ فیض صاحب اپنے چاہنے والوں سے مل لیں اور
اُن پہ بن جاتے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اللہ اللہ عقیدت و محبّت بھی انسان سے کیا کچھ کرواتی ہے۔ فیض صاحب طے شدہ پروگرام کے ہاتھوں مجبور تھے اور راقم اور اسحاق صاحب سے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ان کا یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ دیگر احباب سے نہ ملنے کا انہیں دکھ ہے۔ پھر کبھی آنا ہوا تو ضرور مل لیں گے۔

۳ جون ۱۹۷۰ء صبح صبح فیض صاحب کو ایک اہم اجلاس سے خطاب کرنا تھا۔ جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے شعراء اور ادباء موجود تھے۔ فیض صاحب نے ادیبوں کی ذمہ داریوں اور فرائض کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔ کچھ اہم باتیں نیلو فر رشید کے ایک تاثر سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں۔

فیض صاحب کی زبانِ فیض نے کہا۔

ویسے تو اس موضوع پر بڑے بڑے عالموں نے بہت کچھ کہا ہے اور میرے لئے کوئی نئی بات کہنے کی شاید ہی رہ گئی ہو، بہر یہ ہم اس وقت میں ان نظریات کو پیش کروں گا جن سے میں متفق ہوں۔

دنیا کے تمام ادیبوں اور شاعروں کو چاہے وہ کسی بھی علاقے کے ہوں چند عام بنیادی مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غریبی و امیری کا مسئلہ ہے، سیاسی اختلاف ہوں یا طبقاتی کشمکش اچھے لوگوں اور قوم کے ہمدردوں کا رجحان ایک سا ہوتا ہے۔ ادیب و شاعر اپنے احساسات کا اظہار اس طرح کر سکتے ہیں کہ دوسرے ان احساسات میں شریک ہو سکیں۔ لیکن عام لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔ اس حیثیت سے ادیب یا شاعر دوسرے سے مختلف ہے۔

ادب کا کچھ مقصد بھی ہوتا ہے۔ صرف لکھنے کی خاطر تو ادیب و شاعر نہیں لکھتے۔ پڑھنے والا بھی تو کوئی چاہیئے۔ اس لئے ادب تخلیق کرتے وقت قاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ

ہی ادیب کے اپنے احساسات کا مکمل اظہار بھی ہونا چاہیئے۔

اگر ادیب حقیقت پسند ہو تو وہ اپنے فطری جذبات و خیالات کو ادب میں پیش کرے گا۔ اس کے خیالات کا محرک اس کا ماحول ہوگا اور چونکہ قاری کا ماحول بھی کم و بیش وہی ہوگا جو ادیب کا ہے اس لئے اس کے دل پر شاعر یا ادیب کے نظریات و خیالات بڑا گہرا اثر ڈالیں گے۔ کبھی قاری ادب کے ذریعے اپنے دردِ دل کی دوا بھی پا سکتا ہے۔ کبھی اسے محض اپنا ایک ہمدرد پالیتا ہے، یا کم از کم اپنے اردگرد کی دنیا کی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے۔ بہرحال ہر طرح سے یہ بہتر ہے کہ ادب زندگی سے قریب تر ہو۔

ہمارا پرانا ادب بے شک ایسا نہ ہوگا۔ ہماری روایات یقیناً عمدہ ہیں لیکن آج کا ادب بالکل ویسا ہی نہ ہونا چاہیئے۔ اب ہمارا مزاج بدل چکا ہے۔ ہمارے حالات دوسرے ہیں۔ اس لئے ہمارے ادب کو بھی کچھ مختلف ہونا چاہیئے۔ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ ہمارا ادب یکسر بدل جائے۔ سراپا نئی چیز بن جائے اور جس کا قدامت سے کہیں کبھی کوئی تعلق نہ ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان پرانی روایتوں کو بنیاد بنا کر ایک نئی عمارت بنانی چاہیئے جو بالکل ہمارے موجودہ مزاج کے مطابق ہو۔ اور اس کی پختگی کا باعث ہمارے آزماتے ہوتے تجربے ہی ہوں۔ ہمارا قدیم ادب بے مثال اور کلاسکی ادب ہے لیکن وہ اپنے زمانے کی اقدار اور معیار کے مطابق تھا۔ انگریزوں کے یہاں دورانِ قیام میں ہمارے کلچر اور رہن سہن کا طریقہ بدلنے لگا تھا۔ ہم ان سے اتنے متاثر ہوتے کہ ہم نے اپنی تہذیب کی تمام اچھائیاں انگریزوں کی تہذیب پر قربان کردیں۔ ان کی تہذیب سے بھی ہم نے کوئی خاص مفید چیز نہیں لی۔ اس طرح ہمارے کلچر کے نام سے جو بھی ہمارے پاس رہ گیا ہے اس میں نہ ہماری اپنی تہذیب کا کچھ اعلےٰ حصّہ ہے نہ انگریزوں کی تہذیب کی کوئی اچھی خصوصیت۔ آزادی کے بعد دونوں ملک (پاک و ہند) اپنی تہذیب کی جڑیں مضبوط کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اور اپنا ناتا پھر اسی قدیم تہذیب سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن زمانے کا تقاضا ہمیں اس تہذیب کا ہم آہنگ نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ اب وہ پرانے دن واپس نہیں آسکتے۔ اس لئے ہماری آواز اور ہمارا ادب، ہمارے زمانے کے مطابق ہی ہو۔ یہ ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔

انگریزوں کے زمانے میں جو ادب پیش ہوا، اس ادب اور آج کے ادب کے درمیان کم وقت

گزرا ہے۔ لیکن ایک عام انسان کا ماحول بہت بدل گیا ہے۔ ایک ادیب جو اپنے ملک کے عوام کی آواز ہے انگریزوں کے زمانے میں مادی تکلیفوں کا شکار تھا جیسے بھوک، افلاس وغیرہ۔ ایک قسم کا جمود سا طاری تھا۔ آج کا ادیب جذباتی طور پر مضطرب اور غیر مطمئن ہے۔ حالانکہ ایک حد تک اس کی مادی مشکلیں دور ہو گئی ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ عوام ادیب کے نظریات سے متفق ہوں یا سماج اس کے موافق ہو۔ لیکن ادیب کے قلم میں یہ اثر ضرور ہے کہ وہ لوگوں کو، اپنے معاصرین کو اپنا ہم خیال بنا سکتا ہے۔ وہ لوگوں کو نیک اور صحیح راستے پر چلنے کی تلقین کر سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر ملک پست حالت میں ہے تو اس کی ذمہ داری ادیب پر نہیں آسکتی کیونکہ سماج کو مکمل آزادی ہوتی ہے کہ وہ ادیب کی بات مانے یا نہ مانے

کوئی آدھ گھنٹے کی اس تقریر کے بعد مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے ہندوستان اور خصوصاً پاکستان کے تعلق سے کئی سوالات کئے۔ جن کے فیض صاحب نے مختصر اور جامع جوابات دیئے۔ یہ نشست بہ حسن وخوبی ختم ہوئی تو طے شدہ پروگرام کے مطابق رشید صاحب اور نیلوفر فیض صاحب کے ساتھ عازم سرنگا پٹم ہوئے۔

نیلوفر رشید صد درجہ خوش تھی۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ان سے دو چار باتیں پوچھ لیں۔ وہ ہر سوال کا جواب اس طرح دیتے تھے مانو ایک استاد، شاگرد کو سمجھا رہا ہو اور یہ سمجھانا ایسا تھا کہ ایک ایک بات پلّے پڑتی تھی اور دل ودماغ بڑی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔

رشید صاحب نے پوچھا "فیض صاحب! آپ کا آزاد شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے، آپ نے کیوں نہیں کی ہے"

فیض صاحب نے فرمایا "میں نے آزاد شاعری نہیں کی لیکن میں اسے برا بھی نہیں سمجھتا۔ یہ تجرباتی دور سے گزر رہی ہے ممکن ہے آگے چل کر مفید ثابت ہو۔ اسے آگے بڑھنے کا موقع دینا چاہیئے"

یہ مثلث گنبد سلطانی کے دائرے یا احاطے میں تھا، سلطان ٹیپو کے مزار کے قریب۔ کبھی علامہ اقبال نے ڈھائی گھنٹے یہاں مراقبہ فرمایا تھا۔ اور یہ شعر بھی:۔

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مردان جان سپردن زندگیست

فیضؔ صاحب اقبالؔ ہی کی طرح متاثر نظر آرہے تھے۔ پوچھا "سلطان کے تعلق سے ہندو بھائیوں کے تاثرات کیا ہیں؟ کہیں اورنگ زیب اور ایسے ہی دوسرے مسلمان بادشاہوں کی طرح سلطان ٹیپو کو بُرا تو نہیں سمجھتے؟"

نیلوفر نے سلطان کی رواداری کے تاریخی قصے سنائے سلطان نے مندروں کو مالا مال کیا۔ سلطان کے بخشے ہوئے زرخیز کھیت اور سونے چاندی کے برتن آج بھی موجود ہیں۔ (۱) بلاناغہ ہر دن اور خصوصاً عرس شریف میں ہزاروں عقیدت مند (ہندو مسلم) زیارت کے لئے آتے ہیں۔ سلطان کی اس رواداری اور نیک سلوک نے سلطان کے بعد راجاؤں کو بھی روادار بنایا۔ اور ہندو بھائیوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ اقلیت کے ساتھ پیار و محبّت کا سلوک کیا جائے۔ (۲) وہ سلطان کو شیرِ میسور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

فیضؔ صاحب بے حد متاثر نظر آرہے تھے، فرمایا۔ میں یہاں بہت متاثر ہوا ہوں؛

نیلوفر نے مجھے بتایا عقیدت مندوں کی طرح فیضؔ صاحب نے وہاں رکھے ہوئے گولک میں نذر و نیاز کی طرح کچھ پیسے بھی بطور نذر ڈالے۔

سلطان ٹیپو بھلے ہی سلطان ہوں، بادشاہ ہوں۔ (جو تاریخی حقیقت بھی ہے،) وہ صوفی اور شہید بھی ہیں۔ تاریخ اس بات کی ضامن ہے۔ صوفی کی نظر کائنات صفت ہوتی ہے، اس کا دل اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں بلاتفریق مذہب و ملت ہر کوئی رچ بس جاتا ہے۔ جان لینا

---

(۱) راقم نے اپنے مضمون قومی یکجہتی اور دکن دیس "اور حیدرآباد دکن سے نشر ہونے والے اپنے ایک انٹرویو میں، اس رواداری کی تفصیل بتائی ہے۔ پھر ننجنگڈھ مندر کے بڑے پجاری کا راقم نے جو کنڑی زبان میں انٹرویو لیا تھا اس میں انہوں نے کھیت، قیمتی پتھر (سبز رنگ کے لنگ،) کے علاوہ ہیروں کے اس ہار کا بھی ذکر کیا جسے سلطان ٹیپو نے اس مندر کو دیا تھا اور جس کی قیمت کوئی بائیس لاکھ روپے ہوتی ہے وہ جو آج بھی موجود ہے۔ (۲) جنوبی ہند میں کچھ گڑبڑ یا فساد ہوا بھی ہے تو اس کے پیچھے شمالی ہند کا ہاتھ رہا ہے۔ کچھ فرقہ پرستوں نے مذہب کے نام پر غلط افواہیں پھیلا کر اپنا الّو سیدھا کرنا چاہا ہے۔ ورنہ آج بھی شمال کے مقابلے میں جنوب امن و امان کا گہوارہ ہے۔

آسان دینا مشکل ہے۔ پھر کسی نیک کار کے لئے شہید ہونا، دلوں میں بسنے اور اونچے سے اونچا مرتبہ پانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد فیض صاحب کو گنبدِ شاہی سے دریائے کاوری کے سنگم پر لے جایا گیا۔

فرمایا، میں نے دنیا کے اس سے بھی زیادہ حسین مناظر دیکھے ہیں لیکن جو روحانی مسرت و فرحت گنبدِ سلطانی میں ملی اس کی بات ہی الگ ہے۔

نیلوفر نے فیض صاحب سے پوچھا کہ شہر میسور کیسا ہے؟ یہ سوال میں نے بہتوں سے کیا ہے۔ ہر ایک نے اس کی صفائی، ستھرائی اور خوبصورتی کی تعریف ہی کی تھی۔ آپ بتائیں آپ کی کیا رائے ہے۔ فیض صاحب نے جواب دیا۔

"آپ تو مجھے شاہراہوں پر لئے گھوم رہی ہیں۔"

اس حقیقت پر نیلوفر ہنس پڑیں۔ یہ ریمارک ایک دردمند دل کا ریمارک تھا۔ جو غریب کو جانتا اور غریب کو پہچانتا ہے۔ میسور اس سے کب الگ تھا۔

صبح گیارہ بجے سے پہلے ہی ہم پروفیسر حبیب النساء بیگم صدر شعبہ تحقیق (اردو) کے دولتکدے پر حاضر تھے۔ مہربان پروفیسر صاحبہ نے شکایت فرمائی کہ غالب خستہ حال کو کہاں کہاں ڈھونڈیں۔ پروفیسر نذیر احمد رکن سینٹ، اور سنڈیکیٹ، پرنسپل ایوننگ کالج میسور یونیورسٹی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، میں نے کہا اگر آج میں یہاں نہ آتا تو شاید خود کو معاف نہ کرتا۔

فیض صاحب تشریف لائے، تعارف کی رسم ادا ہوئی پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر محمد حنیف صاحب کلیمؔ، جناب سراج الحسن ادیبؔ ریڈر مہاراجہ کالج میسور، جناب عبدالقادر صاحب صدر شعبۂ اردو سینٹ فلومیناس کالج، جناب آغا سرؔش لکچرر مہارانی کالج، جناب اطہر جاوید، لکچرر دشکیشورن یونیورسٹی تریتی آندھرا، جناب محمد اسحاق صاحب قومی و سماجی کارکن، جناب محمد مشتاق احمد لکچرر، مہاراجہ کالج اور سلیم تمنائی نے فیض صاحب کا خیر مقدم کیا۔ اور ایک انجانی خوشی کا فیض اٹھایا۔ اور جیسے ہی احباب نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی ایک لکچرر صاحب نے ایک ذہین طالب علم کی طرح تابڑ توڑ سوالات کرنے شروع کردیئے۔ وقت کی نزاکت کا خیال انہیں نہ رہا۔ ممکن ہے کسی مضمون کی تیاری کے لئے مواد جمع کر رہے ہوں۔ دوسرے مہمانوں کے لئے یہ

سوالات کچھ جارحانہ ہی لگے۔ اس لئے بھی کہ دوسرے مہمانوں کو کچھ بولنے اور فیض صاحب کو رس گھولنے کا موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے بھی سوچا تھا کہ اپنے بزرگ دوست جناب فقیر سید وحید الدین مرحوم مصنف روز گار فقیر، اقبال کے سفر جنوبی ہند اور ان کے حرفِ شیریں کے تعلق سے کچھ معلومات حاصل کریں لیکن خاموش رہے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو پیاسے دیکھا ضرور، آنکھوں آنکھوں میں ہر ایک کو یہی کہتے پایا کہ یہ بھی ان کے دل میں ہے۔

رُخ بدلنے کی خاطر جناب سراج الحسن ادیب نے ایک سوال کا اضافہ کر دیا۔ مانو دوسرا محاذ کھول دیا ہو، آپ نے پوچھا، فیض صاحب! آپ کا ایک شعر ہے:-

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

میں نے جناب شہاب جعفری صاحب سے اس کے معنی پوچھے تو انہوں نے کہا یہ شعر TRANSFERRED EPITHET کی ایک بہترین مثال ہے۔

اس کا جواب پتہ نہیں کیسے گُل ہو گیا۔ شاید جواب سے پہلے کسی نے کوئی دوسرا سوال کر دیا۔ پروفیسر محمد حنیف کلیم کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ فرمایا۔ "پتہ نہیں فیض صاحب سے پھر کب ملنا نصیب ہو۔ کیوں نہ ہم آپ کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنیں۔

"ہاں!" ہم سب کا متفقہ فیصلہ تھا۔

فیض صاحب نے سگریٹ جلایا، کش لئے، پھر ایک مرصع غزل سنائی۔ اس کے اختتام پر، ایک اور جام کی فرمائش نے ساقی کو مجبور کر دیا۔ جام بڑھا، مجلس رنداں پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی۔ بہتا گہرا دریا، جس کی تہہ میں فن اور فکر کے ساتھ ساتھ مقصدی آبدار موتی بھی تھے۔ ترقی پسندوں پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ ان کے ہاں فن سے زیادہ مقصد اور پروپیگنڈہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں کو نہیں بخشا گیا۔ خصوصاً وقت کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی شمع جب (بہ ظاہر) گُل ہونے لگی ... ہر ترقی کا زوال لازمی ہے۔ مگر وہ روپ بدل بدل کر سامنے آتی ہے۔

فیض صاحب نے فن اور مقصد دونوں کو اس طرح سمو دیا ہے کہ دونوں ... [illegible]

کی تعریف میں رطب اللسان اور آپ کے فن کا لوہا مانتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ فن اور قادرالکلامی کی یہ مثال بہت کم ملتی ہے۔ فیض صاحب کے ناتے رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی، والی بات سولہ آنے ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا تبدیلی کے ساتھ۔

وقت کب رکا ہے۔ اچھا بھی اور برا بھی۔ اوّل الذکر بہ ظاہر تیز رفتار معلوم ہوتا ہے۔ چائے کی پیالیاں خالی اور طشتریوں میں ٹوٹے پھوٹے بسکٹ اس بات کا پتا دے رہے تھے کہ چاہ کے ساتھ چائے کا دور ختم ہو چکا ہے۔ کام و دھن کے ساتھ روح بھی اپنی غذا پا چکی تھی اور اصل خوشی تو اس کے اطمینان ہی میں حاصل ہوتی ہے۔

فیض صاحب اٹھے، قدم بڑھایا تو میں نے قدم ملایا۔ اور میری زبان نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی بات دماغ سے کہی۔ دماغ نے مسکرا کر ہاں کر دی جیسے وہ کہہ رہا ہو نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دل دھڑکا اور آگے بڑھا۔ اور میں نے پوچھا۔

محترم بزرگ فقیر سید وحیدالدین مرحوم مصنف روزگار فقیر نے راقم کے نام ایک کرم نامے میں تحریر فرمایا تھا کہ حضرت اقبال سے متعلق ایک دستاویزی فلم آپ کی شرکت یا تعاون میں تیار کر رہے ہیں[1] ان کے وصال کے بعد اس فلم کا کیا بنا؟

فیض صاحب نے جلا ہوا سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا، فلم تو بنی۔ اعتراضات بھی ہوئے اور یہ فلم فقیر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے خاندان کے کس فرد کے حصے میں جائے گی اس کا ابھی تصفیہ نہیں ہوا۔

اب ہم نے قدم کے ساتھ بات بھی بڑھائی اور اپنی کتاب "داستان از دکن آوردہ ام"[2] کا ذکرِ خیر کیا اور پوچھا، چودھری محمد حسین نے جنوبی ہند کا سفر نامہ لکھنا چاہا تھا۔ وہ ان کی زندگی میں اسے ترتیب دے سکے یا نہیں؟

مر۱ : راقم کا ایک تفصیلی مضمون ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کے ہماری زبان (علی گڑھ) میں ملاحظہ ہو۔
مر۲ : ڈاکٹر اقبال کی اس نظم کا مصرع ہے جسے سلطان ٹیپو کے مزار پر کہا تھا۔

فیض صاحب نے جواب میں فرمایا: "چودھری محمد حسین مرحوم نے کبھی ہم سے سفر نامے کے متعلق سے کچھ نہیں کہا۔"[1]

اب ناچیز نے اپنے مقصد کی اہم بات پوچھی جس کا تعلق اقبال کے ایک شعر سے ہے۔ اس سے پیشتر حضرت نیاز فتح پوری مرحوم، حضرت رشید احمد صاحب صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، غلام السیدین مرحوم، حضرت غلام رسول مہر مرحوم، حضرت مالک رام، جناب جگن ناتھ صاحب آزاد، پروفیسر سید مبارزالدین صاحب رفعت وغیرہ سے اس سلسلے میں مراسلت بھی ہوئی تھی۔

---

[1]: ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر اقبال کے جنوبی ہند (مدارس، بنگلور، میسور، سرنگا، پٹم اور حیدر آباد) کا سفر کیا تھا۔ آپ کے ساتھ چودھری محمد حسین اور عبداللہ چغتائی بھی تھے۔ چودھری مرحوم سفر نامہ لکھنے کا نیک ارادہ رکھتے تھے۔ جس کا ذکر حضرت اقبال نے جمیل مرحوم (بنگلور) کے نام خطوط میں کیا ہے۔

(الف) چودھری محمد حسین صاحب بخیریت ہیں اور تصاویر کی موجودہ قسط اور آئندہ اقساط ان کی دلچسپی اور مسرت کا باعث ہوگی۔ چودھری صاحب کو سلطان مرحوم کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور آج کل وہ سلطان پر ایک مختصر آرٹیکل مرتب کر رہے ہیں۔ وہ سفر نامہ مدارس بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس میں تمام تصاویر جو آپ ارسال فرماسکیں کام آئیں گی۔ (۱۸ر فروری ۱۹۲۹ء)

(ب) "میرا خیال ہے کہ سردیوں میں سفر نامہ کی تالیف و ترتیب پوری گرم جوشی سے شروع کر سکیں گے... آپ کا مکتوب چودھری صاحب کے حوالے کر دیا ہے۔ امید ہے وہ سفر نامے سے متعلق آپ کو مفصل اطلاع دیں گے۔ (۱۴ر اگست، ۱۹۲۹ء)

محترم بزرگ فقیر سید وحیدالدین نے راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ "آپ نے چودھری محمد حسین کی جس مجوزہ کتاب سفر نامہ جنوبی ہند کا تذکرہ کیا ہے میرے علم میں چودھری صاحب کی ایسی کوئی کتاب نہیں جو شائع ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں حضرت غلام رسول مہر نے اس ناچیز کو لکھا کہ "چودھری محمد حسین مرحوم نے کوئی خاص سفر نامہ نہیں لکھا تھا۔ علامہ مرحوم کے سرسری حالات بیان کر دیئے تھے اور وہ اس زمانے میں چھپ گئے تھے۔ یہ یاد نہیں، "انقلاب" کی کس اشاعت میں چھپے تھے۔"

اوران بزرگوں کا بڑا کرم رہا ہے مجھ پر۔ میں نے کہا۔

"فیض صاحب! اقبال کے اس شعر،

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

میں "حرفِ شیریں" سے کیا مطلب ہے۔؟

فیض صاحب قبلہ نے سگریٹ کا کش لیا اور پوچھا.... اس حرفِ شیریں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟

"میں نے اپنا پرانا سبق دھرا دیا" (۱) جس سے نیاز فتح پوری، غلام السیّدین، رشید احمد صدیقی، رفعت، جگن ناتھ آزاد، وغیرہ متفق تھے۔

حضرت فیضؔ نے مسکرا کر فرمایا، "جی ہاں! "حرفِ شیریں" سے مراد اقبالؔ کا اپنا کلام ہی ہے۔ میری مراد بر آئی" تو میں نے پوچھا کہ دہلی میں کب تک قیام ہے۔ اگر میں خط لکھوں تو کس پتے پر۔؟

آپ نے پتا تحریر کرنا چاہا تو میں نے روزگارِ فقیر کی پہلی جلد آگے کر دی جسے مرحوم فقیر سیّد وحید الدین نے راقم کو تحفتاً روانہ کی تھی۔ اس میں تعارف حضرت فیضؔ کے فیض رساں قلم سے ہی تھا۔ فیضؔ صاحب نے پہلے دہلی کا پتا انگریزی میں تحریر کیا۔ (کیئر آف، مسٹر ایس۔ این۔ بلگرامی، ۱۳۱، سندر نگر، نئی دہلی۔) پھر کراچی کا نام تو اردو میں لکھا لیکن پتا انگریزی میں۔

میں نے مسکرا کر فقیر سیّد وحید الدین مصنّف روزگارِ فقیر کے دستخط کے نیچے فیضؔ صاحب کے دستخط کرا لیئے۔ اس طرح روزگارِ فقیر کا یہ نسخہ میرے، میرے بچّوں اور کتب خانے کے لئے تاریخی اہمیّت کا حامل ہو گیا۔

ہم باتوں میں کھو گئے، ادھر دوسرے مہمان ہمارے اطراف جمع ہو گئے۔ نظر آگے پڑی تو نیلو فر رشید کے ہاتھ میں کیمرے کی آنکھ روشن تھی۔ میں نے میزبان پروفیسر حبیب النساء بیگم کو آگے بلا لیا۔ وہ اب معزّز مہمان کے قریب تھیں۔ کیمرے نے اپنی کھولی آنکھ بند کر لی۔

---

(۱) "غبارِ خاطر" اورنگ آباد کے اقبال نمبر میں راقم کا مضمون "حرفِ شیریں" ملاحظہ ہو۔

مانو کسی نے کسی کا حسین سراپا اپنی پلکوں میں چھپا لیا ہو۔ لیکن ہونٹ برابر مسکرا رہے ہوں۔ غرض اس طرح ایک حسین یاد محفوظ ہو گئی۔

اب سب نے باری باری ہاتھ ملایا۔ کار کب سے منتظر تھی۔ وہ انہیں بیٹھتے ہی قریب لے اڑی۔ ہم نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ دلہن بابل کا گھر چھوڑ پی کی نگریا نہیں جا رہی بلکہ پی کے گھر والے پیارے میں بیٹی کا ہنستا بستا چہرہ دیکھ کر باپ ہنسی خوشی اپنے گھر لوٹ رہا ہو۔ لیکن دونوں طرف خوشی کے ساتھ آنکھ سے اوجھل ہونے میں ملال کا عنصر بھی ضرور ہوتا ہے۔

نالاں ہے خونِ خلق ہر اک در کے سامنے
محشر خجل ہے کوئے ستم گر کے سامنے

بیٹھا ہے فردِ خانہ خرابی لئے ہوئے
اس گھر کے سامنے کوئی اس گھر کے سامنے

ہر بے بصر نے دستِ تمنّا کیا دراز
قاتل کے سامنے کبھی خنجر کے سامنے

جس دشت گم رہی میں ہمیں لے چلا، چلے
کس کو مجال عذر تھی رہبر کے سامنے

کس نے رفو کیا ہے لباسِ برہنگی
کیا کاج لے چلے ہو رفوگر کے سامنے

گلوں کی خوشبو

غلام حسین اظہر

فکرِ فیض ——— انٹرویو

فیض احمد فیض سے ملاقات کو جب بھی جی چاہا، فوراً ذہن میں ان کا یہ شعر ابھرا ہے

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمع جلیں
پھر تصور نے لیا، اس بزم میں جانے کا نام

لیکن برسوں تک زبردست خواہش کے باوجود فیض صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے جب "ملاقاتوں" کا سلسلہ شروع کیا تو وہ انگلستان میں تھے لوٹے تو کراچی کے ہو کر رہ گئے اور اس کے بعد اسلام آباد ان کا مسکن ٹھہرا۔ فیض صاحب کے لاہور آنے کے بعد ان سے ملنے کی خواہش اور بڑھ گئی۔ ایک روز میں نے برادرم کلیم اختر صاحب کے آفس سے فیض صاحب کو ٹیلیفون کیا چند ثانیوں میں فیض صاحب کی آواز سنائی دی، میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے کل آنے کو کہا۔ میں نے اسی روز چند لمحوں کے لئے ملنے کی اجازت چاہی فرمایا "زیادہ وقت نہیں ہوگا، چند منٹ کے لئے آجائیے"۔
فیض صاحب کے دفتر میں پہنچ کر سب سے پہلا خوشگوار تاثر یہ ہوا کہ یہاں ملنے والوں کو انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی ان کے کمرے کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "اندر چلے جائیے"۔ فیض صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، بڑی شفقت اور محبت سے پیش آئے اور میرے کشمیر سے تعلق کی وجہ سے کشمیر کے بارے میں ہی گفتگو کی، ہم نے حال اور ماضی کے کئی اوراق پلٹے اور اس گفتگو میں چند بالکل نئے گوشے نظر آئے۔ کشمیر سے فیض صاحب کا گہرا تعلق رہا ہے اس کی وجہ سے اس خطے کے بہت سے انجانے پہلوؤں سے وہ آشنا تھے اس مختصر سی گفتگو کے بعد آئندہ ملاقاتوں کی تاریخ طے کرنے کے بعد میں نے اجازت چاہی۔
مقررہ تاریخ پر میں فیض صاحب کے یہاں انٹرویو کے لئے حاضر ہوا۔ گفتگو کا آغاز کرنے کے

لئے میں نے سب سے پہلے ان سے موجودہ ادب کے بارے میں پوچھا۔

"نئے ادب سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں، کیا آج کے ادیب عصری تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں؟"

فرمایا "اچھے اور برے ادیب ہر دور میں موجود رہے ہیں، آج کے ادیب پہلے کے زمانوں سے کچھ مختلف تو نہیں ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کچھ ادیب عصری تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں اور کچھ نہیں کر رہے۔"

فیض صاحب کے اس جواب کی تشنگی کے پیش نظر میں نے کہا "ہر دور کے ادیبوں کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ضرور ہوتا ہے۔ آپ کی دانست میں آج کے ادیبوں کی اکثریت کا جھکاؤ کیا مثبت اقدار کی طرف ہے"؟

"پہلے کے اور آج کے دور میں کوئی خاص فرق نہیں، تناسب وہی ہے جو پہلے تھا۔ آج کے دور میں سیاسی الجھنیں زیادہ ہیں، منزل اتنی صاف نظر نہیں آتی، جتنی پہلے نظر آتی تھی۔ ادیب منزل اور سیدھے راستے کی تلاش میں ہیں۔ اکثریت یا اقلیت کا مسئلہ اہم نہیں ہے کیونکہ ادب میں رائے شماری تو نہیں ہوتی۔"

منزل کی تلاش کے مسئلے نے میرے ذہن کو ترقی پسند تحریک کی طرف منتقل کر دیا میں نے فیض صاحب سے ترقی پسند تحریک کے بارے میں پوچھا۔

"ترقی پسند تحریک کے پاکستان میں روبہ زوال ہو جانے کی وجوہ کیا ہیں"؟

"ترقی پسند تنظیم پاکستان میں ڈس انٹیگریٹ ضرور ہوئی ہے لیکن تحریک ختم نہیں ہوئی ہے پہلے ایک متحدہ محاذ تھا انگریزوں کے خلاف، آزادی کے قومی مسائل میں اختلافات کی گنجائش تھی اس وجہ سے تنظیم یکجا نہیں رہ سکی، تشدد بھی بہت ہوا، دباؤ بھی بہت پڑا اور سب لوگ یہ تشدد برداشت نہیں کر سکے آزادی، جمہوریت اور مساوات بنیادی قدریں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں آیا، باقی مسائل ایسے ہیں جن میں راستے مختلف ہو سکتے ہیں۔"

"کیا تنظیم کے منتشر ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ ترقی پسند تنظیم کے بعض ذمہ دار افراد کا خود شکست مان لینا نہیں"؟

"ہر تنظیم میں کمزور افراد بھی ہوتے ہیں اور ثابت قدم بھی۔ دباؤ بڑھ جاتا ہے تو ہر کسی کے قدم جمے نہیں رہتے، اکثر کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور یہ انسانی کمزوری ہے۔ معاشی کشمکش

اور روزگار کا مسئلہ بذاتِ خود دباؤ ڈالتا ہے۔ اس وجہ سے ہم افراد کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔"

میں نے اپنے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کے لئے یہ گذارش کی کہ میں ترہیب سے زیادہ ترغیب و تحریص کی بات کر رہا ہوں، دورِ ایوبی میں اس حربے کو بطور خاص آزمایا گیا، جس کی وجہ سے بہت سے ادیب اپنی راہ سے بھٹک گئے۔ میرا یہ معروضہ سن کر فیضؔ صاحب نے فرمایا۔

"یہ تو ہمیشہ ہی کہا جاتا ہے، تعزیر، تادیب اور ترغیب سب باتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں کچھ لوگ خوف کی وجہ سے بھاگ جاتے ہیں، کچھ لالچ سے بھٹک جاتے ہیں، کسی کی ایک کمزوری ہے، کسی کی دوسری، یہ کوئی نیا حربہ نہیں تھا۔"

اس کے بعد میں نے فیضؔ صاحب سے پوچھا۔

"آپ نے چند سال قبل ایک ادبی انجمن قائم کی تھی اس میں بہت سے جانے پہچانے ترقی پسند ادیبوں کو آپ نے شامل نہیں کیا اس کی وجہ کیا تھی؟"

"میں نے کوئی ادبی انجمن قائم نہیں کی تھی البتہ کراچی میں چند احباب نے عوامی ادبی انجمن کے نام سے ایک تنظیم ضرور قائم کی تھی جس میں میرا نام بھی شامل تھا مجھے خود ان احباب کے طریق کار سے کچھ اختلاف تھا اس لئے میں نے اس میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔"

"آپ نے کراچی میں ادارہ یادگار غالب قائم کیا اس کے قیام کا مقصد کیا تھا؟"

"ادارہ یادگار غالب مرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں قائم کیا گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ ادارہ ادبیات اردو کے مطالعے کے لئے بالعموم اور غالبیات کے مطالعہ کے لئے بالخصوص کوئی مستقل مرکز بن جائے، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ناظم آباد، کراچی میں بلدیہ کراچی اور حبیب بنک کے تعاون سے ایک بہت خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی جہاں اس ادارے کا دفتر بھی ہے اور غالبؔ لائبریری بھی، اس لائبریری میں اب تک کئی ہزار کتب جمع ہو چکی ہیں، اس کے علاوہ برصغیر میں ادبی رسائل کا غالباً سب سے بڑا ذخیرہ یہیں موجود ہے۔ ان رسائل میں شائع شدہ تمام مضامین کے انڈکس کارڈ بنوائے جا رہے ہیں۔ لائبریری سے ملحق پائیں صحن میں ایک مختصر سا اسٹیج بھی ہے جہاں علمی اور ادبی تقریبات بہت باقاعدگی سے کی جاتی ہیں، غالباً کراچی میں یہ ادارہ سب سے سرگرم ادبی مرکز ہے۔"

ترقی پسند تحریک، ادبی، عوامی انجمن اور ادارہ یادگار غالب کے بعد میں نے فیضؔ صاحب سے ان

کے پسندیدہ موضوع کلچر کے بارے میں گفتگو کی۔

"ہمارے یہاں کلچر کے موضوع پر بہت سی بحثیں ہوئی ہیں۔ کچھ حضرات ہمارے کلچر کی بنیادیں موہنجوڈارو میں ڈھونڈتے ہیں تو کچھ ایران و عرب میں، اس مسئلے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

"کلچر تو ہمیشہ کسی معاشرے کا اپنا ہوتا ہے، کلچر کو باہر تلاش کرنا بیکار ہے۔ کلچر کی حد ایسے مقرر نہیں کی جا سکتی جیسے کسی ضلع یا صوبے کی مقرر کرتے ہیں، کلچر اور ثقافت مختلف راستوں سے داخل ہوتے ہیں اور کہیں اور نکل جاتے ہیں جو چیز کسی معاشرے میں جذب ہو جاتی ہے وہ اس کا حصہ ہے، کچھ چیزیں متروک ہو جاتی ہیں اور کچھ زائد المیعاد ہو جاتی ہیں۔"

فیض صاحب سے کلچر کے موضوع پر گفتگو ابھی شروع ہوئی تھی کہ ان کے ایک بزرگ دوست فاطمی صاحب تشریف لے آئے، ان کی آمد پر فیض صاحب نے مجھ سے کہا آپ اُدھر تشریف رکھیں ہم ذرا ان سے گپ شپ کر لیں گے، میں سامنے کی کرسی سے اٹھ کر قریب کے صوفے پر بیٹھ گیا، اور فیض صاحب فاطمی صاحب سے گفتگو میں محو ہو گئے۔ میں خاموشی سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔ فاطمی صاحب کو پرانے کتب خانوں سے خاص دلچسپی ہے اس لئے زیادہ تر گفتگو اسی موضوع پر ہوئی، فیض صاحب نے پاکستان کے کئی قدیم کتب خانوں اور ان میں موجود نایاب کتابوں کی نشاندہی کی، مثلاً انہوں نے بتایا کہ تالپور کے کتب خانہ میں گلستان کا ایک بہت پرانا نسخہ ہے۔ قرآن مجید اور تفاسیر کے نسخے بھی ایک سے ایک بڑھ کے ہیں مختلف امراء کی مہریں بھی موجود ہیں، گردیزیوں اور خاکوانیوں کے کتب خانوں کی بھی بہت تعریف کی، اورنٹیل کالج اور پنجاب یونیورسٹی کی لائبریریوں کے شعبۂ پنجابی کے بارے میں فرمایا کہ ان کتابوں پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی وہاں بہت سی نادر پنجابی کتابیں موجود ہیں۔ فیض صاحب نے اس خیال سے کہ شاید میں الگ بیٹھا بور ہو رہا ہوں فرمایا آپ بھی ادھر آجائیے اس مشفقانہ ارشاد کے بعد میں بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔ میں نے فاطمی صاحب سے احمد حسین قریشی صاحب کے کتب خانے کا ذکر کیا، وہ پہلے سے اس کتب خانے سے واقف تھے انہوں نے فرمایا میں نے تعریف بہت سنی ہے خود جا کر اس کتب خانے کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ فاطمی صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے کلچر کے مسئلے پر جو گفتگو ہو رہی تھی، اس کو جاری رکھنے کی گذارش کی، فیض صاحب نے نیا سگریٹ سلگایا اور اس کا کش لگاتے ہوئے فرمایا۔

"کلچر کے مسئلے کو بے وجہ الجھایا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک ملک بنا، اس کا نام پاکستان ہے، پاکستانی جس طریقے سے رہتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہیں تاریخ کے مختلف ادوار سے جو رشتہ وابستہ کرتے ہیں، ان سب کا ملغوبہ یہاں کا کلچر ہے اس کی مختلف صورتیں ہیں، مختلف علامتیں ہیں، بہت سے تاریخی تجربات ہیں، تھوڑا بہت فرق ہے، لیکن یہ ہر ملک میں ہوتا ہے"۔

"دوسری بات مختلف تہذیبی اثرات کی ہے، یہاں مختلف علاقوں میں مختلف لوگ آئے مثلاً آریا، یونانی، ترک وغیرہ وغیرہ، اس لئے یہاں مختلف تہذیبی اثرات پڑے۔ ان کی جو چیز جذب ہو گئی وہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے، جو چیز کسی وجہ سے جذب نہیں ہوئی وہ یہاں کے کلچر کا حصہ نہیں ہے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس لئے ظاہر ہے جو اثرات اسلامی عقائد اور روایات کی وجہ سے یہاں پہنچے ہیں انہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بہت سی چیزیں دوسرے ممالک سے مشترک ہیں کچھ ایسی ہیں جو مشترک نہیں نہیں ہیں وہی ہمارے کلچر کی اصل بنیاد ہیں چونکہ آزادی کو حاصل ہوئے صرف ۲۷ سال گذرے ہیں اور تقریباً ایک صدی بیرونی حکمرانوں کی غلامی میں گذری ہے اس وجہ سے ایک مربوط اور منضبط قسم کا طریق زندگی پیدا نہیں ہو سکا، کلچر کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انگلی رکھ کر ہم نشاندہی کر سکیں کہ یہ کلچر ہے۔ کلچر کوئی جامد چیز بھی نہیں ہے کلچر حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آزادی کے بعد نئی صورتحال پیدا ہوئی ہے، بہت سی رکاوٹیں جو نظر آ رہی ہیں دور ہو جائیں گی اور یہاں کوئی نئی تہذیب ارتقاء پذیر ہو گی اور آپ اسے خالص پاکستانی کہہ سکیں گے"۔

"دوسری بات یہ ہے کہ مختلف اقسام کی معاشی اونچ نیچ سے مختلف طبقوں کے رہنے سہنے کا انداز مختلف ہوتا ہے چنانچہ ہر شہر اور ہر گلی کوچے میں مختلف کلچر ہیں اونچے طبقے کا کلچر الگ ہے نچلے طبقے کا الگ۔ امیر اور طرح رہتے ہیں اور غریب اور طرح۔ جب معاشرے کی صورت بدلے گی تو کلچر کی صورت بھی بدلے گی"۔

اس گفتگو کے دوران بیگم فیض بھی آ گئیں، فیض صاحب کا دفتر سے گھر جانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن انہیں یہ خیال تھا کہ میں بہت دور سے، آزاد کشمیر سے چل کر اس انٹرویو کے لئے حاضر ہوا ہوں اس لئے انہوں نے ایلس فیض صاحبہ سے انگریزی میں فرمایا آپ کو واپس جانے کی بہت زیادہ عجلت تو نہیں ہو گی۔ میں ذرا ان سے گفتگو کر لوں۔

مسز فیض اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور فیض صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا، معاشی اونچ نیچ کا ذکر آیا تو میں نے سوال کیا۔

"کیا ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی بدحالی اور طبقاتی تقسیم نہیں؟ اس مسئلے کو نظر انداز کر کے کلچر کے مسئلے پر زور دینا کیا رجعت پسند قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف نہیں؟"

"کلچر کا مسئلہ ایسا ہی بنیادی ہے جیسے باقی معاملات ہیں، یہ بھی دیگر مسائل کا ایک حصہ ہے۔ اس کو معاشرے کے باقی ڈھانچے سے الگ کر کے سوچنا گمراہ کن بات ہے ظاہر ہے کہ اس میدان میں اس وقت جو بھی کام ممکن ہو وہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کوئی سیاسی یا معاشی کام، رجعت پسند تو چاہتے ہیں کہ اس قسم کا سوال یہاں پیدا ہی نہ ہو کیونکہ اس سے کئی اور مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کلچر بھی تو زندگی کو بہتر بنانے کا طریقہ ہے۔ جو لوگ نہیں چاہتے کہ زندگی میں انقلاب آئے وہ تو کہتے ہیں کہ اس کی بات ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ تو اس مسئلے کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ قصہ تو پہلے ہی دن طے ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مختلف لوگ اپنے اپنے طریقے سے اس کی تفسیر کرتے ہیں۔"

فیض صاحب کے اس جواب کے بعد میں نے ان سے عرض کیا میں اس مسئلے کی اہمیت کا منکر نہیں ہوں لیکن کیا کلچر اور معاشی انصاف کے حصول کے مسئلے کو ایک ہی سطح پر رکھا جا سکتا ہے؟

فیض صاحب نے فرمایا "نہیں ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ معاشی انصاف کی اہمیت زیادہ ہے، لیکن بات یہ ہے کہ معاشی انقلاب اور ذہنی انقلاب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ذہنی انقلاب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ سیاسی تنظیم ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب تک معاشی اور معاشرتی مسئلے طے نہ ہوں، باقی مسائل طے نہیں ہو سکتے۔ لیکن کسی وقت یا کسی صورتحال میں ان امکانات کو استعمال میں نہ لانا بھی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے وہ ذہنی فضا ہموار ہو سکتی ہے جو معاشی اور معاشرتی مسائل کے طے کرنے میں مفید ثابت ہو۔"

اس کے بعد میں نے ایک ذاتی سوال کیا۔

"آپ اس وقت کلچرل ایڈوائزر کی حیثیت سے جو کام کر رہے ہیں، اس کی اہمیت زیادہ ہے یا اس کام کی جو آپ نے پاکستان ٹائمز کے مدیر کی حیثیت سے سرانجام دیا۔ کیا اس وقت آپ کی حیثیت زیادہ ڈرامائی نہیں تھی؟

"اخبار واپس دلادو تو ہم وہی کام کریں گے"۔

"فیضؔ صاحب، آپ اپنی ذاتی مساعی سے بھی تو اخبار جاری کر سکتے ہیں"۔

"اب وہ صورت نہیں ہوگی جو اس وقت تھی، اخبار کا مالک کوئی اور ہوگا، انتظامیہ کسی اور کی ہو گی، پہلے پالیسی ہمارے ہاتھ میں تھی یا پالیسی بنانے والے ہم خیال لوگ تھے، جب تک وہ لوازمات نہ ہوں جو ماضی میں تھے اخبار کس طرح نکال سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر شعر لکھ سکتے ہیں لیکن انفرادی طور پر ان ذرائع پر قابو نہیں پا سکتے جن کی چابی کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ اس کے علاوہ عمر کے کسی نہ کسی حصے میں ریٹائر ہونے کا حق ہونا چاہیئے، یہ کام آپ کیجئے ہم کب تک کرتے رہیں گے"؟

نئی نسل کے حوالے سے میں نے پوچھا "نئی نسل آپ سے رہنمائی کی توقع تو کر سکتی ہے نا"؟

فیضؔ صاحب نے فرمایا "ہم تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ نئی نسل ہماری رہنمائی کرے، ہم نے بزرگوں کی تمام باتیں کب مانی تھیں جو کچھ صحیح سمجھا جاتا تھا وہ راستہ اختیار کیا تھا۔ آپ ہماری رہنمائی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں"؟

فیضؔ صاحب نے اخبار کی پالیسی کے بارے میں ذاتی عمل دخل پر زور دیا تھا اس لئے میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ اس وقت جو کام کر رہے اس میں آپ کی ذاتی رائے کو کس حد تک دخل ہے کیا اس کی چابی کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے"؟

"اس وقت ہمارا کام تو صرف مشورہ دینا ہے، کوئی مانے یا نہ مانے ہم تو صرف کنسل ٹینٹ ہیں"۔

"آپ نے نیشنل آرٹس کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے کئی سال تک کام کیا، اس سلسلے میں آپ نے علوم و فنون کی ترویج کے لیئے کیا کیا"؟

"نیشنل کونسل آف آرٹس کے سربراہ کی حیثیت سے میں نے بہت سی تجاویز حکومت کو پیش کی تھی، جن میں نیشنل تھیٹر، نیشنل آرٹ گیلری، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فوک لور نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز وغیرہ کا قیام تھا اور فنکاروں کی مالی امداد اور اعزازات کے مناسب انتظام کی سفارش کی تھی۔ اس کے علاوہ صوبائی اور ضلع کی سطح پر ثقافتی اداروں کی تشکیل تھی۔ ان میں سے ایک آدھ پر عمل درآمد کی ابتداء ہو چکی ہے، بقیہ اب تک زیر غور ہیں۔ میری موجودہ ذمہ داری صرف ثقافتی امور میں مشورہ بہم

پہنچاتا ہے چنانچہ ہے

"اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے"

"فنون کے میدان میں ماضی کے تہذیبی ورثے کے تحفظ انہیں روشناس کرانے اور ان کی ترویج کے لئے آپ کی دانست میں کون سے اقدامات ضروری ہیں؟"

"اس سلسلے میں آج سے چند برس پہلے ایک کمیٹی نے میری سربراہی میں مفصل تجاویز مرتب کی تھیں جو ایک کتابچے کی صورت میں اب زیر طبع ہے"۔

وقت خاصا ہو چکا تھا، فیض صاحب نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ ایک روز اور ٹھہریں گے"؟ میں نے عرض کیا اس انٹرویو کی تکمیل کے لئے مزید ایک روز ٹھہرنے کے لئے تیار ہوں تو انہوں نے دوسرے روز صبح دس بجے آنے کا وقت دیا اور یوں ہماری پہلی نشست ختم ہوئی۔

دوسرے روز میں مقررہ وقت پر پہنچا اور فیض صاحب سے اجازت لے کر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ فیض صاحب موجودہ ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے کراچی کے عبداللہ ہارون کالج سے وابستہ تھے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس ادارہ کے بارے میں کچھ پوچھوں تاکہ فیض صاحب کے تعلیمی نظریات سے بھی آگاہی ہو سکے۔

فیض صاحب آپ عبداللہ ہارون کالج سے الگ کیوں ہو گئے"؟

"یہ ادارہ قومی تحویل میں لیا جانے والا تھا اور مجھے گھر بھی واپس آنا تھا، کراچی میں کالج بن گیا، ہسپتال بن گیا، آڈیٹوریم بن گیا، اتنا کچھ بن گیا اب آگے دوسرے لوگ چلائیں"۔

"آپ نے اس ادارے کی سربراہی کیوں قبول کی تھی"۔

"جس علاقے میں عبداللہ ہارون کالج قائم کیا گیا اس میں ہائی اسکول کے علاوہ تعلیم کی دوسری سہولتیں نہ تھیں، اس علاقے میں اکثریت غریب عوام کی ہے، ماہی گیر، گاڑی چلانے والے اور مزدور پیشہ لوگ جو بچوں کو کالج میں بھجوا نہیں سکتے تھے۔ یہ علاقہ برے لوگوں کا مرکز تھا یہاں ہر قسم کا غیر مستحسن کاروبار کیا جاتا تھا، اکثر بچے غلط راہ پر بچپن ہی سے پڑ جاتے تھے یہاں عبداللہ ہارون نے یتیم خانہ بنوایا تھا جو ہائی اسکول کے درجے تک پہنچ گیا تھا، باقی کچھ نہیں تھا۔ ان کے جانشینوں کی مصروفیات کچھ اور تھیں، صرف لیڈی نصرت ہارون کو اس ادارے سے دلچسپی تھی۔ لندن سے

واپسی پر انہوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم یہ کام سنبھالیں۔ ہم نے جا کر علاقہ دیکھا بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا، یہاں پہلے انٹرمیڈیٹ کالج بنایا، پھر ڈگری کالج پھر ٹیکنیکل اسکول اور پھر آڈیٹوریم کچھ رقم ہارون انڈسٹری سے خرچ کی گئی۔ کچھ ہم نے فراہم کی۔ ماہی گیروں کی سب سے بڑی کوآپریٹو سوسائٹی بنی، انہوں نے ہمیں ڈائرکٹر بنالیا، ہم نے طے کیا کہ سوسائٹی کے اخراجات سے سو بچوں کو مفت تعلیم دی جائے اور ان بچوں کے سب اخراجات بھی ادارہ برداشت کرے۔ اس کالج میں طلباء کی اکثریت کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔"

"ان امور کے علاوہ اس ادارے کو ایک مثالی ادارہ بنانے کے لئے آپ نے کن امور پر توجہ دی؟"

"کراچی میں خاص طور سے بدامنی، بے چینی، ہڑتالوں وغیرہ کے قصے ہوتے رہتے تھے طلباء اور اساتذہ میں بھی رابطہ نہیں تھا، ہم نے کوشش کی کہ اس امر کی اصلاح کی جائے، طلباء اور اساتذہ مل کر کام کریں چنانچہ ہمارے کالج میں ایک مرتبہ بھی ہڑتال نہیں ہوئی، گورنمنٹ ادارے بند ہو جاتے تھے مگر ہمارا کالج کھلا رہتا تھا اور طالب علم پڑھائی کے لئے آتے تھے۔ اس کالج کا نقشہ دوسرے کالجوں سے بالکل مختلف تھا۔ درسی کتابیں پڑھانے کے علاوہ اساتذہ اور طلبا کی بصیرت میں اضافے کے لئے لائبریری کو بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اہلِ ثروت سے مدد لی گئی۔ اساتذہ سے اپنے اپنے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھوائے گئے میرے خیال میں محدود ذرائع کے باوجود یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا۔"

طلبا کے ہنگاموں اور نئی نسل میں بے چینی کی وجوہ کے بارے میں فیض صاحب کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لئے میں نے پوچھا۔

"فیض صاحب طلباء کے ہنگاموں اور ہڑتالوں کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ ان کی اصل وجوہ کیا تھیں؟"

"ان کے اسباب بہت سے ہیں اصل میں سب خرابیاں تو سماجی ڈھانچے میں ہیں جس سے مختلف شاخسانے پیدا ہوتے ہیں۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی اقدار کا تعین نہیں ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحصیلِ علم یا تدریس کو معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہے یا نہیں ہم بدقسمتی سے

ہمارے یہاں نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں اصل چیز پیسہ ہے یا پھر اقتدار یا پھر دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ اس صورتحال میں اساتذہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہماری تنخواہیں بڑھاؤ اور یقیناً انہیں دوسروں جیسی آسائشیں ملنی چاہئیں۔ لائبریری اچھی ہو، تدریسی سہولتیں حاصل ہوں۔ ادھر بہت کم توجہ دی جاتی ہے طلبا مطالبہ کرتے ہیں کہ امتحان ملتوی ہونا چاہیئے۔ نظام تعلیم اور علم کو کوئی مقام حاصل نہیں اور اہمیت ڈگری یا ملازمت کو دی جاتی ہے۔ دوسری ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ہماری سیاست نے جو رنگ اختیار کیا ہے اس نے چند برسوں سے غلط راستے دکھائے ہیں سیاست میں طالب علموں کو حصہ لینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ دوسروں کو لیکن انہیں پہلے اپنا کام کرنا چاہیئے، ان کا پہلا کام علم حاصل کرنا ہے لیکن وہ اپنا کام چھوڑ کر سیاستدانوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور مفاد پرست اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس سیاسی کام کے عوض میں طالب علم رعائتیں طلب کرتے ہیں نتیجے میں استاد بے چارے کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔"

طالب علموں کے ہنگاموں اور بے چینی کو عالمی تناظر میں رکھ کر سوچنے اور اپنے ملک اور مغربی ممالک کے فرق کی وضاحت کے لئے میں نے فیضؔ صاحب سے گذارش کی۔

"طلبہ کی بے چینی اور ہنگامے کیا پوری دنیا کا یکساں مسئلہ نہیں ہے بالخصوص مغربی ممالک؟ کیا یہ بے چینی ایک عالمی مسئلہ نہیں بن گئی ہے؟"

"مغربی ممالک کا مسئلہ دوسرا ہے، ان کے یہاں اکثر طلبا اپنی ذات کے اظہار کے لئے مختلف قسم کے وسیلے اور ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان ملکوں میں نسبتاً خوشحالی اور دولت کی فراوانی ہے۔ جس کی وجہ سے طلباء اور نوجوانوں کو تلاشِ معاش کی فکر نہیں ہوتی وہ تلذذ کے مختلف راستے تلاش کرتے رہتے ہیں، جیسے پرانے زمانوں میں ہمارے نواب کیا کرتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک نے پسماندہ ملکوں کی دولت سے اپنا گھر چلایا، ان کے سامنے دو نصب العین تھے ایک تو اپنی مملکتوں اور ملکیتوں کو برقرار رکھنا، دوسرے اپنے تمدن کو دوسروں پر مسلط کرنا، تیسرے اپنے گھر میں جمہوریت اور آزادی کے دُہرے معیار کا تحفظ۔ ایک لمبے عرصے تک مغربی ممالک میں ان کے نصب العین کی ایک بنیاد تھی، پھر فاشزم کا دور شروع ہوا تو جتنے نوجوان وہاں تھے انہیں بائیں بازو کے نظریات کے تحت ایک مسلک ہاتھ آگیا۔ دوسری،

جنگ عظیم میں فاشزم کی وجہ سے یہ سہارا ان کے ہاتھ سے جاتا رہا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے نوجوانوں نے اپنی ذات کی تکمیل کے لیئے اور فطری تقاضوں کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کیئے، کچھ عرصے تک ایک مسئلہ ان کے ہاتھ آگیا تھا جو ان کے لئے محض جذباتی بات تھی، ان کا کوئی نظریاتی اتحاد عوام سے نہیں تھا پھر امریکہ میں جو نیگرو تھے ان کے پاس اپنی محرومی اور استحصال کے خلاف مسئلہ پہلے سے موجود تھا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب میں نوجوانوں کے مسائل ذاتی، جذباتی اور موضوعی ہیں، لیکن ہمارے معاشرے میں صورتحال بالکل مختلف ہے بھوک، جہالت، افلاس، بیماری اور بے روزگاری کے مسائل ہیں۔ ان کے بارے میں ذاتی نجات کے بجائے اجتماعی جدوجہد اور تنظیم کی ضرورت ہے یہ تو ہمیشہ ہوا کہ جب دنیا کا نقشہ بدلتا ہے نوجوان ایک نئی منزل کی طرف قیادت کرتے ہیں اس وقت بھی دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے اور نوجوانوں میں بے چینی ایک حد تک فطری بات ہے صرف سوال یہ ہے کہ یہ بے چینی کیا رخ اختیار کرتی ہے؟ یہ بے چینی محض منفی بھی ہو سکتی ہے تعمیر نو کا باعث بھی بن سکتی ہے اور محض توڑ پھوڑ پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔"

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کے ذکر سے روس کے رویئے میں تبدیلی کا مسئلہ میرے ذہن میں ابھرا چنانچہ میں نے فیض صاحب سے روس میں ترمیم پسندی کے رجحان کے بارے میں سوال کرنا ضروری سمجھا کیوں کہ فیض صاحب ہمارے دانشوروں میں سب سے زیادہ روس کے نئے حالات سے باخبر ہیں میں نے عرض کیا۔

"روس کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں ترمیم پسندی یعنی ریوی ژنزم کا رجحان پیدا ہو چلا ہے، یہ بات کہاں تک درست ہے؟"

"روس کے بارے میں ترمیم پسندی کی جو بات کہی جاتی ہے وہ ایک لازمی پروسیس ہے۔ ترمیم کرنا کوئی خامی نہیں ہے۔ ماؤزے تنگ نے خود کئی امور میں ترمیم کی ہے۔ جسے ہم مارکسزم یا لینن ازم کہتے ہیں اس میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ مادی اور معاشرتی حالات کے مطابق تبدیلی ہونا کوئی بری بات نہیں بشرطیکہ اس بنیادی اصول کو قائم رکھا جائے کہ ذرائع پیداوار افراد کی نہیں حکومت کی ملکیت ہوں، اس بنیادی اصول کو قائم رکھ کر حالات کے مطابق تبدیلی لازمی ہو جاتی ہے، روس میں مارکسزم کا جو بنیادی مسلک ہے یعنی دولت کی اجتماعی ملکیت کا اس میں کوئی فرق

نہیں آیا ہے یا جسے پیداواری رشتے کہتے ہیں، اس میں انہوں نے کوئی ترمیم نہیں کی ہے لیکن ملکی دولت کی تقسیم اور نظم و نسق کے طریقے ملکی سیاست کے پیش نظر اور حالات کے مطابق بدلنے پڑتے ہیں۔ روس اور چین دونوں میں معیشت اور سیاست کے اصول ایک سے ہیں۔ عملی تفاسیر دونوں میں الگ ہیں۔ اسی طرح چیکوسلاواکیہ میں بھی اور ہیں۔ چھوٹے ملکوں کی آزادی یا حق خود ارادیت کے معاملے میں اپنی مصلحت کے مطابق چین اور روس دونوں ہم نوا ہیں اور زیردستوں کی حمایت کرتے ہیں۔ افریقی ممالک کی آزادی کا معاملہ ہے، فلسطین کا مسئلہ ہے۔ یہاں دونوں نے زیردستوں کا ساتھ دیا ہے حکمت عملی میں تھوڑا بہت فرق ہو تو ہو بنیادی فرق کوئی نہیں ہے۔"

اس موقع پر میں نے فیض صاحب سے کہا "کشمیر کے معاملے میں روس نے یہ پالیسی کیوں اختیار نہیں کی ہے؟"

"کشمیر کا معاملہ پیچیدہ ہے، جب تک سارے حالات سامنے نہ ہوں، کچھ کہنا مشکل ہے۔ بڑے ملکوں کی اپنی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں روس والے خود اپنا دفاع کریں، مجھے کیا ضرورت ہے کہ ان کی وکالت کروں؟"

اس سوال کے بعد میں نے ایک بہت ہی نازک سوال کیا۔ "عوام کی تائید کے بغیر فوج کی مدد سے انقلاب بپا کرنا، کیا مارکسزم اور لینن ازم کی تعلیمات سے انحراف نہیں ہے؟"

فیض صاحب نے بڑے تحمل سے فرمایا۔ "آپ جس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اس سلسلے میں محض قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں اوّل تو سرے سے کوئی سازش تھی ہی نہیں، چند فوجی مفسروں نے دیکھا کہ ملکی حالات ابتر ہو رہے ہیں انہوں نے سوچا کہ حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ زیادہ جمہوری اور اصلاح پسند راستہ اختیار کرے، لیکن کہانی یہ بنائی گئی کہ انہوں نے فوجی انقلاب بپا کرنا چاہا ہے، چونکہ فوجی افسروں کا معاملہ تھا، اس لئے حکومت نے ایک قدم اٹھا لیا اور اشتہار دے دیا، ورنہ بات کچھ نہیں تھی۔"

فیض صاحب نے کھل کر بات کہہ دی تو میں نے اس بارے میں ایک اور سوال کیا۔ "راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں سابق میجر جنرل اکبر خان نے جو لکھا ہے اس سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟"

"جنرل اکبر خان کی تحریر میری نظر سے نہیں گذری، اس قضیے کے بارے میں بشرط زندگی

تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے۔"

اس جواب کے بعد اس موضوع پر مزید گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فیض صاحب کو بھی کہیں جانا تھا، انہوں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو میں نے محسوس کیا کہ اب دو چار سوالات ہی کیئے جا سکتے ہیں۔

"آپ نے جیل کے خطوط میں رزمیہ نظم لکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے، اس نظم میں آپ کیا پیش کرنے کے متمنّی ہیں۔"

"جو کچھ ہم پر اور پوری دنیا پر پچھلے تقریباً چالیس سال میں گزری ہے، اپنے دورِ شعور سے لے کر اب تک کی آپ بیتی، اور جگ بیتی، تاثرات اور مشاہدات کو مربوط شکل میں پیش کرنے کی خواہش تھی، وقت ملا تو ممکن ہے میں یہ کام مکمل کر لیتا، یہ بھی ممکن ہے کہ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں یہ کام کر سکوں۔"

"آپ نے جیل میں کلاسیکی شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ کیا وہ کام مکمل ہو چکا ہے؟"

"قریب قریب مکمل ہے، میں یہ کام آہستہ آہستہ کرتا رہتا ہوں۔ جب بھی فرصت ملتی ہے ابھی یہ کام جاری ہے۔"

"اس میں آپ نے کن شعرا کو شامل کیا ہے۔"

"کلاسیکی شاعروں سے حالی تک۔"

"آپ نے اپنے مجموعۂ کلام کے دیباچے کے لئے ن۔ م۔ راشد صاحب کو منتخب کیوں کیا جبکہ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے نہیں تھا بلکہ وہ اس سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔"

"ہم عصر شعراء میں سے سب سے ذہین شاعر وہی تھے، ذاتی دوستی بھی شامل تھی اور ایک حد تک وسیع معنوں میں انہیں ترقی پسند بھی سمجھتا ہوں۔"

راشد صاحب نے آپ کو محسوسات کا شاعر قرار دیا ہے، کیا اس بات سے آپ کو اتفاق ہے؟"

"جزوی طور پر یہ بات درست ہے، ہم نے فلسفہ بگھارنے کی کبھی کوشش نہیں کی لیکن ہماری شاعری میں ایک بنیادی نقطۂ نظر ضرور ہے۔ اظہار کے مختلف طریقے ہوتے ہیں کسی کو ایک پسند ہے کسی کو دوسرا، مفکر ہونے کا وہم ہمیں کبھی نہیں رہا، ہمیشہ حقیقت پیش نظر رہی ہے۔

جو دل پہ گذرتی ہے، رقم کرتے رہیں گے

کبھی انقلاب کا غلبہ ہوتا ہے کبھی محسوسات کا، دل جو کچھ کہتا ہے ہم لکھ دیتے ہیں دل و دماغ کو مجبور نہیں کرتے کہ یوں لکھو یوں نہ لکھو، ایسا کرنا ممکن تو ہے لیکن اس میں تھوڑی سی بددیانتی کرنی پڑتی ہے۔"

فیض صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اپنا نظریہ شاعری پیش کر دیا، اس کے بعد آخر میں ان سے یہ سوال کیا۔

"مرزا ظفر الحسن صاحب نے متاع لوح و قلم میں آپ کی تقریباً سبھی تحریریں یکجا کر دی ہیں، کیا آپ کے لکھے ہوئے اداریوں کو بھی کوئی صاحب یکجا کر رہے ہیں؟"

"پاکستان ٹائمز کے اداریوں کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہے، ایک دوست رحمان اختر صاحب اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں اور ادب لطیف اور لیل و نہار کراچی کے اداریے مرزا ظفر الحسن مرتب کر رہے ہیں۔

فیض صاحب کے مختصر جوابات سے ظاہر تھا کہ انہیں کہیں جانا ہے چنانچہ طرفین کے خدا حافظ کہنے پر یہ نشست ختم ہوئی۔

فیض احمد فیض

پی آئی اے کی معشوق مزاجی

(ہفتہ ۱۷ اپریل ۱۹۷۶ء کو محبانِ فیض کراچی کی جانب اور ادارۂ یادگارِ غالب کے اشتراک سے برپا کی جانے والی محفل میں جہانِ عزیز فیض احمد فیض ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے پہنچے کیونکہ انھیں لاہور سے صبح لانے والا بوئنگ جہاز شام پہنچا اور تقریب کے وقت سے ڈیڑھ گھنٹے بعد۔ فیض کی جس ریکارڈنگ سے یہ مسودہ مرتب کیا گیا ہے اُسے غالب لائبریری میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔ م ط ح)

سب سے پہلے تو مجھے پی آئی اے کی جانب سے آپ کی خدمت میں معذرت پیش کرنا ہے۔ پی آئی اے والے تو معشوق مزاج ہیں وہ تو معذرت کریں گے نہیں۔ اس محبوب کا ہمیں برسوں سے تجربہ ہے لیکن روایتی محبوب سے دہوکہ کھا جانے کی طرح ہر بار ہم اس سے بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ہر چند کہ ہم اپنے سفر میں چار پانچ گھنٹے کی گنجائش رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود بیشتر اوقات یہ سفر وقت پہ طے نہیں ہو پاتا۔ اگر آدمی بیل گاڑی میں سفر کرے تو اُسے اندازہ ہوتا ہے کہ اتنے کوس اتنی دیر میں پہنچیں گے۔ چونکہ پی آئی اے کا پروگرام چھپا ہوا ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں وقت تک اپنی منزل کو پائیں گے اس لئے عموماً غلطی ہو جاتی ہے اس کے لئے پی آئی اے آپ سے معذرت خواہ ہے رسمی طور سے مجھے آپ کے خلوص و محبت کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے لیکن وہ میں نہیں کروں گا اس لئے کہ محبت کا شکریہ نہیں ادا کیا جاتا بلکہ محبت کے جواب میں محبت کی جاتی ہے۔ اس میں غالباً آپ ہمیں عاجز، غافل یا تساہل پسند نہیں پائیں گے کیونکہ ہمیشہ ہی محبت ہے۔ پہلے محبت کرتے ہیں پھر اس کے شعر بنا لیتے ہیں۔

ساری عمر خانہ بدوشی میں گذری ہے ؎ بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔
حسنِ اتفاق سے یہ چھاؤں برسوں تک ہمیں آپ کے شہر میں بھی میسّر آئی ہے اس وجہ سے محبّت اور خلوص کا رشتہ ایک زمانے سے آپ لوگوں کے ساتھ قائم ہے جس کے لئے میں انتہائی شکر گزار ہوں۔ اس دوران میں اچھّے وقت بھی آئے، بُرے وقت بھی آئے، خانہ بمانداز چمن کی طرف سے گل بھی آئے، پتھّر بھی آئے لیکن آپ لوگوں کی اور ہمارے دوسرے دوست احباب کی دوستی اور خلوص میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی اور اُسی کی وجہ سے اپنے دل ودماغ کو تقویت بھی حاصل ہوتی ہے۔

اس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ آج سے پانچ برس پہلے ہمارے سٹھیا جانے کا اعلان پہلی بار آپ ہی کے شہر نے کیا۔ لاہور والوں نے بینسٹھیانے کا قصّہ کیا جس کا سٹھیانے کی طرح کوئی محاورہ اردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ میں نے ان سے پوچھا آپ کو یہ ۶۵ ویں سالگرہ کی تقریب کیوں سوجھی ؟ ہمارے سٹھیانے کے پانچ برس بعد اس قصّے کو چھیڑنے کا خیال کیوں آیا ؟ انھوں نے بتایا کہ یہ دستور مغرب کا ہے۔ جہاں سمجھا جاتا ہے کہ ان کے لوگ سخت جان ہیں اور پہلے پچاس برس تک ان کی زندگی کی پوری پوری امیّد رکھی جاتی ہے اہلِ مغرب ایک تقریب تو کرتے ہیں ۲۵ ویں برس پر۔ پھر دوسری تقریب کرتے ہیں ۲۵ برس کے وقفے کے بعد اور پچاس برس کے ہوجانے پر۔ پچاس برس کی عمر کو پہنچ جانے پر پھر شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ حضرت بہت زیادہ نہ جی سکیں گے۔ اس لئے وقفے کی مدّت گھٹا کر دس برس کر کے تیسری تقریب ساٹھویں سالگرہ کی کرتے ہیں۔ اس کے بعد عمر کے تعلق سے بے اعتمادی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اس لئے وقفے کو مزید گھٹا کر پانچ برس کر دیتے ہیں یعنی ۶۵ ویں سالگرہ۔ جب یہ حضرت ستّر برس کے ہوجاتے ہیں تو سب سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے چل چلاؤ کا زمانہ قریب آگیا ہے اس لئے سال بسال تقریب کی جاتی ہے۔ لاہور والوں کی یہ توجیہہ غالباً صحیح ہوگی۔

مل بیٹھنے، یک جان ہونے اور لطفِ صحبّت کے لئے کوئی بہانہ یا عذر ملے اُسے ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے اس تقریب کا جو اہتمام کیا ہے اس میں مجھ سے اظہارِ محبّت کے علاوہ یک جان ہونے اور محفل برپا کرنے کا جذبہ بھی شامل ہے اور میں اس میں ہر طرح آپکے ساتھ ہوں۔

مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ میں اپنے تجربات اور مشاہدات پر تقریر کروں۔ ہمارے تجربات اور مشاہدات میں یا جو کچھ ہمارے دل پہ گزرتی ہے اس میں کوئی ایسی نئی بات تو ہے نہیں جو میں آپ کو سناؤں۔ اس لئے کہ بیشتر اوقات شعر کے اندر اور نثر کی صورت میں وہ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔

میں نے اس سے پہلے اور بار بار عرض کیا ہے کہ اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اور وحشت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ دنیا کے جتنے بور لوگ ہیں ان کا سب سے محبوب مشغلہ یہی ہے کہ وہ اپنے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

بڑھاپے کی عمر کو انگریزی میں ڈوٹیج کہتے ہیں۔ ڈزرائیلی بہت بڑے انگریز مدبّر اور ادیب گذرے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہ اصل میں ڈوٹیج نہیں بلکہ انیک ڈوٹیج کی عمر ہے۔ جب لوگ اپنے انیک ڈوٹس بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں تو سمجھ لیں کہ ان پر بڑھاپا طاری ہو گیا ہے۔ ہم بڑھاپے سے ہار ماننے کو تیار نہیں ہیں اس لئے آپ کو انیک ڈوٹس نہیں سنائیں گے بلکہ تازہ غزل جو کل ہی کہی ہے اور ابھی تک کسی نے نہیں سُنی ہے۔

حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشتِ امید میں گرداں ہیں دوانے کب سے
دیر سے آنکھ پہ اترا نہیں اشکوں کا عذاب
اپنے ذمّے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے
کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے
سُر کرو ساز کہ چھیڑیں کوئی دل سوز غزل
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے کب سے (حالی)
پُر کرو جام کہ شاید ہو اسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اک تیر قضا نے کب سے
فیضؔ کب پھر کسی مقتل میں کریں گے آباد
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے

(۱۶ اپریل ۱۹۷۶ء)

میزانِ سخن

ڈاکٹر سلیم اختر

معتدل گرمیٔ گفتار کا غزل گو

ہے فقط مرغِ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں!

حالیؔ نے پہلی مرتبہ غزل میں طرح نو ڈالتے ہوئے اُسے عشق و عاشقی کے مخصوص تصورات کے طلسم ہوشربا سے نکال کر قومی شعور اور ملی درد سے آشنا کیا۔ گو اکثر گاہک بے خبر تھے۔ لیکن حالیؔ کو مال کی نایابی کا احساس تھا اور یہ بھی کہ شہر میں حالیؔ نے کھولی ہے دکاں سب سے الگ۔ آج حالیؔ کی ان غزلوں کی اور کسی وجہ سے اہمیت ہو یا نہ ہو وہ کم از کم اس بناء پر اہم ہیں کہ ان غزلوں کی صورت میں اردو غزل بے مقصد ماورائیت سے نکل کر پہلی مرتبہ مقصد پسندی کی طرف مائلِ پرواز نظر آتی ہے۔ حالیؔ کی ان غزلوں کی اہمیت اس بناء پر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اقبالؔ نے غزل کے اس روپ کو پسند کیا اور یوں اسے قوم کے نام پیغام اور ملی فلسفے کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس سے وابستہ شعراء نے بھی غزل کے اس پہلو کی طرف زیادہ توجہ دی۔ بعض حضرات کی دانست میں مقصدیت سے غزل میں تغزل نہیں رہتا۔ لیکن یہ اعتراض اتنا وزنی نہیں کیوں کہ تغزل موضوع کی نہیں بلکہ اظہار کی خصوصیت ہے اور اچھے شاعروں نے ان دونوں کے نقطۂ توازن کو فن کارانہ شعور سے برقرار رکھا ہے۔

حالیؔ کے بعد سے عام عاشقانہ روش کے ساتھ ساتھ اردو غزل ایک نئے راستے کی طرف گامزن نظر آتی ہے۔ ایک راستہ اقبالؔ کا تھا جس پر وہ یقیناً گامزن

نظر آتا ہے تو دوسرا ترقی پسند ادب کی تحریک کا۔ اساسی لحاظ سے دونوں میں فرق نہ تھا کہ دونوں صورتوں میں غزل مقصدِ خاص کے ابلاغ کا وسیلہ بنتی ہے۔ گو نقطۂ نظر کے فرق سے بعض اوقات اقبالؔ کی غزل اور ترقی پسندانہ غزل جداگانہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ فروعی اور اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے ہاں غزل پرانی کینچلی اتار کر بے معنی عشق کی گراں خوابی سے بیدار ہوتی نظر آتی ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ وہ تناظر ہے۔ جس میں فیضؔ کی غزل کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ فیضؔ نے زمانۂ طالب علمی ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ فیضؔ کے اپنے الفاظ میں

"شعر گوئی کا کوئی واحد عذرِ گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گرد و پیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگن سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۲۹ - ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کی تحریریں شامل ہیں جو ہماری طالب العلمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گذر جایا کرتا ہے۔" (دست نگ، ص: ۱۶)

زمانۂ طالب علمی میں شعر گوئی کی تحریک کسی جذباتی حادثے کے باعث تھی یا اس "حادثہ" کی یادگار ایک نظم "نذر..." (مطبوعہ: راوی نمبر ۲ ۱۹۳۲ء) ملتی ہے جس پر مدیر راوی نے حاشیہ میں یہ نوٹ لکھا "جی چاہتا ہے ایک نام لکھ دوں"۔ یہ نظم "نقشِ فریادی" میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے تاریخی دلچسپی ریکارڈ اور فیضؔ کی یاد دہانی کے لئے درج کرتا ہوں۔

طرب زارِ تخیل شوق، رنگین کار کی دنیا
مرے افکار کی جنت مرے اشعار کی دنیا
شبِ مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی
تمہاری دل نشیں آواز میں آرام کرتی ہے
بہار آغوش میں لپٹی ہوئی رنگینیاں لے کر
تمہارے خندۂ گل ریز کو بدنام کرتی ہے

تمہاری عنبریں زلفوں میں لاکھوں فتنے آوارہ
تمہاری ہر نظر سے سینکڑوں ساغر چھلکتے ہیں
تمہارا دل حسیں جذبوں سے یوں آباد ہو گویا
شفق زارِ جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں
جہانِ آرزو پر بے رخی دیکھی نہیں جاتی

فطری شاعر کو تو ہر لحاظ سے اظہار کرنا ہی تھا۔ وجہ جو بھی ہو لیکن یہ ہے کہ فیض نے بھی غالب اور اقبال کی مانند کم عمری سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ان کے بچپن کا کلام تو دستیاب نہیں البتہ گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلہ "راوی" کے ۴ ۳ ، ۱۹۲۹ء کے پرچے دیکھنے پر فیض کی ابتدائی شعری کاوشوں کے نقوش مل جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں اور غزلیں "نقش فریادی" میں شامل ہیں۔ باقی متروک کلام ان پرچوں میں محفوظ ہو گیا ہے۔ چنانچہ سال سوم میں فیض ایسے اشعار کہہ رہے تھے ۔

تنہائی دل افروز ہو میں ہوں تُو ہو
چاندنی رات ہو، خاموش کنار جو ہو
ایک ہو جائیں خموشی میں ہماری روحیں
جیسے دو پھول ہوں اور ایک ہی خوشبو ہو[1]
مرے نالوں سے امشب پوچھتی تھی انکی معصومی
کوئی کیوں رات کی خاموشیوں میں اٹھ کے روتا ہوں[2]

اس کے بعد کے متروک اشعار ملاحظہ ہوں۔

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گذرتی جاتی ہے[3]

---

(۱) راوی، اکتوبر ۱۹۲۹ء (۲) راوی دسمبر ۱۹۲۹ء، (۳) راوی ۱۹۳۲ء

موت ؟ مجبورِ تمنا کی بہشتِ آرزو !!
زندگی دکھے دلوں کی دکھ بھری فریادی ہے
یاد ہے وہ سر کہ جس میں اب ترا سودا نہیں
عشرتِ جاوید وہ دل جس میں تیری یاد ہے[1]

راوی (اکتوبر، ۱۹۳۲ء) کے شمارے میں فیض کی دو غزلیں چھپی ہیں جن میں سے یہ غزل "نقشِ فریادی" میں ہے ؎

ہر حقیقت مجاز ہو جائے ۔۔۔ کافروں کی نماز ہو جائے

اور یہ غزل شامل نہیں ہے ؎

شباب کو مئے الفت کی احتیاج سہی ۔۔۔ بساطِ دہر پہ جور و ستم کا راج سہی
یہ مانا نگہِ طلب سرفرازِ دہر نہیں ۔۔۔ اک آرزو ہے سو شرمندۂ امید نہیں
ٹھہر ٹھہر دلِ بے تاب آخرش کب تک ۔۔۔ کبھی تو سوختہ جانوں کو نیند آئے گی

شاید ان طالب علمانہ شعری کاوشوں کی اس زمانے میں اتنی اہمیت نہ ہو گی لیکن آج یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار اس بنا پر اہم ہو جاتے ہیں کہ مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں فیض میں فنی پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ فنی پختگی بذاتِ خود کوئی اہم خصوصیت نہیں۔ کم از کم فیض ایسے شاعر کے لئے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں سے محض فنی پختگی کی بنا پر ہی ممتاز نہیں ہوئے۔ اس دور کے یہ اشعار آج اس لئے اہم ہیں کہ ان میں وہ مخصوص لہجہ ملتا ہے جس نے بعد میں ان کی غزل میں فنی نکھار کے بعد اپنا منفرد رنگ پیدا کیا۔ اس لئے یہ اشعار محض "نوادرات" کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہر چند کہ فیض کا ان میں گھٹنوں چلنا محسوس ہوتا ہے۔ ویسے بھی بی اے کے بعد کے فیض آج کے فیض کے ہم سبق نظر آتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس دور میں فیض یہ نظمیں لکھ چکے تھے۔ "خدا وہ وقت نہ لائے" (۱۹۳۱ء)، "سرودِ شبانہ" (۱۹۳۲ء)، "اقبال" (۱۹۳۲ء) اور "اعتراف" (۱۹۳۴ء) "نقشِ فریادی" میں درج یہ شعر ۱۹۳۱ء کا ہے۔

---

(۱) راوی، دسمبر ۱۹۳۲ء

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے

گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

ابتدائی شاعری کی ان کاوشوں کے فنی منصب سے قطع نظر یہ طے ہے کہ فیض نے نسبتاً کم تعداد میں غزلیں لکھ کر بھی اپنے لئے بحیثیت غزل گو وہ منفرد مقام بنایا کہ پاک و ہند کے صاحب طرز غزل گو شعراء میں شمار ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے مخصوص اسلوب اور طرز ادا سے انہوں نے ہمعصر غزل کے امکانات میں اضافہ بھی کیا لیکن ایک بات ہے کہ ترقی پسند غزل سے وابستہ مخصوص علامات اور اسالیب کے تناظر میں فیض کی غزل اپنی تمام خوبیوں اور تغزل کے باوجود ترقی پسند غزل کے مخصوص مزاج سے عاری نظر آتی ہے۔ یہ خوبی ہو سکتی ہے اور خامی بھی۔ اس کا انحصار دیکھنے والے کی نگاہ پر ہوگا۔ اسے یوں سمجھئے کہ غالب کا یہ مشہور ے

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پڑھ کر کیا ذہن فیض کے اس شعر کی طرف نہیں جاتا؟

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

سوال یہ ہے کہ غالب نے فیض کو (ANTICIPATE) کیا یا فیض نے غالب کی پیروی کی؟ یہ صرف ایک شعر کی بات نہیں بلکہ ایک جذبے کی مشابہت کا مسئلہ ہے۔ اگر دونوں ایک خاص صورت حال میں ایک طرح سے سوچ سکتے ہیں تو یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر غالب ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہوتا؟ یا فیض سسکتی مغل حکومت کے سربراہ کے "استاد شاہ" ہوتے تو کیا رنگ سخن اپناتے؟ اسے محض۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عصری سوچ کو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے یا اپنی انفرادیت کے اظہار (یا پھر عدم اظہار) کا مسئلہ ہے۔

فیض کے ضمن میں یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اپنی تمام انقلابی سوچ اور انقلابی

انکار کے باوصف انہوں نے غزل کے کلاسیکی اسلوب کو ترک نہیں کیا بلکہ فارسی تراکیب اور کسی حد تک مفرّس دلکشی کی بناء پر وہ غالبؔ کی طرزِ ادا کے خاصے قریب نظر آتے ہیں۔ وہ کلاسیکی اسلوب کے اس حد تک رسیا ہیں کہ نظمیں بعض اوقات غزل اور وہ بھی غالبؔ کی غزل معلوم ہوتی ہیں۔ فیضؔ کا یہ مصرع

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

بالکل غالبؔ کی زبان کا حامل ہے (یہ محض مثال کے لئے ہے اسی انداز سے فیضؔ کا مطالعہ ایک جداگانہ مضمون کا متقاضی ہے)

جس عہد میں فیضؔ کے ادبی شعور نے آنکھیں کھولیں اس میں اقبالؔ کی قومی شاعری اور معربِ اسلوب کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی کی گیت نما نظموں اور عذرا اور سلمیٰ کا چرچا تھا۔ اس عہد کے نوجوان شعراء کے لئے ایک طرف "شاعرِ اسلام" اور دوسری طرف "شاعرِ رومان" کی صورت میں دو قوی مقناطیس موجود تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ فیضؔ نے شعوری طور سے خود کو دونوں اثرات سے بچائے رکھا۔ اختر شیرانی کی سطحی رومانیت کی کشش عارضی تھی اور اقبالؔ تو اپنی ذات میں نظم (اور کسی حد تک غزل) کے تمام امکانات کو یوں جمع کر چکے تھے کہ ان کا تتبع سودمند ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ان کی زندگی میں "اقبالؔ" پر نظم لکھنے کے باوجود وہ موضوعات اور اسالیب دونوں کے لحاظ سے ان سے غیر متاثر نظر آتے ہیں۔

نقشِ فریادی کی غزلوں میں فیضؔ نے خود کو غزل کے عام موضوعات تک محدود رکھا چند مثالیں پیش ہیں۔

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز	عشق منت کشِ فسونِ نیاز
تیری رنجش کی انتہا معلوم	حسرتوں کا مری شمار نہیں
عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ	کاش افشائے راز ہو جائے
چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے	دستِ قدرت کو بے اثر کر دے
یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لئے آخر	سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

آپ سے دل لگ کے دیکھ لیا　　　　اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے　　　　تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے

یہ اور اسی انداز کے اشعار کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ غزل میں چند استثنائی اشعار سے قطع نظر فیضؔ ایک روایتی غزل گو کی مانند معاملاتِ حسن و عشق اور وارداتِ قلب کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ اسی مجموعے میں ان کی یہ نظمیں بھی شامل ہیں

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

"چند روز اور مری جان"، "کتے"، "بول" اور "موضوعِ سخن"۔ ان نظموں میں فن کی اساس مقصدیت پر استوار ہے۔ یہ نظمیں اس عہد کے مروج ترقی پسند شعری نظریے کی زندہ تفسیریں ہیں۔

نقشِ فریادی میں فیضؔ کی غزل اور نظم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے ان دونوں کی صورت میں اپنی تخلیقی شخصیت کو دو لخت کر لیا۔ اس حد تک کہ نظم گو فیضؔ اور غزل گو فیضؔ ایک ندی کے دو کناروں پر ایک دوسرے سے دُور دُور کھڑے نظر آتے ہیں۔ بعض مواقع پر اسلوب ان دونوں کناروں پر پل کا کام کر جاتا ہے ورنہ دونوں اپنی اپنی حیثیت میں منفرد نظر آتے ہیں۔ نظم کو انہوں نے خارجی دنیا کے غم والم اور اجتماعی دکھ درد کے لئے وقف رکھا تو غزل ذات کے اظہار اور دل کی دنیا کے لئے مخصوص رہی۔ ترقی پسند ادب کی تحریک میں جس شد و مد کے ساتھ خارجیت پر زور دیا جاتا رہا ہے اور داخلیت جس طرح قابلِ مذمت گردانی گئی ہے اسے ملحوظ رکھ کر فیضؔ کی غزل دیکھیں۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ انہوں نے اپنی تمام نظمیں "دوسروں" کے لئے وقف کر دینے کے باوجود غزل کی صورت میں ایک گوشہ اپنے دل کے لئے بھی محفوظ رکھا۔ فیضؔ نے "دستِ صبا" کے ابتدائیہ میں لکھا ہے۔

"شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلاحیت اور لہو کی

حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔"

یہ خالص ترقی پسندانہ سوچ ہے اور ان کی بیشتر نظموں کی تفہیم کے لئے روشنی کا ماخذ لیکن غزلوں میں فیضؔ نے نظموں کی مانند واشگاف انداز اپنانے کے برعکس انہیں غزل کے کلاسیکی آہنگ اور مخصوص اسلوب میں یوں بیان کیا، بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ یوں چھپایا کہ شعر میں معنی کی تہ داری پیدا ہو گئی۔ یہ انداز غیر محسوس کن طور پر ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ نمایاں تر ہوتا گیا ہے۔ دستِ صبا کی غزلوں سے اشعار میں معانی کی ان دو جہات کا رنگ گہرا ہونا شروع ہوتا ہے اور بعد کے مجموعوں میں یہ مزید پختگی پکڑتا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں نقشِ فریادی کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے جذبے کی جس دو رنگی کا احساس ہوتا تھا، وہ یک رنگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دستِ تہِ سنگ اور زندان نامہ میں فیضؔ کی غزل بھی اسی جذبے میں رنگی ہوئی ملتی ہے جس نے نظموں میں اظہار پایا۔

دستِ صبا کے یہ اشعار اس سلسلہ میں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے ۔۔۔ تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری ۔۔۔ فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی ۔۔۔ کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو ۔۔۔ عشق کے دم قدم کی بات کرو

جنوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا ۔۔۔ پوچھتی ہے گذر اس بار کروں یا نہ کروں

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے　　　　تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید　　　　گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

ان اشعار میں فیضؔ نے خارجی زندگی کی تلخیوں کی شدت کو تغزل سے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لئے اپنے بعض اور ہمعصروں کی مانند فیضؔ نے بھی غزل کے مخصوص علائم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ قدیم اردو غزل نے آج کے جدید غزل گو کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو اتنا ضرور ہے کہ گل و بلبل، کنج و قفس مجنوں و صحرا اور رقیب و محتسب وغیرہ ایسے الفاظ اور ان سے وابستہ تلازمات کے جو سلسلے ملتے ہیں۔ ان کی بنا پر ان الفاظ کے استعمال سے ہر نوع کے معانی کی جہات کے در وا کئے جا سکتے ہیں۔ فیضؔ نے بھی غزل میں اظہار کی اس صورت سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ فیضؔ اور بعض دیگر غزل گو ترقی پسند شعراء کی غزلوں سے یہ نکتہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جہاں اپنے پیغام کی ترسیل اور ابلاغِ مقاصد کے لئے نظموں میں نئی علامات اور اشارات وضع کئے گئے وہاں غزل میں پرانی علامات اور مقبول اشارات سے بھی کام چلایا۔ چنانچہ فیضؔ نے ایام اسیری کی غزلیات میں غزل کے اس مخصوص اظہار سے وابستہ سہولتوں سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھایا۔ اور فیضؔ کے لئے یہ مشکل بھی نہ تھا کہ ان کا فنِ شعور غزل کی کلاسیکی روایات میں یوں رنگا ہے کہ اظہار کی ہر منزل ان کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ فیضؔ کے اشعار ہیں اور جیل میں لکھے گئے تھے تو انہیں کسی بھی کلاسیکی استاد کا کلام سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب، جرمِ سخن سے پہلے

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی　　　　درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے　　　　ہم ان سے رشتۂ دل استوار رکھتے ہیں

در وہی ہے تو آستاں ہے وہی　　　جان وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

یہ سب مثالیں زنداں نامہ سے لی گئی ہیں اور ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ دست تہ سنگ میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں۔ ان اشعار کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ فیض کی غزل کی اساسی صنعت ان کا انقلابی نعرہ نہیں بلکہ وہ شاعرانہ لہجہ ہے جس سے وہ انقلابی نعرہ کو کیمو فلاج کرتے ہیں اور تغزل کا وہ آہنگ ہے جس سے وہ تلخ حقائق کی "کرختگی" کو ملائم کرتے ہیں۔ عشق کی طرح انقلاب بھی ایک بخار بلکہ بعض صورتوں میں تو ایک ایسا متعدی بخار ہوتا ہے کہ یہ اظہار نہ پائے تو فرد اندر ہی اندر سلگتا ہے۔ لیکن اظہار پانے پر، ہر نوع کے پیرائے اظہار اپنانے پر بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ یہ احساس زیادہ شدید ہو تو اعصاب کے جنون پر منتج ہوتا ہے۔ اسی سے عام صلاحیتوں اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں والے فن کاروں میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ عام شاعر جذبے کے جس سیلاب میں بے بس تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔ اعلیٰ فنکار اپنے تخلیقی شعور سے اس بپھرے جذبے کو گویا پابہ زنجیر کر دیتا ہے۔ اسے یوں سمجھیئے گویا بند باندھ کر وافر پانی کا ذخیرہ کر لیا اور پھر حسب منشا اس سے کام لیتے رہے۔ اس کے نتیجے میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل فنکار میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی اور اس کے ہنگاموں سے منقطع بھی نہیں ہوتا لیکن یہ اس کی تخلیقی شخصیت کا اعجاز ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے بھنور میں ہونے کے باوجود بھی "طوفان کی آنکھ" کی مانند اپنے گرد سکون کا ایک دائرہ بنائے رکھتا ہے سکون کا یہ دائرہ اس کے فن سے تشکیل پاتا ہے سا اور اس کے نتیجے میں مصاف زیست میں شامل ہونے کے ساتھ وہ خود کو اس پیکار سے بلند تر محسوس کرتے ہوئے جس تجربے سے خود گذر رہا ہوتا ہے اپنی بلند سطح سے وہ "دوسرے آدمی" کی طرح اسی کا ادراک اور پھر تجزیہ بھی کرتا جاتا ہے۔ فیض کی غزل میں یہی خوبی نظر آتی ہے اور طوفان بداماں ہونے کے باوجود بھی ان میں "طوفان کی آنکھ" ایسا سکون پایا جاتا ہے۔

سید حرمت الاکرام

فیضِ خوشنوا

'حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک' اور اس جدوجہد میں
حسبِ توفیق شرکت' زندگی کا ہی تقاضا نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی
زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اِسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے'۔

یہ خیال خود فیض احمد فیضؔ کا ہے جس کا اظہار انھوں نے دستِ صبا کے ابتدائیہ
میں کیا ہے اور اسی ابتدائیہ میں انھوں نے ذیل کی سطور بھی سپردِ قلم کی ہیں :

"شاعر یا ادیب کو قطرہ میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں، دکھانا بھی ہوتا
ہے'یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں' مجاہدہ بھی اس پر فرض
ہے'گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی
بینائی پر ہے' اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر' اس کے بہاؤ
میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ہے"

فیضؔ نے اپنے نظریہ کی روشنی میں شاعر یا ادیب کی عملی زندگی کا رخ متعین کرنے
کی کوشش کی ہے وہ فن کار کی بینائی اور فنی دسترس کے دوش بدوش اس کے شوق کی
صلابت اور لہو کی حرارت کی بھی آزمائش چاہتے ہیں اور اس کی جدوجہد کو محض مشاہدہ
تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ مجاہدہ کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اس باب میں وہ اپنی زندگی

کے اُن شب و روز کو مثال بنا سکتے ہیں جو سلاخوں کے پیچھے گزرے ہیں اور جن کی یادگار 'زنداں نامہ' کی شکل میں مردانِ کار کا لہو گرماتی رہتی ہے۔

فیض اشتراکی لشکر کے ایک سرفروش سپاہی ہیں اور انھوں نے 'محنت و سرمایہ' کی جنگ میں تیغ و تلوار سے نہ سہی لیکن جسمانی سختیاں جھیل کر ضرور حصّہ لیا ہے جس کی کڑیاں عمل کے مختلف شعبوں سے قید و بند کی حدود تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فیض اپنی سخت کوشی اور صف آرائی پر نازاں بھی ہیں اور اپنے دوسرے ہم سخنوں اور ہمنواؤں سے اس مجاہدہ میں شرکت کی توقع بھی رکھتے ہیں جس پر بحث نہیں کی جا سکتی لیکن فیض کے اس نظریہ کو اہل فن کی ذاتی اور عملی زندگی کا جزو کس حد تک بنایا جا سکتا ہے اور بنایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں، یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔

فیض کی شاعری پر ان کی اسیری نے کس حد تک اور کس کس پیرائے میں اثر ڈالا ہے اس کی صراحت کے لیے 'زنداں نامہ' کے صفحات کافی ہیں۔ جیل کی ابتدائی زندگی نے ان کی جن نظموں کو جنم دیا، ان میں اضطراب و ہیجان کی خروش انگیزی بڑی نمایاں ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن میعادِ اسیری کی طوالت کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات میں جس قدر ٹھہراؤ آتا گیا، ان کی شاعری کی سطح بھی اسی نسبت سے پُرسکون ہوتی گئی، اگرچہ اس کی تہ میں کروٹیں لینے والا تموّج اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے بڑھتا گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی نگاہیں رفتہ رفتہ زندانِ بلا کے در و بام اور ان کی سانسیں اس کی اندرونی گھٹن سے مانوس ہوتی گئیں اور بعض مواقع پر یہ صورت پیش بھی آتی ہے مگر اسے فیض پر منطبق نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذبات کا وہ لاوا جو اوّل اوّل احساسات کے جوالا مکھی سے نطق کی وادیوں تک بیک جست پہنچ جاتا تھا، کچھ روز گزرنے کے بعد درمیان کے کئی مراحل کا پابند ہو گیا جہاں تخلیقی عمل کی شعلگی تھم تھم کر چلنا اور سانچے میں ڈھلنا سیکھتی ہے۔

فیض نے 'دستِ صبا' کا آغاز ذیل کے قطعہ سے کیا ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے ۔۔۔ کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ۔۔۔ ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

لائل پور اور سرگودھا کے جیلوں میں فیض کو تین ماہ کی جس قیدِ تنہائی سے دوچار ہونا پڑا، اس میں ان کے لیے کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار اور خطوط تمام چیزیں ممنوع تھیں، جس کے پیشِ نظر اس قید کی صبر آزمائیوں کا تصوّر اور اسے بیرونی دنیا سے ان کے ذہن کا رشتہ زیادہ سے زیادہ منقطع کرنے کی کوشش نیز اس کی نوعیت کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ یہ قطعہ اسی قیدِ تنہائی کی یادگار ہے۔ چنانچہ خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے اور حلقۂ زنجیر میں زبان رکھنے کی داد فیض کو لازماً دی جائے گی لیکن ہماری نظر اس فیض کے چہرہ پر پہلے پڑے گی جو شاعر ہے، مجاہد یا سپاہی فیض کو بعد کا درجہ دیا جائے گا اور میرا خیال ہے کہ فیض خود اپنی نظر میں شاعر پہلے ہیں۔ مجاہد، سپاہی یا لیڈر بعد میں۔ چونکہ وہ اپنی شاعرانہ حیثیت کو پس پشت ڈالتے یا اسے ثانوی درجہ دیتے ہوئے نظر آئے تو یہ ہمارے واسطے ایک لمحۂ فکریہ ہوگا۔ لمحۂ فکریہ اس لیے کہ فیض، فن کی قیمت اور فن کار کے منصب سے آگاہ ہیں یا نہیں، جس کا جواب نفی میں ممکن نہیں۔

وہ اب تک ہمیں اپنی شعری نگارشات کے تین[1] مجموعے دے چکے ہیں، 'نقشِ فریادی' 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ'۔ 'نقشِ فریادی' ان کا اوّلین مجموعۂ کلام ہے جس میں وہ 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' کا راگ چھیڑنے کے ساتھ ہی رقیب سے بھی ہمکلام نظر آتے ہیں اور 'غمِ الفت' کے 'احسانِ مشترک' کا فسانہ دہرا کر دل کے زخموں کو کریدتے ہیں۔ کہ وہ

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے   کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

کے مرحلے میں ملتے ہیں اور 'گاہ ہائے اُس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط' کی مدہوش کن فضا میں رقص کناں پائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھیں ان موضوعات کو 'طبعِ شاعر کا وطن' قرار دینے کا اعلان کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ان کا شاعرانہ شعور آگے بڑھتا ہوا ضرور ملتا ہے لیکن 'لغزشِ مستانہ' ہر حال میں ان کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ مڑ مڑ کر اُن نقوش اور

---

[1] فیض کے مجموعوں کی تعداد اب سات ہوگئی ہے۔ م ط ح

اُن مراحل پر نظر ڈالتے جاتے ہیں جو غم جاناں کی دین ہیں - کوئے جاناں کی گرد ان کے دامن سے پہلے ہی کی طرح لپٹی ہوئی ملتی ہے - یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہر قدم پر مچل اٹھتا ہے اور خوشگوار یادوں کا فسوں انھیں اکثر تڑپاتا رہتا ہے، البتہ یہ اثرات بتدریج مدہم اور ہلکے ہوتے جاتے ہیں اور فیض

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

کا نغمہ الاپتے ہوئے 'دست صبا' کی وادیوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے شاعرانہ خط و خال بڑی حد تک متغیر پائے جاتے ہیں - ان کے دامن پر کوئے محبوب کی گرد کے اکھڑے اکھڑے ہوئے نقوش تو نظر آتے ہیں لیکن گرد کی تہیں نہیں ملتیں، 'دست صبا' میں وہ 'لغزش مستانہ' بھی کم یا بہت کم ملتی ہے جو انھیں بار بار رکنے، مڑ کر پیچھے دیکھنے اور دم لینے پر مجبور کرتی تھی - اب ان کے قدموں میں ضبط و استحکام ملتا ہے اور عزم راہ نوردی کی چھوٹ دُور دُور تک پڑتی ہے - 'زنداں نامہ' کی بیشتر نگارشات عالمِ اسیری کی تخلیق ہیں جس کے نقوش و اثرات بڑے گہرے ہیں، ان نظموں میں شدائد کا احساس بھی پورے طور پر ملتا ہے لیکن لہجہ میں کم حوصلگی یا پسپائی کہیں نہیں آنے پاتی -

'درد آئے گا دبے پاؤں'، 'دریچہ'، 'یہ فصل امیدوں کی ہمدم'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' اور 'ملاقات' میں ان کی جواں عزمی و جگرداری افق فردا کی تابناکیوں کو آواز دیتی ہے نیز اس آواز کی جانب عوامی قافلے کو بلاتی اور لاتی ہے - قید و بند کے شعلہ زاروں سے ان کی جو آواز ہم تک پہنچی ہے اس میں حسرت و حرماں، سوز و درد کی مختلف کیفیات تو وہی ہیں جنھیں ان کی شاعری کے اساسی و علامتی عناصر میں شمار کیا جاتا ہے لیکن ان میں فیض کے مجاہدانہ تیور کا تیکھا پن زیادہ محسوس و نمایاں ہے - چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں | ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ | جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے
کرے کوئی تیغ کا نظارہ اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے ہیں

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی برا کیا
ہم سے جہاں میں کشتۂ غم اور کیا نہ تھے
گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پرخوں کا ہنر تو دیکھو

یہ ظاہر ہے کہ ان کے ہونٹوں سے وہی بانسری لگی ہوئی ہے جو کوئے محبوب میں
ان کے ساتھ تھی اور ان کی لے بھی وہی ہے مگر نغمے بدل گئے ہیں اور وہ اس بانسری پر پیار

کے نہیں، انقلاب کے گیت گاتے ہیں۔ یہ بالسری ان کے خزینۂ شعری کی متاعِ بے بہا ہے اور وہ اس کی فن کارانہ قدر وقیمت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ اپنی لے کی مٹھاس یا اپنی آواز کی متانت سے دستکش ہونے پر آمادہ نہیں، غالباً اسی لیے کہ یہ ان کی فطرتِ شعری کا جزوِ اوّل ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ایک دور نے جس کی محفل آرائیاں بڑی ہنگامہ خیز تھیں، انقلابی، سیاسی شاعری کو نعروں سے قریب تر کر دیا تھا اور ہر بات زیادہ سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کہنے کی وضع نے شعر کو نہ صرف لوازمِ حسن سے معرا کر دیا تھا بلکہ بعض شاعروں کو بدزبان بھی بنا دیا تھا۔ لیکن افراط وتفریط کی اس حشر انگیزی میں بھی فیض کی لے نہیں بدلی اور ان کے لہجہ کی گھلاوٹ، نرمی اور لطافت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ فیض کے ہونٹوں سے وہی بالسری چپکی رہی اور پھر رفتہ رفتہ سیاسی تغیرات کا کارواں اس موڑ پر پہنچا جہاں نعرہ بازیوں کو غیر ضروری ہی نہیں غیر مستحسن بھی قرار دیا گیا اور اس فیصلے کی تشہیر بھی لازمی متصور کی گئی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فیض کے لہجہ کو مثال بنا کر پیش کیا گیا اور کبھی کبھی اسے ضرورت سے زیادہ سراہا بھی گیا جس میں تنقیدی دیانت کم تھی اور ہنگامی مصلحت اندیشوں کا تناسب بڑھا ہوا تھا۔

فیض، غزل اور نظم دونوں کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے ہیں مگر ان کے لہجہ کی رمزیت دونوں صورتوں میں یکساں برقرار رہتی ہے بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لہجہ کی حلاوت و نشتریت کے ساتھ غزلیہ علامتوں، تلمیحوں اور ترکیبوں کا بانکپن ان کی نظم کو وہی آہنگ و مزاج دے دیتا ہے جو غزل کی اساس ہے۔ ان کے لہجہ کی جدیدیت و جدت کا انحصار ہی غزلیہ روایات و علائم کو نئے معنی اور نیا رنگ دینے پر ہے جس سے ان کی آواز کے تاثر کو معنوی پھیلاؤ اور رچاؤ ملتا ہے، وہ نئے مسائل میں اجنبیت نہیں پیدا ہونے دیتے بلکہ ان کو ذہن کے قریب لانے میں اپنی دھیمی لے سے بڑا کام لیتے ہیں لیکن بعض اوقات اور بعض معنوں میں یہ ایمائیت ایک متضاد کیفیت پیش کرتی ہے اور ان کی فن کاری کو آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔

فیض کی فنی وضع میں جامہ زیبی و کجکلاہی کے تہذیبی وقار اور روایتی پندار کی بڑی

دلفریب اور نظر نواز جھلکیاں ملتی ہیں لیکن فیض کا شاعرانہ بانکپن ہی اس وقار اور اس
پندار کو ٹھیس بھی لگاتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں اپنی ظاہری سج دھج کے باوجود اندرونی طور
پر کھوکھلی اور خالی خالی سی ملتی ہیں کیونکہ ان کی معنوی تشکیل و تعمیر کا حق پورے طور پر یا پوری
چابکدستی کے ساتھ ادا نہیں ہو پاتا۔ ان نظموں کے تانے بانے میں ایسا الجھاؤ پایا جاتا
ہے جس کی گرہ کشائی کے لیے راشد اور میراجی کی نظموں کی طرح 'پس منظر' کے چلیپائی معمہ کو
حل کرنا ناگزیر ہے۔ کہیں کہیں ان کی لَے کچھ اکھڑی اکھڑی سی بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور
موقع بہ موقع ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو ابہام کے دھندلکوں کو زیادہ دبیز اور
تہہ در تہہ بناتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات ان کے ذہن میں خود بھی اپنے خط و خال
کو واضح نہیں کر پاتی اور نہ اس فکری صورت گری کا عمل تکمیل کے تدریجی مراحل کو طے کر
پاتا ہے۔

ان کی شاعری کا تاثراتی حسن ایک طرف لہجہ کی رمزیت اور زخم خوردہ غمگینی کا
ممنون ہے تو دوسری جانب اُس کیفیت کے سہارے آگے بڑھتا ہے جسے عموماً از دل
خیزد بر دل ریزد کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ کیفیت جہاں ڈھلے ڈھلائے مصرعوں اور شعروں کو
جنم دیتی ہے وہیں فیض کی فنی و فکری حیثیت کو نقصان پہنچاتی اور مجروح کرتی ہے۔ بلاشبہ
فیض ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دور کے تمام تر سوز و کرب، درد و اضطراب کو شاعری
میں سمیٹ کر اسے گرد و پیش کی نمائندگی کرنے اور حیات انسانی کی عالمگیر کشاکش سے قریب
لانے کی پوری سعی کی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنی سعی میں ہر مقام پر کامیاب بھی ہوں لیکن
یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس ناکامی کا احساس فیض کو ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو یہ فیض
جیسے شاعر کے مقصود فن کے منافی ہے اور اس کی پہلی ضرب ان کی مقصدیت ہی پر پڑتی
ہے کیونکہ وہ اپنے مشاہدہ کو دوسروں تک پہنچانے کا ادعا رکھتے ہیں اور خود انھیں کے
قول کے تحت پیش آمدہ نقوش و مراحل کی منظر کشی کے لیے نطق و لب کی یاوری شرطِ اوّل
ہے جو ہر حال میں ان کی فنی دسترس کی ہمہ گیری کا تقاضا کرتی ہے۔

بایں ہمہ ان کوتاہیوں کی تلافی فیض کی شاعری کے وہ عناصر ایک حد تک کر دیتے ہیں

جن میں نئے شعور کی تابناکی اور کلاسیکی ورثہ کی شائستگی کا بھرپور دخل ہے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت اور مبصرانہ دیانت چٹانوں اور خارزاروں سے حریر و پرنیاں بن کر گزرتی ہے لیکن اپنے اوپر کوئی ضرب یا خراش نہیں آنے دیتی۔ ان کی شاعری میں انقلابی اور سیاسی آوازوں کی گونج کم نہیں ہے لیکن یہ گونج بڑی مختلف نوعیت اور بڑا مختلف انداز رکھتی ہے۔ ان کی شاعری خون کے دریا بہاتی ہے نہ توپوں سے ہولناک شعلے اگلواتی ہے بلکہ نئی زندگی اور نئے نظام کی بشارت نہایت دھیمی لے میں دیتی ہے جس میں ایک رچی ہوئی دردمندی اور کانٹے میں تلے ہوئے خلوص کا گداز ہے۔

فیض ایک نظم 'شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' میں کہتے ہیں:

یہ ساغر شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پہ دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کے بعد ان کی نگاہ معاشی و سماجی حالات کا جائزہ لیتی ہے:

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں

یہاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

'نقشِ فریادی' کے مقدمہ میں ن۔م راشد نے فیض کی شاعری کے متعلق یہ رائے دی ہے :

فیض کسی مرکزی نظریے کا نہیں' صرف احساسات کا شاعر ہے۔ احساسات کی سیمابی ہلچل ہر منزل پر فیض کے ساتھ ہے' اس میں کوئی تغیر آ ہی نہیں سکتا لیکن 'نقشِ فریادی' کی حدود سے آگے بڑھنے کے بعد فیض کی شاعری میں نظریہ پسندی کا پرتو اتنا ہی گہرا اور روشن ہو جاتا ہے جتنی احساس کی پرچھائیاں۔ یہ نظریہ کسی چور دروازے سے داخل نہیں ہوتا اور نہ چپکے سے در آتا ہے بلکہ بڑے نمایاں اور تیکھے انداز سے اپنی جگہ بناتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نظریہ کی نمائش اس طور سے نہیں کی جس طرح کوئی تنگ ظرف اپنے کسی ذی حیثیت مہمان کی نمائش ہمسایوں اور ملنے جلنے والوں میں کرتا ہے بلکہ فیض نے جس قدر وسیع القلبی کے ساتھ اس نظریے کی میزبانی کی' اتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ دوسروں سے اس کا تعارف بھی کرایا۔ نمائش اور تعارف میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ فیض نے اس فرق کو نہ صرف محسوس کیا اور سمجھا بلکہ عملاً برتا بھی۔ یہ نظریہ ان کے لیے ایک مہمان کی طرح قابلِ تکریم ضرور تھا مگر مستوجب نمائش نہیں' چنانچہ انھوں

نے اسے سر آنکھوں پر جگہ دی لیکن اپنی شاعری کو اس کے لیے خانہ خالی نہیں بننے دیا جس پر دیو کا قبضہ ہو جایا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی آواز کبھی بے خانماں ہوئی نہ اس پر پناہ گزینی جیسی کوئی افتاد پڑی۔ فیض کے جمالیاتی شعور میں جس قدر بالیدگی ہے اتنی ہی توانائی بھی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری حالات کے پیچ وخم میں نہ راہ بھولتی ہے نہ ماندگی کا شکار ہوتی ہے بلکہ پوری حوصلہ مندی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے فیض کی پوری شاعری پر ایک حزن آمیز کرب کی ٹھنڈی کہر پھیلی ہوئی ہے جس میں غم ذات اور غم دیگراں، غم جاناں اور غم روزگار بھی سمٹے ہوئے اور اپنے ساتھ ماضی، حال، مستقبل کو سمیٹے ہوئے ملتے ہیں۔ اس حزن آمیز کرب کا جس قدر تعلق ماضی کی راکھ میں دبے ہوئے شراروں سے ہے، اتنا ہی رابطہ حال اور مستقبل کے آتش کدوں سے بھی ہے جن میں لمحوں اور ساعتوں کے شعلے بڑی تیزی سے بھڑک رہے ہیں اور پوری زندگی پہ اپنا پر تو ڈال رہے ہیں، یہ پرتو کبھی کبھی اس لیے بیحد ہولناک ہو جاتا ہے کہ چہار جانب اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور فیض اس اندھیرے سے برسر پیکار ہیں۔

کسی شاعر کی کم گوئی کو خامیوں کی فہرست میں جگہ نہیں دی جا سکتی لیکن فیض کی نظموں کا اختصار بعض صورتوں میں قابل گرفت ضرور ٹھہرتا ہے، یہ ان کی شاعری کے تاثر کو بڑھاتا بھی ہے اور ان کی بات کو تکمیل کی حدود تک پہنچنے سے روکتا بھی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں ایک نوع کا باطنی پھیلاؤ ہے جس کی حدیں تا دور پہنچتی ہیں اور جہاں انھیں اجنبی صورتیں بھی محرم دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ان کے جذبہ کی یگانگت اور اس کی اندرونی تہوں میں چھپی ہوئی دلسوزی وخلوص مندی کے خمیر سے اٹھنے اور ابھرنے والی انسانی اخوت کی دلیل ہے جو ان کی فکر میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی ہے۔ اسی لیے فیض کی غزلوں میں بھی وہی توانائی ہے جو ان کی نظموں میں۔ جہاں ان کی نظموں میں تغزل کا بھرپور اور پرزور رچاؤ ہے وہیں ان کی غزلوں میں حوادث روزگار سے نبرد آزمائی کا عزم محکم جولاں در قصاں پایا جاتا ہے اور یہ توازن وتناسب اُس تپے ہوئے جذبے اور اُس رچے ہوئے احساس سے گزر کر آیا ہے جن

پروقت نے اپنی پوری قوت سے شبخوں مارے ہیں۔ ان کی غزل اپنا رنگ روپ سماجی و معاشی حقائق کے آئینے میں نکھارتی ہے۔ ان کے یہاں فکر کا عمق کم ہے مگر خلوص میں ڈوبی ہوئی صداقت بڑی گہرائیوں تک جاتی ہے۔

دورِ حاضرہ میں جن شعرا نے غزل کے امکانات کو تابناک تر اور وسیع تر بنایا ہے، ان میں فیض کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے، اگرچہ انھوں نے نظم کی طرح غزل کو بھی اپنی بے احتیاطیوں کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری کا مربوط مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ بے احتیاطیاں ان کے مزاج میں پختگی کے ساتھ قدم جما چکی ہیں۔ چنانچہ جہاں انھوں نے اپنی شاعری کے پیکر میں نعرہ بازانہ خروش انگیزیوں کو پیوست نہیں ہونے دیا وہیں بعض دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زبان وفن دونوں کو زیادہ نقصان پہنچایا اور نئی پود کو جو ان کی شاعری سے یک گونہ متاثر ہے، زیادہ گمراہ ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ فیض کا یہ رویہ ان کی شاعری کے وزن ووقار کو کم اور ان کے شاعرانہ مرتبہ کو شدت سے مجروح کرتا ہے۔ لسانی و فنی ضوابط سے انحراف میں فراق و جگر کی غیر ذمہ داری اور آزادہ روی بھی اکثر ہدف تنقید بنتی رہی ہے اور بنتی رہتی ہے لیکن فیض ان سے اس قدر آگے ہیں کہ کوئی موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں ضوابط سے وہ ضوابط مراد نہیں جن کی پابندی محض قدما یا قافیہ پیما شعرا کا حصّہ ہے اور انھیں سے یہ ممکن بھی تھا بلکہ اشارہ ان ضوابط کی جانب ہے جن کی اہمیت دورِ جدید نے بھی تسلیم کی ہے کیونکہ ان کا تعلق براہ راست مذاقِ سلیم سے ہے۔ بہرحال ان کی غزلوں کے چند اور اشعار مندرجہ ذیل ہیں جن سے ان کی آواز کو سمجھنے اور پرکھنے میں مزید سہولت ہوگی:

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف ولب و رخسار کروں یا نہ کروں

جنھیں خبر ہے کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوشنوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے، ترے سربلند کیا کرتے

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

ایک ایک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف ان کے قدم آتے ہیں

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں　　دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے　　تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری　　فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق　　فیضؔ تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

دیکھا جائے تو فیضؔ نے داخلیت سے خارجیت کی جانب قدم بڑھائے ہیں اور ان کی شاعری قد و گیسو کی روایات سے دار و رسن کی حکایات تک پہنچی ہے۔ یہ سفر جو انھوں نے تنہا بھی طے کیا ہے اور ہمراہیوں کے ساتھ بھی بجائے خود بڑا اہم ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے قافلے کی رفاقت و معیت میں بھی تنہا رہے ہیں نیز یہی تنہائی ان کے ذہن کو جلا دیتی رہی ہے اور ان کا فن تاریخ کے موڑوں سے ٹکراتا امروز کی وادیوں تک پہنچا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل

فیض اور غالب

خود میں نے اپنے ایک مضمون[1] میں ضمناً فیض کو غالب سے قریب قرار دیا تھا تو اس سے میری مراد یہی تھی کہ غالب کے تخیل میں تفکر و تعقل کا جو عنصر موجود ہے وہ فیض کے فکری نظام سے زیادہ قریب ہے۔ غالب نے اپنے زمانے کی مجہول روش یعنی قافیہ پیمائی اور محاورہ بندی سے پرہیز کر کے اسی راہ پر چلنا پسند کیا جو طبعاً مناسب تھی، گو انہیں طعنہ ہائے دلخراش کا سامنا رہا اور اس وقت کے نقادوں نے میر و مرزا کے علاوہ ذوق تک کو جھنڈے پر چڑھایا لیکن غالب کے پائے ثبات میں تزلزل[2] نہ آیا اس کی وجہ یہی ہے کہ زندگی کا صحت مند شعور انہیں حاصل تھا اور اجتماعی زندگی کے فطری نشو و نما پر مرزا غالب کی حکیمانہ نظر تھی دوسرے لفظوں میں وہ زندگی کے مادی اقدار کے قدرتی ارتقا کے عمل پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تاریخی عوامل اور عمرانی محرکات کس حد تک مادی نظام انقلاب کے تابع ہوتے ہیں۔ دہلی سے لکھنؤ اور بنارس کے راستے کلکتے تک کا سفر اور کلکتے میں کچھ مدت تک قیام غالب کی زندگی کا غیر معمولی واقعہ ہے۔ جس نے ان کی شخصیت میں انقلاب برپا کر دیا اور اسی سفر نے غالب کے ذہنی اُفق میں ایسی وسعت پیدا کر دی کہ اس کے ڈانڈے ہمارے زمانے سے آملے یوں تو وہ ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

ص۱ مطبوعہ معارف سہیل اور جدید غزل نمبر "فنون" بعنوان جدید اردو غزل کی دو دن بنی
ص۲ "شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن" پران کا غیر متزلزل اعتماد اسی بات کا مظہر ہے۔

کہہ کر عشق کی ارضیت اور انسان کے مادّی وجود کی رفعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن غور کیجئے تو بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے وقت مغلوں کے فرسودہ جاگیردارانہ نظام کو انتہائی صدمہ پہنچا اور تجارت کا سرمایہ دارانہ نظام قائم ہونے لگا۔ گو سرمایہ دارانہ نظام بجائے خود ترقی پسند اقدارِ حیات کی نفی کرتا ہے اس کی بنیاد استحصال پر قائم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ مغلوں کے جاگیردارانہ نظام میں فرد کی معاشرے میں فعال حیثیت باقی نہیں رہتی اور تجارتی نظام خواہ سرمایہ دارانہ ہی کیوں نہ ہو فرد کو فعال بنا دیتا ہے اور مزدور جنم لے لیتا ہے لہذا زندگی میں تیز رفتاری آجاتی ہے۔ معاشرے میں زر کی گردش تیز ہو جاتی ہے اس بناء پر افرادِ معاشرہ خوشحال ہو جاتے ہیں چنانچہ مقابلتہً اس نظام کی بہتری اور افضلیت نے غالبؔ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کا ردِ عمل سر سید کی آثار الصنادید پر تقریظ کی صورت میں ظاہر ہوا جسے سر سید نے اسی وقت قبول کیا جب ۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب کے بعد مطلع صاف ہوا۔

کلکتے کے سفر تک کے وقت غالبؔ کی عمر[۳] ۲۸، ۲۹ سال کی تھی، ٹھیک اسی زمانے میں انہوں نے شمالی ہند میں معاشی اور معاشرتی انقلاب کے دبے پیروں کی چاپ سنی اور سمجھ لیا کہ پورے کا پورا برصغیر جلد یا بدیر اس انقلاب کی لپیٹ میں آیا چاہتا ہے۔ جب ۱۸۴۲ء[۴] میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تو غالبؔ کی عمر ۴۵ سال کی تھی اور اس سولہ سترہ سال کی مدت میں ان کے نظریات اور بھی راسخ ہو چکے تھے کیونکہ مغلیہ دور کا جاگیردارانہ نظام بیمار ہی نہیں انگریزوں کے صنعتی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی نظام کے مقابلے میں جسدِ مردہ بن چکا تھا جس میں دوبارہ روح دوڑانا کسی بخت خاں کے اختیار میں نہ تھا اور نہ کوئی مذہبی تحریک اس کے حق میں دستِ مسیحا کا کام کر سکتی تھی چنانچہ بدیہی نتائج سامنے آگئے اور سر سید سمیت ان کے تمام رفقاء نے مادّی تفوق کے اس نظریے سے اتفاق کر لینے کے بعد معاشرے کی اصلاحات

---

[۳] غالبؔ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ۱۸۲۵ء یا ۱۸۲۶ء میں انہوں نے سفر کلکتہ اختیار کیا۔

[۴] غالبؔ اسی کالج میں پروفیسری کے امیدوار تھے گویا انہیں تعلیم کے ترقی پسندانہ نظریہ کی افادیت کا یقین تھا کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے نتائج کا وہ مطالعہ کر چکے تھے اور دہلی کالج میں پروفیسر رام چندر کی ادارت میں محبِ ہند، فوائد الناظرین اور قران السعدین جو انقلاب برپا کرنے والے تھے ان سے غالبؔ بے خبر نہ تھے۔

کے لئے جو بیڑہ اٹھایا تو ادب کو ترسیل و تبلیغ کا وسیلہ قرار دینا پڑا ادب میں مقصدیت کا تصور اجاگر کیا گیا اور ادب میں نشاۃ الثانیہ اسی مقصدیت کی منت پذیر ہے غالب کی عظمت یہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء کو ادبی منشور کا خام مواد انہوں نے اس خونیں انقلاب سے بہت پہلے مہیا کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ غالب سمجھتے تھے کہ انگریزوں کے پاس صنعت و سائنس ہی نہیں زیادہ ترقی یافتہ اسلحہ بھی ہے۔

فیض کے بارے میں ان خطوط پر سوچنا غالباً قبل از وقت ہے۔ لیکن ان کے ادبی آثار کو ملحوظ رکھیئے اور ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے تو بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ جنہیں رمز و کنایہ کی زبان میں سمجھنے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں بین السطور نثری تحاریر میں تو کسی قدر قطعیت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اشعار کے بین السطور کا مطالعہ بقدر ظرف آگہی استنباط و استخراج پر منحصر ہوتا ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ فیض کی متدین شخصیت کا فکری رچاؤ اور اس کا دھیما مزاج قدم قدم پہ راہیں مسدود کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ فنی عجز نہیں ہے بلکہ فنی حسن ہے اور اسے سمجھنے کے لئے فیض کے مزاج اور ان کی فنی انفرادیت کا سمجھنا ضروری ہے۔

غالب کے مزاج میں کبھی کبھار وصول دھیا بھی نظر آتا ہے فیض کے متعلق جس قدر معلومات فراہم ہوئے، ان میں کوئی بات ایسی نظر ہی نہیں آتی جو ذوق سلیم پر گراں گذرے۔ غالب کے مزاج کی شگفتگی تو فیض کے یہاں ضرور ہے لیکن ظرافت کا وہ عنصر جو غالب کی شخصیت میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے وہ فیض کے یہاں مطلقاً موجود نہیں ہے۔

باعتبار شخصیات غالب اور فیض میں متعدد فرق ہیں غالب کا بچپن ناز و نعم میں گذرا اور آگرہ کے فوجی چھاؤنی ہونے کے باوجود اس شہر میں جگہ جگہ پر قمار خانے شراب خانے وغیرہ تھے ہوئے تھے اور اخلاق باختہ فوجی سپاہیوں نے جو ماحول پیدا کر رکھا تھا غالب کا ذہن اسی ماحول سے اثر پذیر ہوا۔ فیض نے قرآن سے ابتدا کی اور مذہبی ماحول میں تربیت حاصل کی، وہ شروع ہی سے بالطبع سلیم رہے جبکہ غالب شروع ہی سے کھلنڈرے لاوا بالی اور لاڈ اور پیار کی افراط سے بگڑے ہوئے تھے تیرہ سال کی عمر میں شادی کے بعد دہلی آ گئے یہ ۱۸۱۰ء یا ۱۸۱۱ء کا زمانہ ہوگا۔ دہلی ایک تو ملک کا بیت السلطنت دوسرے تہذیبی لحاظ سے بھی ملک کا مرکز۔ فیض کا سیالکوٹ پورے

سو سال بعد بھی صحیح معنوں میں بڑا شہر نہیں بن سکا تھا لہذا عام چھوٹے چھوٹے شہروں کی طرح فیضؔ کی تعلیم بھی سیالکوٹ میں پورے روایتی انداز سے چلی اور ان کی اٹھان عام لڑکوں کی طرح ہوئی سوائے اس کے کہ وہ شعر کہتے تھے کہ فطری تقاضا تھا اور اس پر داد بھی ملتی تھی، لاہور کی حد تک بھی کوئی خاص بات بجز اس کے کہ گورنمنٹ کالج میں پہنچ گئے رونما نہیں ہوئی کالج کے کچھ نہ کچھ اساتذہ کے قریب تو انہیں آنا تھا سو وہ آئے اور یہاں ان کی ادبی تربیت ہو گئی۔ غالبؔ کی ادبی تربیت دہلی کے مشاعروں میں ہوئی دلی کے شرفاء اور ان کی رنگین صحبتوں سے غالبؔ کے مشاہدے میں وسعت اور تجربات میں اضافہ ہوا ان باتوں نے ان کی فطری ذہانت پر اور بھی صیقل کر دی۔ اور سفر کلکتہ تو سونے پر سہاگہ تھا۔ فیضؔ کو سیالکوٹ میں نہ آگرہ جیسی صحبتیں ملیں اور نہ لاہور میں دلی کا سا دم خم تھا فیضؔ کو ایک چیز غالبؔ کے مقابلے میں زیادہ ملی اور وہ ہے زمانہ، جس میں ادبی اقدار بھی واضح اور متعین شکل میں موجود تھیں اور روز بروز سمٹ سکڑ کر چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ لہذا ترقی پسندی کا مفہوم بھی واضح ہو چکا تھا۔ فیضؔ کو سجاد ظہیر ملک راج آنند اور رشید جہاں کی صحبتیں بھی میسر آئیں اور جذبی سردار جعفری، جاں نثار اختر مجاز و مخدوم وغیرہ کا ایک تازہ دم قافلہ بھی مل گیا، مجنوں فراق، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری اور آل احمد سرور کے سے ناقدین بھی مل گئے لہذا ان کا فکری سفر آسان تھا، غالبؔ اس میدان میں تن تنہا نظر آتے ہیں نہ کوئی ہادی نہ کوئی رہبر اگر کوئی خضر طریقت ملا بھی تو ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

کہہ کر وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور اپنا راستہ خود بناتے ہیں۔ فیضؔ نے اپنا راستہ خود نہیں بنایا ہے بلکہ ایک بنتے ہوئے راستے پر وہ چلے ہیں۔ فیضؔ سے لوح و قلم چھن گئی تو

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

کیا خوب کہا اور روداد بیاں کی، اور اس کیفیت کو کیسی پُر تاثیر زبان عطا کر دی، لیکن غالبؔ سے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

"اشک تو نیں" سے اپنے دامن پر جنوں کی حکایاتِ خونچکاں "لکھتے رہے" کیونکہ قلم ہو چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فیضؔ پر بیتی ہے فیضؔ نے تاریخ لکھی ہے۔ جس کا وہ خود بھی ایک جزو ہیں جزو بی نہیں بلکہ جزو لاینفک ہیں۔ لیکن غالبؔ کے زمانے میں جو تاریخ رقم ہوئی ہے وہ بھی غیر معمولی تاریخ ہے۔

فیضؔ کے پانچوں مجموعے میرے پیش نظر ہیں، نقش فریادی (۱۹۴۱ء) دست صبا (۱۹۵۳ء) زنداں نامہ (۱۹۵۶ء) دست تہ سنگ (۱۹۶۵ء) اور سر وادی سینا (۱۹۷۱ء) گویا یہ ۳۰ سالہ ادبی متاع ہے جسے بیک نظر دیکھنا اور پرکھنا ممکن ہے گویا تیس سال کی عمر میں پہلا اور ساٹھ سال کی عمر میں پانچواں مجموعہ چھپ کر شائع ہوا۔ یہ ۱۹۷۶ء ہے۔ اب فیضؔ صاحب کی عمر ۶۵ سال ہے اور کم و بیش وچالیس پینتالیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں ان کی ادبی عمر تقریباً آدھی صدی کو محیط ہے۔

غالبؔ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) بہتر برس جیئے اور ان کی ادبی عمر بھی پچاس پچپن سال سے کم نہ ہوگی اردو کا ایک مختصر دیوان اور فارسی دیوان ان کی شاعری کی کل متاع ہے اور خود وہ اس بات کا تقاضہ کرتے تھے کہ ؎

فارسی خواں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ منست

میں غالبؔ اور فیضؔ کے اردو کلام کا موازنہ کرنے کی کوئی نیت نہیں رکھتا صرف چند باتیں جو مجھے مشترک نظر آئی ہیں یا محسوس ہوئی ہیں عرض کرنا چاہتا ہوں آپ چاہیں تو انہیں سلسلہ وار اور مربوط صورت میں ملاحظہ فرمالیں۔

فیضؔ کے پہلے ہی مجموعے نے اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا اور اس وقت کے ادبی جغادریوں نے ان کا لوہا مان لیا تھا۔ لیکن بہت سے شاعروں نے اور نقادوں نے ناک بھوں

بھی چڑھائی تھی ظاہر ہے کہ محض فیضؔ ہی نہیں پوری ترقی پسند تحریک اور اس کے وابستگان مطعون و مقہور ہوئے یہ استثنا ہر زمانے میں رہا ہے۔ غالبؔ کو بھی اس کا سامنا رہا۔ فیضؔ نے اس کی پروا نہیں کی اور کبھی کسی معقول آدمی نے ایسی باتوں کی پروا نہیں کی۔ وہ زمانہ اچھا بھی تھا اور بُرا بھی، اچھا اس اعتبار سے کہ ترقی پسند تحریک چل کر مقبول ہو رہی تھی اس وقت کے نوجوانوں نے فیضؔ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی شاعری کا پر جوش خیر مقدم ہوا، علی سردار جعفریؔ (لکھنؤ کی ایک رات ص ۱۹۰ مطبوعہ فیضؔ نمبر افکار کراچی ملاحظہ ہو) جیسے فیضؔ کے دوستوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ زمانہ بُرا اس لحاظ سے تھا کہ جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) ہو رہی تھی اور برصغیر کے لوگوں کے اعصاب اس جنگ سے بہر حال متاثر تھے۔ برصغیر میں آزادی کی تحریکیں بھی جاری تھیں اور ترقی پسند تحریک بھی مسلم لیگ اور کانگریس کی چپقلشیں بھی جاری تھیں۔ آزادی کا کوئی واضح اور متعین نقشہ تمام لوگوں میں یکساں طور پر عام نہ تھا، انتشار اور خلفشار کی صورت تھی۔ ترقی پسندوں میں بھی طبقات بن رہے تھے اس کے باوجود فیضؔ کے اس مجموعہ کا شائع ہونا اور آناً فاناً مقبول ہو جانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس مجموعہ میں قطعات کے علاوہ نظمیں اور غزلیں بھی شامل تھیں۔ نظموں میں عام طور پر آج کی رات، مجھ سے پہلی سی محبت، چند روز اور مری جان، کتے، بول وغیرہ بیحد مقبول ہوئیں بلکہ بعض نظموں کے اشعار زبان زد خلائق ہو گئے مقبول غزلوں میں دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے بھی شامل تھی۔ حقیقتاً اس مجموعے میں سرد شبانہ، انتظار، نہ نجوم، رقیب سے اور تنہائی بھی اچھی اور خوبصورت نظمیں ہیں جن سے مستقبل کے فیضؔ کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کیا تیور ہیں اور کیا دم خم ہے۔ موضوع سخن ایک ایسی نظم ہے جو صاف صاف پتہ دے رہی ہے کہ فیضؔ کی رومانویت بعض حقائق (تلخ حقائق) کو سمجھ کر شاعروں کی توجہ اسی طرف لانا چاہتی ہے۔ وہ دعوت دیتے ہیں کہ اس خیالی طلسمات کی دنیا سے نکل کر زندگی کے سلگتے ہوئے تجربات کی بھٹی میں خود کو تپا کر کندن بنانا سیکھو ؎

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی موضوع ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ

ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

لیکن آپ نے دیکھا کہ فیضؔ نے سرزنش نہیں کی بلکہ ہلکا سا طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ اسی مقام پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فیضؔ نے کس قدر چابکدستی اور فنکارانہ طریقے سے اپنی بات کہہ دی ہے۔ فیضؔ کا خطاب نوجوان شاعر سے ہے جس کے اعصاب پر عورت سوار ہے لیکن فیضؔ نے یہ خطاب براہ راست نہیں کیا۔ غالبؔ نے اپنے مشہور قطعہ میں براہ راست خطاب کیا ہے (اے تازہ واردان بساط ہوائے دل) غالبؔ نے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا المناک انجام پیش کیا ہے۔ دامان باغبان وکف گل فروش کا المیہ دکھایا ہے کہ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔ فیضؔ نے مستقبل کے لئے کوئی حوصلہ شکن بات نہیں کی ہے۔ لیکن جیسا میں نے کہا کہ میں یہاں دونوں کے کلام کا موازنہ نہیں کروں گا کیونکہ دونوں کے افتاد مزاج میں نمایاں فرق ہے البتہ دیکھنے کی چیز جو ہے وہ یہ ہے کہ غالبؔ کی طبعی شگفتگی اس المیہ میں بھی حسن اور جمال کی تازگی کو باقی رکھتی ہے اور فیضؔ بھی اپنی اس نظم میں اول تا آخر تازہ دم اور شگفتہ رہتے ہیں یہی وہ مقامات ہیں جو فیضؔ اور غالبؔ میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

میں اس بات کو نہایت مبتدیانہ اور طفلانہ بات سمجھتا ہوں کہ فیضؔ اور غالبؔ کی زبان کی تراکیب لے کر بیٹھ جاؤں اور موازنہ شروع کر دوں یا فیضؔ کے تمام مجموعہائے کلام کے ناموں کے سلسلے میں غالب کے دیوان کی چھان پھٹک شروع کر دوں۔ میں اس بات کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا کہ آخر آخر میں آن کر حضرت اثر لکھنوی نے فیضؔ کی شاعری کو پسندیدگی کا فتویٰ دے دیا تھا اس فتوی کے دینے نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور فیضؔ کی شاعری کی شان میں اس سے کسر نہ رہ جاتی یہ محض وضعداری اور پاس خاطر کے سوا کچھ بھی نہیں دوسرے یہ کہ غالبؔ کے کلام سے اثر لینا یا دیوان غالبؔ کو حرز جاں بنا کر رکھنا

یہ سب وہ باتیں ہیں جو شاعروں کے علاوہ غیر شاعروں میں بھی مشترک ہیں ہاں یہ صحیح ہے کہ دیوان غالب کے مطالعہ کے وقت فیض نے فکر غالب سے اکتساب کیا ہوگا چراغ سے چراغ جلائے ہوں گے۔ فیض کی خوبی یقیناً یہ ہے کہ انہوں نے ایک ذہین آدمی کی طرح غالب سے فیض اٹھایا اور غالب کے افکار و نظریات کو من و عن قبول نہیں کیا قطع و برید کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ سے بھی کام لیا یہ تو غالب کی ہمہ گیری آفاقیت اور ہمہ جہت دل آویزی ہے کہ وہ ہر نوع کے افراد کو متاثر کرتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے بیشتر دانشوروں نے بقدر آگہی غالب سے عام طور پر اور فیض نے خاص طور پر فیض اٹھایا اور اپنے فن کو با اعتبار بنایا میں یہاں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ فیض نے ہرگز یہ نہیں کیا کہ دیوان غالب سامنے رکھ کر ان کی زمینوں میں غزلیں لکھ ڈالیں ان کی تراکیب اڑا لیں ان کی باتوں کو اپنے انداز میں پیش کر دیا یا ان کے قافیوں پر اپنے قافیے باندھ دیئے، ظاہر ہے کہ یہ وہ مبتذیانہ افعال ہیں جن سے فیض کی طبیعت کو ابا کرنا تھا سو انہوں نے کیا، انہوں نے غالب سے تفکر و تعقل کی بنیاد پر تخیل کا خمیر اٹھانے کا ڈھنگ سیکھا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے فن کی مدد سے اپنے تجربات، مشاہدات اور واردات کو بیان کیا۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ میر سے متاثر نہیں ہوئے، ہوئے لیکن میر کی داخلیت کو خود پر طاری نہیں کیا کہ اس طرح غزل ذات کے اندھے تہہ خانہ میں اتر کر معاشرے سے اپنا ناتہ توڑ لیتی ہے اور روح عصر سے اس کا رشتہ براہ راست باقی نہیں رہتا میر کا روح اثر سے ناتہ رہتا بھی ہے تو دلّی اور دل کے مرثیوں کے حوالہ سے ورنہ زیادہ تر وہ تصوف میں پناہ لیتے ہیں اور ذہنی فرار اختیار کرتے ہیں عصری تقاضوں سے۔ سودا سے فیض متاثر ہیں لیکن مرزا سودا کی معروضیت کی وجہ سے، ہاں یہ درست ہے کہ اس معروضیت میں میر کی داخلیت والی تاثیر نہیں ہے لیکن محض تاثیر بجائے خود ہمارے زمانے میں کوئی مستحسن چیز نہیں رہی ہے اس میں سوچ اور فکر کے لئے غذا بھی ہو اور مغز بھی۔ غالب نے بھی میر اور سودا دونوں کو بڑا شاعر مانا لیکن دونوں میں سے کسی ایک کی پیروی نہیں کی ذوق روزمرہ اور محاورے پر جان چھڑکتے تھے اور ملک الشعرا بنے بیٹھے تھے غالب اسے بھی خاطر میں نہ لائے بلکہ اپنی راہ خود بنائی یہی فیض نے کیا کر

غزل کے راستے پر میرؔ اور غالبؔ کے سے مینارۂ نور موجود تھے مگر بقدر ضرورت دونوں سے استفادہ کیا اور کسی ایک کا آنکھ بند کر کے اتباع نہیں کیا، سوداؔ کی معروضیت کی انہیں نظموں میں ضرورت تھی سو وہ مزاجاً انہیں راس آئی اور اس سے انہوں نے استفادہ کیا لیکن سوداؔ کے مزاج میں تضحیک و تمسخر کا جو مادہ ہے وہ فیضؔ کے کام کا نہ تھا صرف نظم کی تکنیک میں جس معروضیت کی ضرورت ہوتی ہے اسے لے لیا مجھے معلوم ہے کہ سوداؔ کو فیضؔ نے (دیکھئے زندان نامہ) ایک لمبے عرصے تک مطالعہ میں رکھا، متاثر بھی ہوئے لیکن یہ کوئی خطرناک بات نہ تھی اور نہ سوداؔ کا کلام چھوت کی بیماری ہے اسوداؔ تو بلاوجہ میرؔ سے موازنہ کے سلسلے میں مطعون رہے آخر سوداؔ کے کلام میں کیا کچھ نہیں ہے سوداؔ ایسا زبردست قوت بیان ہے اور اظہار خیال کے نادر اسالیب پر انہیں دسترس حاصل ہے سوداؔ کی نظم گوئی میں طنطنہ بھی ہے زور بھی اور شکوہ الفاظ بھی ایک شاعر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جن راستوں سے اس کا پیش رو گذرا ہے ان کے نشیب و فراز کو دیکھ کر اپنی راہ چلے، فیضؔ نے یہی کیا ہے۔ سوداؔ نے اپنے فن میں نہ تو روح عصر سے قطع نظر کیا اور نہ زندگی کے اجتماعی نظام میں اقتصادی ڈھانچے کو فراموش کیا زندگی کے مادی اقدار کو ان کے صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھا خواہ مخواہ کی ماورائیت اختیار نہیں کی غالباً یہی وہ مشترک اقدار ہیں جنھوں نے فیضؔ کو سوداؔ کی طرف متوجہ کر لیا۔

آئیے ایک اور ورق الٹ دیکھئے۔ دست صبا ملاحظہ کیجئے۔ قطعات سے ابتدا ہوتی ہے۔ متاع لوح و قلم والا قطعہ بھی یہاں موجود ہے۔ جو تقریباً زبان زد خلائق ہے اور اس کی شہرت دور دور تک پہنچی ہے اس قطعہ کی مقبولیت میں اس کے پس منظر کو بھی دخل ہے لیکن انہیں قطعات میں۔

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے ۔۔۔ کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں ۔۔۔ جو تیرے لب ترے بازو ترا کنار نہیں

بھی شامل ہے جس میں غالبؔ کا لہجہ اور طریق اظہار جھلکی کھاتا ہے اور اسی مجموعہ میں

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی ۔۔۔ اے اہل مصر وضع تکلف تو دیکھئے

انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے بیشتر اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

اور

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

جیسے قطعات صاف صاف غالب کے اسلوب کو آئینہ دکھا رہے ہیں ۔

اسی مجموعہ میں صبح آزادی (اگست ۴۷ء) کا داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر کی روشنی جو شاعر کو نظر آئی ہے اس پر ایک طبقے نے بڑی لے دے کی ہے اور آج تک کر رہا ہے۔ میں فیض کا وکیل نہیں ہوں اور نہ یہاں صفائی دینے بیٹھا ہوں، غالباً یہ میرا موضوع بھی نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس نظم کے مزاج میں بجز اس کے کہ جن لوگوں نے صبح آزادی کی خاطر قربانیاں دیں ابھی ان کے خواب کی تعبیر باقی ہے کیونکہ ؎

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور کوئی بات نظر نہیں آتی اور یہ وہ باتیں ہیں کہ گناہ نہیں ہمارے بہت سے قائد بھی یہی کہتے ہیں اس میں کوئی مضائقہ کم از کم مجھے نظر نہیں آتا، بات دور نہ جا پڑے، نظریہ کے اظہار کی آزادی ضروری ہے غالب نے بھی نظریہ کا کھل کر اظہار کیا اور مومن خاں کی مثنوی کے جواب میں "مثنوی درد با بیت" لکھ کر کسی ایک نظریہ کو رد کیا اور اپنے نظریہ کو پیش کیا فیض نے تو نہایت بے ضرر سی بات کہی ہے اور اپنے معصوم سے نظریہ اور معصوم سی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ کون شخص ہے جو استعمار اور استحصال کو پسند کرے گا۔ اور کون نہیں جانتا کہ ع "منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے" اور اس کے نتائج بالآخر کیا ہوئے ۔ علاوہ ازیں فیض نے محض پاکستان کو ملحوظ نہیں رکھا۔ پورے برصغیر کو شامل کیا ہے اس تناظر میں اس نظم کی معنویت سمجھ میں آتی ہے ۔

سرِ مقتل کے عنوان سے جو قوالی شامل کی گئی ہے وہ بھی خوب ہے، یہاں میں ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ بعض الفاظ اور ان کی تراکیب بعض شعراء سے

مخصوص ہو کر ایک خاص اہمیت حاصل کر لیتی ہیں فیضؔ کو سرِ مقتل، سرِ وادیِ سینا وغیرہ کی طرح "سر" کا لفظ اسی اضافت کے ساتھ استعمال کر کے ایک خاص قسم کی معنویت پیدا کرنے کا ڈھنگ معلوم ہے مجھے یاد ہے سجاد ظہیر کے مرنے پر انہوں نے مرثیہ لکھا جس کا ابتدائی شعر تھا ے

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے   نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے

فیضؔ صاحب اس کی گواہی دیں گے کہ میں نے اُسی "سرِ مقتل" کی تعریف کی کیونکہ میرے نزدیک سرِ مقتل کی معنویت فیضؔ کے علاوہ سجاد ظہیر کے سلسلے میں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اسے یہ ترکیب شاید سوجھ بھی نہ سکتی زیادہ سے زیادہ وہ "سوئے مقتل" کہہ سکتا تھا، چنانچہ اس قسم کی تراکیب جو خود فیضؔ کی وضع کردہ اور اختیار کردہ ہیں ان کی اپج کے محرک یقیناً غالبؔ ہیں چنانچہ بجائے خود نظم تو اپنا ایک تاریخی پس منظر رکھتی ہی ہے سرِ مقتل کا عنوان بھی اس پس منظر سے چسپاں ہے۔ اس مجموعے میں تمہارے حسن کے نام، نثار میں تری گلیوں پہ، شیشوں کا مسیحا، زندان کی ایک صبح، زندان کی ایک شام اور یاد ایسی نظمیں ہیں جو بآسانی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اس مجموعہ میں غزلیں بھی خوب ہیں اور پہلے مجموعے کے مقابلے میں یہ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے نہ صرف بہتر ہے بلکہ موثر بھی ہے۔ غالبؔ کا یہ خیال ہے

دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی   اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور

فیضؔ کے یہاں دوسری شکل اختیار کرتا، با عتبارِ خیال بھی اور باعتبارِ رست بھی۔ ے

باقی ہے لہو دل تو ہر اک اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اور اسی زمین میں ے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

اس عزم کو دعا دیجئے اور اب ذرا غالبؔ کے تیور بھی ملاحظہ کیجئے ے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

یہ اشعار بھی لائق ملاحظہ ہیں ۔

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہہ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

یہی وہ اشعار ہیں جنہیں مستقبل کے لوگ گنگنائیں گے اور بقول میر ؔ ے

گاتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ہر بڑے شاعر کا یہی عزم ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ آج کا نہیں آئندہ کا شاعر ہے ۔ چمن آرائی کا یہ عزم لائق ستائش ہے اور اس جذبے کو جس قدر استحسان کی نظر سے دیکھا جائے وہ کم ہے غالبؔ کو بھی یقین تھا کہ کسی اور زمانے میں ان کی شاعری مقبولِ عام ہوگی، فیضؔ نے خواہ اس بات کا اظہار ابھی تک نہ کیا ہو لیکن ہمیں یقین ہے کہ ے

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

کہنے والا ہمیشہ یادگار اور محترم رہے گا ۔

اسی مجموعے میں "تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے" بھی شامل ہے جو شہرۂ آفاق غزل ہے اور یہ شعر ے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

توحاصل غزل بھی ہے اور اپنے پس منظر کے سیاق وسباق سے چسپاں بھی۔

اسی مجموعے میں رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام، اصرار کریں یا نہ کریں، تمام کہتے ہیں، راحت جاں ٹھہری ہے، سمن عذاراں، سوا کر چکے ہیں ہم وغیرہ شامل ہیں جن کے بہت سے اشعار میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور پائی جاتی ہے جو ہماری فکر کو متاثر کرتی ہے اور زبان کی جزالت غالب کے رنگ ڈھنگ یاد دلاتی ہے۔ نیز یہ احساس ہوتا ہے کہ نقش فریادی کے مقابلے میں دست صبا کی غزلوں میں شاعر بہت آگے بڑھ گیا ہے۔

زنداں نامہ میں فیضؔ کے شعور نے ارتقا کی ایک اور منزل طے کر لی ہے یہ مجموعہ ۱۹۵۶ء میں آج سے کوئی بیس سال قبل چھپا، اس کا پس منظر بھی اہل علم اور ارباب نظر کو بخوبی معلوم ہے اس میں فیضؔ کے دو ایسے دوستوں کے تاثرات اور آراء بھی شامل ہیں جو جیل میں ان کے ہمراہ تھے ان آراء کی مدد سے بہت سی معلومات اکٹھا ہوتی ہیں لیکن یہاں تو یہ اندازہ کرنا مقصود ہے کہ فیضؔ نے غالبؔ سے کیا فیض اٹھایا اور فکر فیضؔ کا سفر کس منزل تک پہنچا۔ لفظوں کی در و بست کا مطالعہ ضمنی سہی لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ فیضؔ کے شعوری ارتقاء میں لفظوں نے بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ فیضؔ کے فکری نظام کی ترسیل میں ان لفظوں کے رنگوں اور عکسوں (SHADES) کا بھی عمل شامل ہے۔ لفظوں کا مزاج اور آہنگ فیضؔ خوب پہچانتے ہیں اور نہایت احتیاط سے ان کو استعمال کرتے ہیں لیکن لفظوں کی خاطر شعر نہیں کہتے ہیں شعر کی خاطر لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فیضؔ کے تخیل سے لفظ دبے رہتے ہیں لفظوں سے تخیل نہیں بنتا، یہ بات غالبؔ نے خوب پہچانی تھی مشکل سے مشکل مفاہیم غالبؔ کے یہاں تلاش کیجئے الفاظ اس کے تابع ہوں گے مفہوم لفظوں کے تابع نہ ہوگا۔ اے حبیب عنبر دست ملاحظہ ہو کہ کسی خاتون نے جیل میں فیضؔ کو پھولوں کا تحفہ بھیجا۔ اب شاعر کے تخیل کی پرواز دیکھئے اور سوچیئے کہ غالبؔ کو حلقی ڈلی پر زبردستی فکر سخن کرنا پڑی تھی یہاں صرف اظہار تشکر و امتنان ہی نہیں کنج زنداں میں یہ تحفہ ہزارہا خیالات سلسلہ در سلسلہ لایا ہے، سنٹرل جیل حیدرآباد میں ۲۸ ر اور ۲۹ اپریل سے ۵۳ء عین موسم بہار میں یہ ارمغان پہنچا تو شاعر کی فکر نے عمل ارتباط کی کتنی وادیاں

طے کر ڈالیں

کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گذرا ہے گلبدن گویا!!
کہیں قریب سے گیسو بدوش غنچہ بدست
لئے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست
یہ شعرِ حافظِ شیراز اے صبا کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی!!!
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اسی مجموعہ میں ملاقات، اے روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دریچہ، درد آئے گا دبے پاؤں AFRICA COME BACK بنیاد کچھ تو ہو اور کوئی عاشق کسی محبوبہ سے جیسی معرکتہ الآرا نظمیں شامل ہے جن کا آج تک غلغلہ ہے اسی مجموعے میں وہ غزلیں شامل ہیں جن میں فیضؔ کی فکر ایک زینہ اور بلند ہو گئی۔

دستِ تہہ سنگ ۱۹۶۵ء کا مجموعۂ کلام ہے اس میں بھی اولاً قطعات ثانیاً منظومات اور ثالثاً غزلیات و متفرق اشعار کا التزام عمل میں آیا ہے۔ نظموں میں دست تہہ سنگ آمدہ، سفر نامہ پیکنگ، سنکیانگ، آج بازار میں پا بجولاں چلو، حمد، دو مرثیے، کہاں جاؤ گے،

خوشا ضمانت غم، جب تیری سمندر آنکھوں میں، رنگ ہے دل کا مرے، وغیرہ شامل ہیں، ان میں آج بازار میں پا بجولاں چلو ایک ایسی نظم ہے جس میں وارفتگی سرخوشی اور سرمستی کی نغمگی اور غنائیت کا جادو جگایا گیا ہے۔ غالب تو قرض کی پیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ فاقہ مستی رنگ لائے گی۔ لیکن یہاں تو عالم ہی کچھ اور ہے لاہور جیل میں ۱۱ فروری ۵۹ء کو رقم ہونے والی یہ نظم کیا تیور رکھتی ہے۔

چشم نم جان شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

سر وادی سینا ۱۹۷۱ء میں چھپی اور یہی تازہ ترین ان کا مجموعہ کلام ہے اس کا انتساب ایک ناتمام نظم ہے جس کی روانی آمد اور تیکھا پن غضب کا ہے ۶۵ء تا ۷۱ء کی کل متاع اس میں موجود ہے نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ یہی وہ کلام ہے جو ہر اعتبار سے لائق ستائش ہے اور یہی وہ کلام ہے جس کے بارے میں اہل فکر و نظر، غور و فکر کر سکتے ہیں اسی کلام میں وہ نقوش تلاش کئے جا سکتے ہیں جو فکر غالب سے قریب اور آہنگ غالب کی بازگشت ہیں کیا نظم اور کیا غزل ہر صنف میں فیض منفرد نظر آتے ہیں قبل اس کے کہ آپ میرے ساتھ ساتھ اس کا مطالعہ کریں آئیے ذرا چند باتوں پر غور کر لیجئے تاکہ جن نتائج کا استخراج مجھے منظور ہے اس میں آپ بھی شریک ہو جائیں۔

اب تک چاروں مجموعوں کے انتخاب کلام میں مَیں نے اسی بات پر زور دیا ہے کہ فیض کے تخیل میں جو جذبہ اور ذہن کار فرما ہے اور اس تخیل کے اظہار میں خارجیت و داخلیت کا توازن تفکر پر مائل کرتا ہے وہ محض تخیل نہیں ہے بلکہ تہذیب نفس اور تربیت ذہن کا شعور ہے جو ایک انتہائی وضعدار شریف النفس اور خود دار انسان کا قاری پر خوشگوار نقش مرتسم

کرتا ہے، جوں جوں یہ انسان حالات کا حادثات کا اور ہونے والے واقعات کا مقابلہ کرتا ہوا چلتا ہے وہ تہذیب نفس کے عمل کو جاری رکھتا ہے اور شرافت کے اقدار کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا، حالانکہ اسے تختۂ دار کا سایہ اور سر مقتل قاتلوں کا بہیمانہ طرز عمل صاف نظر آتا ہے۔ لیکن نہ تو وہ ہتھیار ڈالتا ہے اور نہ سمجھوتے کرتا ہے بلکہ اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر اور بھی پختہ یقین ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اکیلا نہیں ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس مقتل میں اس کے ساتھ کروڑوں مظلوم ہیں جو سر سے کفن باندھے ہوئے استحصال و استعمار کا مقابلہ کر رہے ہیں وہ ان کی زبان ہے وہ ان کا ترجمان ہے اس کی کوئی ذاتی منفعت نہیں ہے البتہ ذاتی نقصانات بہت زیادہ ہیں جن کی اسے بہر حال پروا نہیں۔

واضح رہے کہ ہمارا قاری، یعنی اس دور کا قاری شاعری میں محض جذبہ اور احساس کی خوبصورت ہیئت سے مطمئن نہیں ہوتا وہ ذہن اور دماغ کو مسلسل حرکت میں رکھنے کا عادی بن چکا ہے اس لحاظ سے وہ غالبؔ اقبالؔ فراقؔ اور فیضؔ سے قریب ہے اس کے سیاسی اقتصادی عمرانی نفسیاتی تاریخی اور معاشرتی نظریات تعصبات، احساسات، جذبات اور خیالات مسلسل تغیر پذیر ہیں اور ذہنی طور پر وہ سماج کو بدلنے پر آمادہ ہے اسے متعدد سائنسوں کا علم اور شعور ہے اس کی ذہنی تربیت کا عمل جاری ہے اور اس کے شعور میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے شعور کی اس رو کو پکڑ کر زیادہ بڑی بات کتنا زیادہ ذہانت کی بات کہنا اور اپنا ہمنوا بنانا یا کم از کم اپنے خیالات سے ہمدردی پیدا کرا لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی شاعر قاری کے معیار پر پورا نہیں اترتا یا اس کا ذہنی قد ہمارے اقدار کے لباس سے چھوٹا ہے تو وہ خود بخود فنا ہو جاتا ہے غالبؔ اور فیضؔ کے کلام میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جو نکھار آ رہا ہے اس کی وجہ ان کی ذہانت، طباعی اور وقت کی رَو کو پہچان کر اپنی بات کہہ گذرنا اور منوا لینا ہے۔ ورنہ کتنے ہی شاعر آج مطلقاً اپیل نہیں رکھتے اور امتداد زمانہ نے ان کے رنگ کو پھیکا کر دیا ہے یا وقت کا تیز رَو دھارا ان کی شاعری کے خس و خاشاک کو بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔

ابتدا ہی میں میں نے یہ عرض کر دیا تھا کہ غالبؔ کو برصغیر میں انیسویں صدی کا مرتا ہوا جاگیر دارانہ نظام ملا تھا یہی معیشت اور صنعت کا زوال ہو چکا ہے اور اس خلا کو ایسٹ انڈیا

کمپنی کا تجارتی اور نیم سرمایہ دارانہ نظام رہا تھا غالب نے آنے والے نظام کو محسوس کر لیا تھا۔
فیض نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ استحصالی و استعماری نظام جو سرمایہ دارانہ صنعتی نظام بھی ہے
مر رہا ہے۔ لیکن پوری طرح مر نہیں سکتا اور مظلوموں کو کچل رہا ہے۔ لہٰذا آنے والا دور جو معاشی
ناہمواریوں سے پاک ہوگا اور اس میں استحصال کی گنجائش نہیں ہوگی ایک صحت مند سماج ہو
گا جس میں انسان کی فکر کا سورج طلوع ہو جائے اور اس روشنی میں بہت کچھ نظر آئے گا۔ چنانچہ
جو کچھ نظر آئے گا اس میں شاعروں، دانشوروں اور فنکاروں کی قربانیوں کی داد دی جا سکے گی اور
ان قربانیوں کو محسوس کیا جائے گا۔ تاریخ کی مادی تعبیریں اور جدلیاتی نظریہ کی اَن گنت باتیں ان
اشعار اور ان کے فکری شعور میں جھلکیں گی۔ آیئے انہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرا فیضؔ کے
تازہ ترین مجموعہ کلام کا مطالعہ کریں۔

'لہو کا سراغ' کا ایک ایک شعر خوب ہے آخری شعر ملاحظہ ہو!

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

یہ چار مصرعے بھی قابل ملاحظہ ہیں۔

زنداں زنداں شورِ انا الحق محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ماتم ماتم شہر بہ شہر

ایوب خاں کے الیکشن کے پس منظر میں گلاب کے پھول کا نشان اور فیضؔ کی یہ کراہ
کسقدر پُر معنی ہے۔ فیضؔ کی اس نادر دریافت پر بھی غور کیجئے۔

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

"یہاں سے شہر کو دیکھو" تو کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل"، بیحد موثر نظم ہے۔
غم نہ کر غم نہ کر، بلیک آؤٹ سپاہی کا مرثیہ ایک شہر آشوب کا آغاز، سوچنے دو، سرداری سینا، دعا، دلدار دیکھنا، ہارٹ اٹیک، مرثیے، خورشید محشر کی لو، بالیں پہ کہیں، جرس گل کی صدا، فرش نومیدیٔ دیدار، ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند حذر کرو مرے تن سے نہایت اہم اور یادگار نظمیں ہیں داغستانی شاعر رسول حمزہ کے کلام کا ترجمہ بھی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس مضمون کا خاتمہ "ایک شہر آشوب کا آغاز" پر ہو۔

اب بزم سخن صحبت لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
پیوندِ رہ کوچۂ زر چشم غزالاں
پابوس ہوس افسر شمشاد قداں ہے
یاں اہل جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیش ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے
اب صاحب انصاف ہے خود طالب انصاف
مُہر اس کی ہے میزان بہ دست دگراں ہے
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

شاہین مفتی

اندیشوں کا شاعر

ہمارے ادب میں کلاسیکی رجحانات کی بجائے رومانوی رجحانات کی اجارہ داری ہے۔ شاید اس لئے کہ اردو اور پھر اس کا بیشتر ادب ایک زوال پذیر اور زوال زدہ معاشرے کی پیداوار ہے۔ اردو نے جنم لیا تو مغل مر گئے۔ گویا ہماری تہذیب کے ایک عظیم تر اور روشن تر ورق کو الٹ دیا گیا اور اس کے عوض ہم تک کیا پہنچا؟ ایک اندوہناک سرگزشت ہے۔ اس دو سو سالہ ادبی تاریخ میں سوائے اقبال کے ایک بھی ایسی قدآور شخصیت نہیں جس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اپنے ذاتی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی، مذہبی اور تہذیبی دکھوں سے بڑی شخصیت تھی۔ یوں انفرادی وارداتیں بہت سی ہیں مثلاً کہا جا سکتا ہے میرؔ اور فانیؔ اپنے ذاتی دکھ سے زیادہ پر شکوہ تھے۔ دردؔ اور اصغرؔ گونڈوی تصوف کے راستے پر چلتے ہوئے بھی زمین کو دیکھ لینے کے عادی تھے۔ غالبؔ اپنی تہذیبی آن بان کو نبھانے میں زمانے سے زیادہ ضدی واقع ہوا تھا۔ اکبرؔ، سرسید، شبلیؔ، حالیؔ اور ان کے رفقا بھی اپنی تہذیبی اور سماجی جھٹکوں کے سنگِ میل ہیں۔

ملوکیت کے چھن جانے اور اپنے ہار جانے کا رویہ شاعری میں دو طرح سے ابھرا ہے۔ اوّل الذکر وہ اصحاب ہیں جن پر جھنجلاہٹ، اداسی، افسردگی، فرار، مصنوعی زندگی کے خلاف فطرت کی حمایت اور طنز و تضحیک کا جذباتی تشنج طاری ہو گیا ہے اور مؤخر الذکر وہ صاحبان ہیں جو علمی اور اصلی زندگی کے تخیلی نعم البدل کی تلاش میں ہیں۔ ان کا ذوقِ نظر اور مطالبات اتنے بلند و بالا ہیں کہ ان سب کی تکمیل کم از کم اس دنیا میں ممکن نہیں۔ یہ انفعالی رومان پرور اصحاب اپنے عہد اور اس کی قدروں سے ناموافقت کے تکلیف دہ احساس کو کم کرنے کی خاطر اپنے

لئے ایک آرام دہ جائے پناہ ڈھونڈنے میں مشغول ہیں یا ماضی پرستی کو شیوہ بنا چکے ہیں اور اگر اس پر قانع نہیں تو دور کے سہانے خوابوں کی رنگینی میں توسنِ خیال دوڑاتے پھرتے ہیں۔ سونے پر سہاگا کے عین مصداق سائنسی اور مشینی عہد نے بین الاقوامی طور پر انسانیت کی تعمیری آنکھ یعنی فن کار کو بے حد متاثر کیا ہے۔ انسانی انا کو لوہے اور پیتل کے ہتھیاروں نے وہ زک پہنچائی ہے کہ رومانویت ہر ضربِ تیشہ پر امنڈ امنڈ کر لوٹ آتی ہے۔ اقتصادی، سیاسی، مجلسی اور معاشرتی نظام کی بدلتی ہوئی اقدار کے پیشِ نظر ہمارا ہر نیا، پرانا رومانوی ادیب، شاعر یا کوئی بھی فن کار بیک وقت روحانی، ذہنی اور جسمانی عذاب میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے حواس سے لڑتا ہے۔ اور دل کو عذاب دے کر خوش ہوتا ہے۔ انہی داخلی گذرگاہوں کی خواب ناک مگر موہوم فضاؤں میں بھٹکنے والے شعرا میں فیض احمد فیضؔ کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اس کے ہاں رومانویت کے دونوں رویے موجود ہیں یعنی وہ فرار بھی چاہتا ہے اور ایک ایسی موہوم سی منزل کے امیج میں بھی زندہ ہے جو افلاطون کی "ریاست" کی طرح ہمیشہ کسی نہ کسی نابغہ کے ذہن میں زندہ رہے گی۔ اسی کھینچا تانی میں اس کے اندر کا آدمی اپنی انانیت سمیت بہت قابلِ توجہ ہو گیا ہے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعری جذبات کا بہاؤ نہیں جذبات سے فرار ہے۔ یہ شخصیت کا اظہار نہیں شخصیت سے فرار ہے اور وہی لوگ جن میں شخصیت بھی ہوتی ہے اور جذبہ بھی یہ جانتے ہیں کہ اس فرار کے کیا معنی ہیں۔ اسی لئے فیضؔ شخصی اظہار کے والہانہ اظہار کے باوجود اپنی ذات کے بہت سارے حصوں کو کیموفلاج کر سکتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون "کچھ فیضؔ کے بارے میں بہت کچھ اپنے بارے میں" میں لکھا ہے کہ فیضؔ اپنی ایک مخصوص فضا میں زندہ ہے اسے اس فضا سے علیحدہ کر کے اس سے کسی قسم کی وسعت کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ "فیضؔ کی شاعری کا سارا حسن اسی فضا سے جھلکتا ہے۔ اس کے یہاں مصرعوں کی معصومیت اتنی اہم نہیں جتنی وہ فضا جو ان نظموں کی اکائی سے ترتیب پاتی ہے۔" اس فضا میں وقت کی سرکتی آہٹوں کے باوجود کوئی واضح تبدیلی نہیں آتی۔ یہ فضا درد کی لہر کی طرح بے جہت ہے جہاں افسردگی اور تھکن کے بادل بہت نیچے جھک آتے ہیں اس بے یقینی کی فضا میں قربت کی آنچ بھی ہے اور

دوری کا پگھلا دینے والا احساس بھی فیض کی سرگوشیاں اس خواب ناک فضا میں بارۂ احمرین کی کھنک اور پاسِ ضبط سے دبی دبی آہوں کی طرح ابھرتی ہیں۔ وہ سبز گوشوں پہ نیلگوں سایوں کا متلاشی ہے اور ان نیم خواب ناک شبستانوں کی خواہش میں سرگرم عمل ہے جہاں ہر شخص بڑی آہستگی سے لفظوں کی مالائیں پرو رہا ہو، خوب صورت، چمک دار، قیمتی اور انمول لفظوں کے گجرے خوشبو میں مہک رہے ہوں، دوری کے خس و خاشاک تلے بھی عارض ولب کے سمن زار کھلے ہوں، گردِ ماہتاب میں شاعر کی باہیں ہوں، دستِ صبا ہونٹوں سے لگا ہو اور دلدارِ نظر کی شبنم قطرہ قطرہ گر رہی ہو۔ یہ ہماری ایک بورژواتی یا محلاتی فضا ہے۔ ایک رومانوی کا سجل سپنا، یہ سب کچھ بڑا دلارام ہے مگر زندگی میں یہ سب کچھ بہت کم ہوتا ہے۔ یہ سب ان کے لئے ہے جو زندگی کو ڈے ڈریم سمجھتے ہیں جب کہ عموماً زندگی ہم سے مفاہمت اور سمجھوتے کا آہنگ مانگتی ہے۔ حقیقت اور جذباتیت کی اس مردِ جنگ میں فیض کے اندر بھی خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ فیض نے اپنے اس ٹوٹ جانے والے لمحے کے بارے میں بڑا واضح اشارہ دیا ہے:۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ یہ آیادھاپی کی صدی ہے جہاں رفاقتوں کی طلب، کبھی کلیوں کی مہک، لہو کی تپش، موت کے نوحے، سہاگ کے گیت، جمالِ یار کی بوالعجبیاں، ویت نام کا امن، کشمیر کا مسئلہ، فلسطینیوں کی مظلومی، ولز اور سیزرس سگریٹ کے پیکٹ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ دنیا ابلاغ کی سطح پر جتنی قریب آتی ہے، ستاروں کا طلسم جس آسانی سے ٹوٹتا ہے بشر کے درمیانی واسطے اتنے ہی کمزور، ناقص اور بودے ہوتے چلے گئے ہیں۔ مشرق، مغرب پر حملہ کرنے کی خواہش لئے ہوتے ہے، مغرب مشرق پہ مسلسل شب خون مار رہا ہے۔ گویا وہ ہماری کلاسیکی شاعری ہمارا روایتی لباس، ہماری کلاسیکی اور علاقائی موسیقی، ہمارا تاج محل اور ہماری شاہی مسجد یہ سب ہمارے پیچھے ہے اور جدید شاعر جاز، ولایت سے درآمد کی ہوئی فلمی گانوں کی دھنیں، ٹیڈی اور کاڈ بولاتے، پتلون، شیوخ شہر کی لیس، نو،

انگریزی میں چھپے ہوئے عید کارڈ اور امریکہ کے اسکائی اسکریپر یہ سب ہمارے آ گئے ہیں۔ (سجاد باقر رضوی۔) اگر اس جذباتی انتشار کو تھوڑا سا اور پھیلا لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی متعین راستہ نہیں۔ قومی شعور اور انفرادی اضطراب کا ٹکراؤ، نئی اور پرانی روایتوں کا جوار بھاٹا یہ سب ہمارے بر اعظم کے ذہین طبقے کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ یہ سارے کا سارا طبقہ فرسٹریٹیڈ انٹیلی جینشیا ہے تشکیک اور نا آسودگی کی ایک کمزور نسل جو بے یقینی کے ایک عالم گیر آشوب سے گزر رہی ہے۔ ہمارا شاعر ایک فرد واحد ہے جو زندگی کی جنگاہ میں تن تنہا کھڑا ہے۔ اس کے ارد گرد بگولوں کا رقص ہے۔ نیپام بموں کا دھواں ہے اور لوگوں کی منافقتیں ہیں۔ ایسے عالم میں اس کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ایک "الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش لئے مارا مارا پھرے۔ ہپیز، بنکیز، بیٹلز اور بیٹنک کی ناراض نسلوں، حشیش اور غنودگی کے بڑھتے ہوئے امراض، غیر متوازن اقتصادیات کی برائیوں کے علاوہ بھی اس برصغیر کے کچھ اپنے مسائل ہیں۔ ۱۹۴۷ء کی ادبی، ثقافتی، علمی اور مذہبی تقسیم پھر ایک مسلسل سرد جنگ، استحصال، بے یقینی کی دو بے سود جنگیں، بدلتے ہوئے موسمی اثرات اور ان کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پر ہر شاعر کی اپنی نفسیاتی اور جسمانی الجھنیں، اپنے آپ کو ڈلاج دینے کی عادت، یہ سارے کا سارا فراریت کا گھپلا ہے جس میں زندگی کے بے سود ہونے کا احساس، ہتھیلیوں پہ لہو اور حنا کو ساتھ ساتھ سجانے کی اذیت، دستِ صبا سے دست تہہ سنگ تک کا سفر، نقشِ فریادی کی لفظی تصویریں، لہو کو صرفِ قبا کرنے کی خواہش سب کچھ شامل ہے۔ فیض کے ذاتی اور سماجی پسِ منظر کی روشنی میں ن م راشد کہتے ہیں "اس تلخی میں بے صبری بلکہ خفقان کا وہ اثر پایا جاتا ہے جو ہمارے زمانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ فیض غالباً ہمارے تمام موجودہ شاعروں سے بڑھ کر تاریخ کی بے پناہ قوتوں کا شعور رکھتا ہے اس لئے کبھی تو وہ اس چار طرف پھیلی ہوئی شیطنت اور ناانصافی کا مجرم اجنبی ہاتھوں کو قرار دیتا ہے کبھی ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم میں اس کا راز تلاش کرتا ہے اور کبھی اپنے اجداد کی میراث سمجھ کر بے بسی کی حالت میں خاموش ہو جاتا ہے۔ فیض کی یہ آخری زمانے کی شاعری میرے نزدیک اسی نفسی الجھن کی بہترین مثال ہے جسے ایڈیپس کا مپلیکس کہتے ہیں۔ یہ الجھن شاید ہم سب میں ہے

اور عہدِ حاضر کے جس شاعر میں نہیں وہ اپنے اردگرد کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی انقلاب سے بے بہرہ ہے۔" راشد کے یہ الفاظ تقسیم سے پہلے کے الفاظ ہیں لیکن اگر ہم اپنی نفسیاتی، سیاسی، سماجی، معاشی اور دوسری الجھنوں کا جائزہ لیں تو یقیناً "سہمناکی کی وہ فضا جو آج سے تیس برس یا اس سے بہت پہلے تھی ابھی تک موجود ہے. گویا ہم ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں اور اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں کہ ہماری گزشتہ سے پیوستہ نسلیں بھی اسی قلبی اینٹھن اور بے یقینی کو تلاش کر رہی ہیں جن سے ہم آج گتھم گتھا ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے اندیشے کے مرض میں مبتلا ہے جسے تیسری آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی، مگر بڑے محسوس انداز سے وہ ہمارے رگ و پے میں سرایت کرتا جاتا ہے۔ اس موقع پر فیض کی ایک نظم کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو کافی پرانی ہے مگر اس ماحول میں اس سے زیادہ نئی چیز بھی کوئی نہیں۔

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
غایتِ سود و زیاں صورتِ آغاز و مآل
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
تشنۂ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے
وہی بے سود تجسّس وہی بیکار سوال
یادِ ماضی سے غمیں دہشتِ فردا سے نڈھال
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں

دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
دشت و زنداں کی ہوس، چاک گریباں کی تلاش

نورِ خورشید سے سہمے ہوتے، ساعتِ امروز کی بے رنگی سے مضمحل، یادِ ماضی سے غمیں، اور دہشتِ فردا سے نڈھال نسل کیا کوئی پرانی نسل ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ کیونکہ اندیشوں اور حسرتوں سے چور چور، عضو عضو نڈھال نسل ہمارے عہد کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ اب آئیے دیکھتے ہیں کہ اندیشہ کیا ہے؟ امید و بیم کی ایک ایسی کیفیت جس میں قوّتِ فیصلہ مسلسل جھٹکوں کا شکار ہوتی رہے، ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر والی مسلسل الجھن، ہونی اور ان ہونی کا خدشہ، اپنے آپ سے بھاگ جانے والی کیفیت، اعتماد اور اعتقاد کے بت ٹوٹ جانے کا خوف، کروں نہ کروں، کاش، اللہ کرے ایسا نہ ہو، اگر ایسا ہو گیا تو، کہیں ماضی کی طرح مستقبل بھی، قدم اٹھاؤں تو مگر۔ یہ سب نفسیاتی ضابطے، گومگو، اگر مگر والی کیفیّت کا سلسلہ اندیشے کا پیش خیمہ ہیں۔ اندیشہ اپنی ذات سے کوئی دل شکن رویہ نہیں، لیکن اس میں جہاں امید سے زیادہ بیم و رجا سے زیادہ خوف کا حصّہ بڑھ جاتے تو اس سے انسانی قوّتِ فیصلہ گھٹ کر رہ جاتی ہے اور آدمی ایک خاص فضا میں مقیّد ہو جاتا ہے۔ بڑھنے، پھیلنے، پھولنے والی تمام قوتوں پر فضا کا خوف، کیا معلوم کا خدشہ اپنا اثر جمانے لگتا ہے اور پھر یہ جکڑ بندی امر بیل کی طرح زندگی کے شجر کا رس چوسنے لگتی ہے۔

اندیشہ کن حالات میں جنم لیتا ہے، یہ خالص نفسیاتی مسئلہ ہے اور ہو سکتا ہے نفسیات دانوں نے اس کی بہت ساری جنسی، شعوری، لاشعوری اور سماجی توجیہات بیان کی ہوں لیکن اندیشے اور خوف کے بارے میں عمومی طور پر بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ خاموشی، اندھیرا اور تنہائی یہ سب اندیشے کی جنم گاہیں ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے جہاں آدمی کو اکیلے پن کا احساس ہوا اس کی دوسرا ہٹ اسے دغا دے گئی وہیں اندیشے کے بھوت نے اسے جکڑ لیا۔ تنہائی کے ہمراہ اگر اندھیرے اور خاموشی کا اضافہ ہو جاتے تو یقیناً ذہن میں وہ سب ان دیکھی بلائیں اور حشرات چمکنے لگتے ہیں جن سے کسی پل فرار ممکن نہیں۔ اکیلے پن میں تو اپنے دل کی دھڑکن بھی معبد کی گھنٹیوں کی طرح بامعنی ہو جاتی ہے۔ دیواریں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ روشنی خطرے

کا نشان بن جاتی ہے، ہوا کی سرسراہٹ ایک غیر محسوس انداز سے ہمارے سوتے ہوتے خدشے جگانے لگتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہمیں کہیں چھپ کر بیٹھا ہمیں گھور رہا ہے۔ کیا خبر اس کی سرخ آنکھیں کب دہکتے انگارے بن جائیں۔ کیا خبر وہ کس وقت انجانے میں ہم پر حملہ کر دے۔ گلا گھونٹ دے، ٹانگ توڑ دے، اندھا کر دے، اٹھا کر لے جائے یا پھر زنجیروں میں جکڑ کر کمرے کے کسی ستون سے باندھ جائے۔ یہ سارا تنویم کا عمل ہے اس میں خاموشی و تنہائی آدمی کو ہپناٹائز کر لیتی ہے اور ماحول میں ایک ایسا اسرار جنم لینے لگتا ہے جو نہ آنکھیں بند کرنے دیتا ہے نہ بولنے دیتا ہے، نہ ہلنے دیتا ہے نہ سوچنے دیتا ہے۔ ہزار اپنی توجہ کو ہٹانے کے سامان کرو اندیشے کا بھوت دھم سے آنکھوں کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔ فیض کے ہاں اندھیرے سے بوجھل اس پاگل کر دینے والی تنہائی کا بہت ذکر ہے لیکن فیض کی تنہائی انڈر گریجویٹ آدمی کی تنہائی نہیں۔ اس میں مندرجہ بالا اندیشے کی ترقی یافتہ صورت ملتی ہے جس میں شاعر کی اپنی ذات ہی سب سے بڑا اندیشہ ہے۔ کرب کی یہ ساری واردات بوند بوند وقت اور آدمی کا لہو پیتی رہتی ہے۔

درد آئے گا دبے پاؤں

اور کچھ دیر میں جب پھر سے مرے تنہا دل کو

فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے

درد آئے گا دبے پاؤں لئے سرخ چراغ

وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا

دل کی دیوار کا ہر نقش دمک اٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں گوشۂ رخسار کہیں

ہجر کا دشت کہیں گلشنِ دیدار کہیں

لطف کی بات کہیں پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہو گی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہو گا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہو گا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمنِ جاں ہیں سبھی سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات یہ سائے بھی یہ تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

اس نظم کی فضا پر غور کیجئے۔ یہ دسمبر ۱۹۵۴ء منٹگمری جیل میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ سرما کی لمبی رات، جیل کی ٹھٹھری ہوئی فضا، سیلن زدہ کمرے کی تنہائی، ایسے میں شاعر کی خودکلامی، یعنی خود رحمی کے سارے اثرات موجود ہیں۔ اس لحظہ لحظہ بڑھتے اندھیرے میں ایک چیز کی آمد متوقع ہے اور وہ بھی درد کی۔ جو خطرے کا نشان یعنی سرخ چراغ ہمراہ لائے گا یعنی درد کا آنا بھی وجہ تسکین نہیں کیونکہ یہ درد اور پھر اس درد کی ساری ایسوسی ایشن جن میں گلشن دیدار اور ہجر کا دشت سب کچھ سمویا گیا ہے پلک جھپکنے کا کھیل ہے۔ اس کے بعد پھر وہی شاعر ہے اور رات کے امنڈتے ہوئے ستم، مشتعل وحشی سایوں کا خوف جن سے رات بھر خون خرابا ہوگا اور اس سرد جنگ میں بھی شاعر اکیلا ہے۔ کیونکہ جس ماحول میں وہ زندہ ہے ایک بھی ایسا شخص نہیں جو تسلی کے دو بول ہی کہہ دے بلکہ جب وہ اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتا ہے تو اسے کڑی رات، سائے اور تنہائی ہر چیز دشمنِ جاں لگتی ہے۔ اس نظم کے آخری دو بند باقی نظم سے لگا نہیں کھاتے کیونکہ ان سے نظم کی اس وحدت کو دھچکا لگتا ہے جو ابھی تک باقی تھی۔ یہاں ایک دم شاعر کا رویّہ حوصلہ افزا ہو گیا ہے لیکن لاشعوری طور پر اس امید میں بھی

انفعالیت ہے لہجے کی وہ تھکن بے حد نمایاں ہے جو مایوسی کی لہر سے پیدا ہوتی ہے ؎۔

لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گل زار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہو حرکت بھی توانائی بھی
ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے

ان دونوں بندوں میں ایک ایسی نوابانہ شان جھلکتی ہے جو یقیناً نواب واجد علی شاہ کا طرۂ امتیاز تھی، جیسے محمد شاہ رنگیلا دلی کی شکست کے عین موقع پر اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے بلکہ ماحول کی مخالفت میں اپنے آپ کو ڈاج دینے کے لئے سہمے ہوئے، کتراتے ہوئے، اکتاتے ہوتے لرزیدہ خواجہ سراؤں سے اپنی تلوار طلب کرتا ہے۔ یہ فیض کی نظم کی کوئی برائی نہیں بلکہ فیض کی یہ منظر کشی اور بعدازاں اس سنبھلنے کی ایک کمزور سی کیفیت نے اس نظم کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔ اس سکوتِ مرگ والی فضا میں ہر شخص دوسرے پر تکیہ کرتے ہوئے ایک روشن مستقبل کی تلاش میں ہے۔ اصطلاحاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انفعالی افراد کا جمگھٹا جنہیں نہی عن المنکر کا نام دیا جا سکتا ہے امر بالمعروف والے گروہ کی تلاش میں ہے۔

بالکل اسی موضوع سے ملتی جلتی ایک نظم دستِ تہ سنگ میں ملتی ہے یہ سات برس کے بعد کی نظم ہے یعنی دسمبر ۱۹۶۱ء کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ فیض کی آزادی کے زمانے کی نظم ہے۔ اور یہاں فیض جیل کی کال کوٹھری میں نہیں بلکہ کسی نیم خواب شبستان میں کھڑا ہے۔ وہی دسمبر کی خون جما دینے والی سردی ہے وہی فیض کی خود کلامی ہے اور وہی اپنے آپ سے بھاگ جانے والی کیفیت ہے ؎۔

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام کا چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

گویا تنہائی اور اس کے رہ جانے کا ڈر فیضؔ کے یہاں اندیشے کا سب سے بڑا سگنل ہے۔ یہ تنہائی انفرادیت کے احساس کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس تنہائی کا رشتہ جیل میں گزارے ہوئے ماہ و سال سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ اس تنہائی میں فیضؔ صاحب کی کم گوئی اور خود کلامی کو بھی دخل حاصل ہے۔ ایک حد تک یہ تنہائی ہر رومانوی کے اندر کے آدمی کی تنہائی ہے جس کا ایمان ہے کہ کوئی اسے دوسرا نقطہ نہیں بخش سکتا۔ کوئی شخص دوسرے سے مختلف نہیں، ہر شخص ادھورا اور نامکمل ہے، کوئی کسی کا نہیں، اور آدمی اس تیز رفتار، بھاگتی ہوئی، چیختی ہوئی، بے تحاشا ہنستی ہوئی، روتی ہوئی دنیا کی بھیڑ میں بھی تنہا ہے۔ اکیلا، ان چھوا، ان جانا۔

پروفیسر سلامت اللہ خاں اپنے مضمون "شاعرِ محبت، شاعرِ انسانیت" میں لکھتے

ہیں۔ "فیض کی شاعری میں جو چیز ابتدا سے کھٹکتی ہے وہ ان کی روح کی تنہائی ہے۔ خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ اس کو پڑھتے ہوئے قاری ان کی روح کی تنہائی کو کبھی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اسی لئے فیض کی شاعری میں ایسا حزن و ملال، ایسا درد و الم اور ایسی غم انگیزی ہے۔ جس میں ہارڈی اور فانی کی قنوطیت کی خنکی نہیں بلکہ جو حسین ہے، جو پُراسرار ہے، جو جمالیاتی لذت سے چور ہے۔ فیض کی آنکھیں فکرمند بھی ہیں، لیکن جس چیز کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھیں منتظر بھی ہیں۔ یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا اور اس سے ان کی تنہائی ہر لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے۔" اس انتظار کی کیفیت بھی بڑی خوبصورت ہے۔ یعنی فیض کو علم ہے کہ جس کا انہیں انتظار ہے وہ نہیں آئے گا۔ ان کے خواب پانی کے دائروں کی طرح ٹوٹتے رہیں گے۔ وہ اس بیزار فضا اور درپئے آزار صبا کے جنگل میں چلا چلا کر یہ بھی کہتا ہے کہ:

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپاتے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگاتے بیٹھے ہو

لیکن طوق و دار کے اس موسم میں بھی انتظار کا رنگ شامل ہے گویا اس طرح وہ اندیشے کے عالم میں اپنی خود حفاظتی کے گُر بھی جانتا ہے۔ فیض کی یہ حرکت بڑی معصومانہ ہے۔ ایک رومانوی کی "کبوترانہ" حرکت۔ حالانکہ بلی کو کبھی تو شاذ ہی کھاتا ہے:

دل سے پیہم خیال کہتا ہے اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے کامراں ہوسکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

انتظار کی بات چلی ہے تو ظ۔ انصاری کے ان الفاظ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ "فیض کی شاعری میں انتظار کی کیفیت، تنہائی کا احساس اور شام کا رویّہ، تین عناصر شروع سے آخر تک بہت رہے ہیں اور اسی مناسبت سے انتظار، تنہائی اور شام کے الفاظ، ان کے رنگا رنگ استعارے، ان کے باریک سے باریک پہلو اور نازک رنگ بھی جا بجا ملتے ہیں جن لوگوں نے گرم مشرقی ملکوں کی بیمار شاموں کی نبض دیکھی ہے وہ مانیں گے کہ شاید ہی دنیا کے ادبی مشاہیر میں شام اور تنہائی کے احساس کو کسی نے ایسے اپنے سینے میں سمیٹا اور بیان کیا ہوگا جیسے فیض نے۔ فیض کی آواز اور اس کے تمام انداز اگر ایک جملے میں کہنا چاہوں تو اسے "شامِ انتظار کا تنہا شاعر کہوں گا"۔ فیض کی نظموں کے پس منظر میں پھیلی ہوئی اس دھندلی ڈوبتی ہوئی شام کے بارے میں جو اپنے مایوس رنگوں میں بڑی دل آسا لگتی ہے ظ۔ انصاری کہتے ہیں۔ "یہ کیسی شام ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ یہ کہاں کی تنہائی ہے جس کا مداوا نہیں کیا اس کا جواب اس قدر ہو سکتا ہے کہ شاعر کا حساس قلب و دماغ اور پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کا تصادم ان الفاظ کے پسِ پردہ چھپا ہوا ہے۔ نہیں یہ تو محض ایک پہلو ہے حقیقت کا، تنہائی کا احساس، شام کا وقت اور انتظار کی کیفیت یہ سب ایک ہی پرسوز کلر اسکیم ہے۔"

"تنہائی" کو فراق گورکھپوری نے اردو نظم کا ایک جیتا جاگتا کلاسیک کہا ہے۔ یوں بھی تنہائی معنوی، فنی، جمالیاتی اور سیاسی و سماجی لحاظ سے فیض کی شاعری کی معراج ہے اس کی موہومیّت کو جمیل جالبی نے مایوسی کا تلازمہ، جذباتی طور پر مصرعوں کی اندرونی وابستگی کہا ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ فیض کے اندیشوں کا فلسفہ، فیض کے اندھیاروں کا دکھ، فیض کی تنہائیوں کی المناکی، فیض کا وہ انتظار جسے لذتِ آزار بھی کہا جا سکتا ہے جو اس مختصر سی نظم میں بہت واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوان میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

یہ نظم ایک داخلی بلکہ انفرادی واردات بھی ہو سکتی ہے مگر اس نظم کا وہ خوابناک المیہ جو انتظار یہ سے شروع ہوتا ہے اور اسی دم توڑنے والے انتظار پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس تسلسل نے سانس لیتی تنہائی اور فضا کے اونگھتے اندھیرے کو بہت جاندار بنا دیا ہے اور اس نظم کی امیجری موہوم ہوتے ہوتے بھی مانوس نظر آنے لگتی ہے۔

ن۔م۔ راشد تنہائی کے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھے بارہا خیال آیا ہے کہ شاید یہ نظم بھی کسی سیاست میں اُلجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہے۔ کیا راہرو سے مراد کوئی نیا حملہ آور ہے؟ کیا تاروں کا ڈھلتا غبار اور ایوان میں لڑکھڑاتے ہوئے چراغ ہماری تہذیب اور مذہب کے بکھرے ہوئے شیرازے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کیا اجنبی خاک میں قدموں کے سراغ دھندلا جانے سے شاعر کا یہ مطلب ہے کہ اس سرزمین پر جہاں ہم صدیوں پہلے ایک ہنگامۂ ایک ہاؤ ہو لے کر آئے تھے آج اپنی ناگوار آب و ہوا اور اپنے ناپسندیدہ ماحول سے ہمیں زوال آمادہ قوم بنا دیا ہے۔ یہ لیکن شاید اس حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں نظم پر الزام لگانا اسے مجروح کرنا ہو گا۔ اس نظم کی کامیابی تو اس کی مجرد تاثیر میں مضمر ہے۔ اس نظم کی پشت پر شاعر کے ایک بے پایاں ذہنی تجربے کا پتا چلتا ہے۔ جس ذکی الحس شخص کو اپنی زندگی میں کبھی اداسی اور المناک شام بسر کرنے کا تجربہ ہوا ہو اسے اگر اس نظم کے مطالعے سے تنہائی کا بوجھ سنگِ گراں کی مانند اپنے کندھوں، اپنے جسم بلکہ سارے وجود پر محسوس ہونے لگے تو یہ نظم ایک بہت بڑی تخلیق ہے۔"

"تنہائی" کی عظمت کے بارے میں کچھ کہنا میرے لئے جسارت ہی نہیں بلکہ حماقت ہے کیونکہ وہ خود بولتی ہے اور اپنا لوہا آپ منواتی ہے۔ وہ سو فی صد ہمارے عہد کی نظم ہے جہاں ہر نارمل شخص بھی اپنی مختصر سی زندگی میں ایسی سینکڑوں شاموں کا تجربہ کر چکا ہے جن کی طرف راشد صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اس منفعل، ٹھہرے ہوتے، تھکے ہوئے خوابناک معاشرے میں تنہائی کا لب و لہجہ بے حد مانوس، میٹھا اور دھیما ہے جیسے ہمارے اندر ہی کوئی شخص سنبھل سنبھل کر ان لفظوں کا ورد کر رہا ہو۔ انتظار کے اس گوشے میں ماضی کی شاندار ریت حال کی محکومی مجبوری اور مستقبل کی بے یقینی سب کچھ موجود ہے کیونکہ فیض جس دریچے میں کھڑا سوچتا ہے اس کا قاری بھی اسی دریچے کا باسی ہے۔ جہاں چاند کے لٹ جانے کا دکھ اور ستاروں کے سرِ خاشاک برس جانے کا غم جاگتا رہتا ہے۔ یہ وہی دریچہ ہے جس میں ہزاروں صلیبیں گڑی ہیں اپنے اپنے مسیحا کے خون کا رنگ لئے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ تنہائی، کہاں جاؤ گے، درد آئے گا، کی لوٹن میں جہاں ایک موانست ہے وہاں اگر میں غلطی پر نہیں تو ان کی بحر بھی ایک ہے۔ یہ بحر فیض کی دلپسند بحر ہے۔ بڑی رواں دواں، سوئی ہوئی، نیم خواب بحر۔ فیض کو پوئٹ آف ڈکشن کہنا کوئی نئی بات نہیں البتہ اس کے لفظوں کا چناؤ اور پھر ان کی ترتیب اس کی شاعری کی نفسیات کو ہمارے لئے بہت آسان کر دیتی ہے۔ ان میں کچھ ایسے لفظ بھی ہیں جو لاشعوری اور اضطراری طور پر اس کے کلام میں جابجا ملتے ہیں۔ مثلاً درد کا شجر، رات کا شجر، رات کا گرم لہو، درد کا چاند، تنہائی کا زہر، ہجر کا دشت، درد کی شہر پناہ، دار کی خشک ٹہنی، قندیلِ غم، درد کے فاصلے، جوتے درد، بے خواب کواڑ، داغ داغ اجالا، شفق کی راکھ، دشتِ تنہائی، انتظار کا موسم، دلِ ریزہ ریزہ، نجاتِ دیدہ و دل، سفینۂ غمِ دل، تاریک بھیانہ طلسم، نیم خواب شبستان، آخرِ شب کے ہم سفر، کشتۂ واماندگیٔ شب، درد کے بے خواب تارے، غم کی چھال، فریاد کے ٹکڑے، طلسم کی چھاؤں، ہونٹوں کے سراب، آگ کی کچی کلیاں، وغیرہم۔ یہ ساری کی ساری تراکیب ایک ایسی اکائی سے متعلق ہیں جو فیض کے کلام میں اس کے امیج کی اکائی ہے۔ اردو شاعری میں غالب ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنی مخصوص تراکیب کو نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنی نظم و نثر پر مستعار رکھا ہے۔ اسی طرح وہ اقبال سے مختلف ہے کہ اس نے ان

تراکیب واستعارات میں اپنی ذات کو چھپانے کی بجائے اس کا واشگاف اظہار کیا ہے فیضؔ غالبؔ سے بے حد متاثر ہے ہر چند کہ اس کی شاعری اس کی ذات کا کچا چٹھا نہیں تاہم اس کے خوابوں اور اس کی حقیقی زندگی کی بہت ساری پرچھائیاں اس کی نظموں سے اکٹھی کی جا سکتی ہیں۔" غالبؔ کی شاعری میں انتشار کا احساس، نصب العین کی شکست اور راہوں کا غیر تعین اسے عہدِ جدید سے منسلک کر دیتا ہے۔"

فیضؔ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ غالبؔ کے کلام میں "ماضی کی شادابی اور رنگینی کی یاد، اس کے کھو جانے کا غم، حال کی بے کیفی اور ویرانی، مستقبل میں سہانے دنوں کی امید اور حسرت موجود ہے۔" ابھی تک فیضؔ کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ بھی یقیناً انہی رنگوں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ غالبؔ سے فیضؔ نے ان ساری چیزوں کے علاوہ کرب اور ڈرامائی انداز بھی حاصل کیا ہے اور اس کے 'تیشہ' لفظ کو 'اندیشہ' لفظ بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ غالبؔ کی تنہائی کا احساس، اس کی حسرتِ تعمیر، اپنی ذات کے علم کو بلند رکھنے کی خواہش، 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا' والی کیفیت ان سب سے بھی فیضؔ براہِ راست متاثر ہوا ہے۔

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

تو اور آرائشِ خمِ کاکل۔ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لیکن غالبؔ و فیضؔ میں نمایاں فرق ان کے لب و لہجے کا ہے۔ غالبؔ کی تلخیاں، اس کے اندیشے، اس کی لذتِ آزار کی خواہش ان سب کے پیچھے ایک بے حد تجربہ کار اور لاابالی کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ یہ آواز اپنے پیچ و خم کے باعث بے حد پہلو دار ہے۔ اس میں چٹان سے گر کر چور چور ہو جانے والے آئینے کی بازگشت موجود ہے لیکن فیضؔ غالبؔ کے

نقشِ فریادی اور دستِ تہ سنگ آمدی کے ہمراہ بھی بڑے مانوس، دھیمے اور رواں دواں لہجے میں اپنی واردات کہتا چلا جاتا ہے۔ وہ چونکانے کی صلاحیت نہیں رکھتا مگر دل میں اتر جاتا ہے۔ یہ لب و لہجہ حکیمانہ نہیں، مشفقانہ نہیں، بزرگانہ نہیں لیکن دوستانہ ضرور ہے۔

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست

غالبؔ اپنی شکست کی آواز ہے مگر فیضؔ کے ہاں ابھی یہ شکستگی کی منزل نہیں آئی۔ ابھی تو وہ اس ریزہ ریزہ ہوجانے والی ساعت کے خوف سے کانپ رہا ہے۔ اس کے دیدہ و دل کی نجات والی گھڑی ابھی نہیں آئی ہے اور اس کا سفینۂ غمِ دل کی منجدھار میں چکر کھا رہا ہے۔ اس کے بے تعبیر خوابوں کا سُرخ سویرا ابھی طلوع نہیں ہوا۔ اس نورانی صبح کا سورج ابھی شفق کی حدوں سے آگے نہیں آیا جس کی تمازت کے لئے فیضؔ کے خواب ٹھٹھر رہے ہیں۔ اسی لئے تو فیضؔ کے اندیشوں میں کمی ممکن نہیں۔ آخر میں فیضؔ کی ایک ایسی ہی نظم نقل کی جاتی ہے جو آج سے ۲۸ برس پہلے کی نظم ہے مگر اس کی ماورائیت میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ راہ کو خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں ہوئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مجتبیٰ حسین

نقشِ فریادی کی غزلیں

نقشِ فریادی میں فیض کی کل تیرہ غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کے بارے میں اگر کوئی سفارشی بات کہی جا سکتی ہے تو صرف اتنی کہ یہ فیض کی غزلیں ہیں۔ اب تک فیض کی جو شعری شخصیت بن چکی ہے وہ اتنی اہم ہے کہ یہ غزلیں ہی نہیں ان کی لکھی ہوئی کوئی بھی چیز اہم قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم "آج" کے فیض کو تھوڑی دیر کے لئے ذہن سے نکال کر ان غزلوں کو معروضی طور پر دیکھیں تو ان کے بارے میں زیادہ کہنے سننے کی گنجائش شاید نہیں رہ جاتی۔ یہ غزلیں فیض کے اندازِ بیان اور ان کی فکر کے ارتقا کو سمجھنے میں مشکل ہی سے کوئی مدد دیتی ہیں۔ کھینچ تان کر نقشِ فریادی کی آخری دو ایک غزلوں سے چند اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں ممکن ہے بعض "کن رسیوں" کو اس لہجے کی آہٹ سنائی دے جائے جو آگے چل کر فیض کا مخصوص لہجہ بن گئی جس میں فیض کی نظم شاہراہ کا تاثر سمویا ہوا ملتا ہے۔

دستِ صبا اور اس کے بعد فیض کے دوسرے مجموعے چھپے ہیں ان کی غزلیں یقیناً فیض کی غزلیں معلوم ہوتی ہیں اور ان میں وہی دلسوزی اور اسی کے ساتھ دلجمعی ملتی ہے جو ان کی نظموں کا وصف ہے ؎

ہجر کی رات ڈھل گئی   درد کا چاند بجھ گیا

یہ ان ہی کا مصرعہ ہے مگر یہ ان کی نظم کا بھی مصرعہ ہو سکتا ہے۔ نقشِ فریادی کے بعد کی نظموں اور غزلوں میں دو مختلف قسم اور سطح کی آوازیں نہیں ہیں۔ ایک ہی شعری شخصیت دونوں میں موجود ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ فیض کی غزلیں نظمیں ہو گئی ہیں اور نظمیں غزلیں بن گئی

ہیں ۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ غزلیں اور نظمیں جس شاعر کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہ فیض ہی ہیں دوسرا کوئی اور نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے ۔ اقبال کی غزل کا مطلع ہے ؎

میری نگاہِ شوق سے شور حریمِ ذات میں!
غلغلہ ہائے الاماں بُت کدۂ صفات میں!

اور ان کی نظم کا پہلا شعر ہے ؎

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں!

یہ دونوں شعر ایک ہی لکڑی کے دو پٹ ہیں ۔ نقشِ فریادی کی غزلوں میں یہ بات نظر نہیں آتی ۔ نظمیں ایک علیحدہ فضا رکھتی ہیں اور غزلیں ایک مختلف فضا میں سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان غزلوں میں ابھی کوئی فضا ہی نہیں ملتی ع

دل بغم و ختم جانے خریدم

کے اعلان کے بعد جو چند غزلیں اس مجموعے میں شامل کر دی گئی ہیں ان کے بارے میں بھی کوئی یقینی بات کہنی مشکل ہے ؎

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے
پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگذر سے

ان اشعار میں کچا پن ہے ۔ نورِ سحر کا سحر سے دست و گریباں ہونا اور ہر راہ کا ہر اک راہگذر سے کچھ کہنا محلِ نظر ہے ۔ لیکن ان باتوں سے بھی قطع نظر ان اشعار کے بارے میں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ فیض یہاں جان خریدنے کی تھوڑی بہت کوشش کرتے نظر آتے ہیں ۔ مگر غزل میں دل بغم و ختم کے بعد جان خریدی ہی نہیں جا سکتی اگر دل بغم و ختم کے معنی عشق کو تج دینا سمجھ لیا جائے ۔ ان اشعار میں ۳۶ء کے لگ بھگ کہی جانے والی بہت سی غزلوں کی آواز مل جائے گی اور شاید اس سے زیادہ پختہ اور پُر معنی ۔ جذبی کی ایک غزل ہے ۔ ۳۹ء کی ۔ اس میں ایک شعر ہے ؎

ٹھہر تو مطرب وہ آئی اک صدائے دردناک
آہ مطرب کچھ مزہ اب تیری تانوں میں نہیں

واضح رہے کہ ۴۳ء تک جذبی ع

اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

والی غزل کہہ چکے تھے۔ مجاز کی آہنگ ۳۰ء میں آچکی تھی۔ اس میں جو چند غزلیں ہیں ان میں غم جاناں اور غم دوراں کی کشمکش کے علاوہ وہی روانی اور چستی ملتی ہے جو ان کے پورے کلام میں موجود ہے "شورش دوراں بھول گئے" اور "پی بھی گئے چھلکا بھی گئے" جیسی جدید طرز کی غزلیں اسی مجموعے میں شامل ہیں۔ نقش فریادی کی غزلوں میں اگر کہیں کوئی بیدار ہوتا ہوا مصرع یا شعر ملتا ہے تو اس میں بھی کوئی اپنی گونج نہیں ہے۔ اس میں اس دور کے کئی شاعروں کی گونج مل جاتی ہے۔ فیض کی ایک اور غزل کا یہ شعر بھی دیکھئے جس میں پٹری کچھ بدلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ؎

سر خسرو سے ناز کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

اصغر اور جگر کی غزلوں کے بعد اس زمین میں اگرچہ طبع آزمائی بند نہیں ہوگئی ہے ع

تا قیامت کھلا ہے باب سخن

مگر اس کے لئے بقول میر صاحب "کچھ ہنر بھی چاہیئے" یہ زمین ہی ایسی ہے کہ کچھ ہنر، کچھ استادی کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک اور غزل ہے ؎

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے — وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں — تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن — دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا — تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض — مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے

غزل بظاہر بری نہیں ہے۔ ہموار ہے۔ روانی ہے اور فیض کے مزاج کے برخلاف مصرعے کچھ بولتے ہوئے بھی ہیں۔ مگر اس میں جذبہ نہیں جذباتیت ہے۔ فیض اس میں خود سے نہیں دوسروں سے

قریب معلوم ہوتے ہیں۔ جوشؔ کا بہت پرانا شعر ہے ؎

سَو سال اگر خزاں کے تو دو دن بہار کے
قرباں ہجومِ رحمتِ پروردگار کے

ممکن ہے آپ یہ سوچیں کہ اس طرح تو ہر شاعر کی غزل سے کئی شعر ایسے نکالے جا سکتے ہیں جو دوسروں کے اشعار کی بازگشت معلوم ہوں یا ان کی یاد دلاتے ہوں یا ان سے ملتے جلتے ہیں۔ غزل کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جن کو پڑھ کر اور سن کر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں شاعر کے یہاں اس نوع کے شعر مل جائیں گے مثلاً ــ اور اس "مثلاً" نے غزل میں بڑی دقت پیدا کر دی ہے۔ یہیں سے مختلف شعرا کے اندازِ بیاں، اندازِ نظر اور مدارج کی بات چھڑ جاتی ہے۔ غزل میں "یاد دہانی" کی ایک عجیب کیفیت پائی جاتی ہے۔ جو نظموں میں بہت کم ملتی ہے۔ نظم اپنی تمام وسیع النظری کے باوصف ایک انفرادی تجربہ ہوتی یا بن جاتی ہے۔ غزل اپنی تمام تنگ نظری کے باوجود اجتماعی تجربے کو سمیٹ لیتی ہے۔ ایک شعر بہت سے اشعار کو یاد دلاتا ہے۔ یاد دلی کے سلسلے پھیلتے جاتے ہیں۔ میرؔ۔ غالبؔ۔ حافظؔ۔ سعدیؔ۔ عرفیؔ۔ نظیریؔ اور بہت سے شعرائے اپنی تمام انفرادیت کے باوجود ایک دوسرے سے ہم ربط اور ایک دوسرے کے ہم زباں بن جاتے ہیں۔ غزل کی ہم زبانی ایک ایسی اجتماعیت رکھتی ہے جو مشکل سے کسی اور صنف میں پائی جاتی ہے۔ یگانہؔ کا مصرعہ ہے ؏

یہ کون حضرتِ آتشؔ کا ہم زباں نکلا

اس ہم زبانی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آتشؔ اور یگانہؔ ایک ہی شاعر کے دو مختلف تخلص ہیں۔ اسی لئے غزل میں بار بار "مثلاً" کا معاملہ پیش آتا ہے۔ جوشؔ نے اپنی جس نظم میں غزل پر شدید حملے کئے ہیں اس میں سب سے زیادہ غصہ اسی ہم زبانی پر پایا جاتا ہے۔ غالباً وہ نقالی اور ہم زبانی کو ایک ہی چیز سمجھ بیٹھے ہیں۔ اب مثلاً فیضؔ کا یہی شعر دیکھئے ؎

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اقبالؔ کا شعر سنئے ؎

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

غالبؔ کہتے ہیں ؎

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

ان اشعار کے بعد یہ بھی دیکھئے کہ ایک رنگ بدلتا ہے۔ ایک بات کتنی پہلودار بن جاتی ہے۔ اس میں کتنے گوشے، کتنے زاویے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہی "اپنی" اور بلبل والی بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ حافظؔ کہتے ہیں ؎

دریں زمانہ نشد کس حریفِ فریادم
بہ بلبلاں چمن ہم گلے فرستادم

نقشِ فریادی کی غزلوں کی کمزوری یہ نہیں ہے کہ اس کے کئی اشعار پڑھ کر دوسروں کے شعر سامنے آجاتے ہیں بلکہ یہ کہ اس میں ہم زبانی کا حق ادا نہیں کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں ایک غزل البتہ ایسی ہے جس میں فیضؔ اپنے لہجے کے قریب پہنچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ؎

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں!
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
ایک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں
نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں
یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لئے آخر
سکونِ قلب ادھر بھی نہیں، ادھر بھی نہیں

معلوم نہیں ابتدائی غزلوں میں فیضؔ کے یہاں "روٹھنے" کے لفظ سے اتنی دلچسپی

کیوں پائی جاتی ہے۔ روٹھ گئے دن بہار کے ۔ اس لفظ کا استعمال بڑی احتیاط اور سلیقہ چاہتا ہے۔ ذرا چوک ہوئی اور شعر ان لوگوں کی زبان بن جاتا ہے جن سے شاعر کو بچنا چاہیئے۔ استاد جلیل کے یہاں ایسی "روٹھنے" کو دیکھئے شاید اس لفظ کے برتنے کا انداز معلوم ہو سکے ؎

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی　　یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

اسی غزل کا ایک شعر قصداً چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس میں "حریم ہوس" میں دولت حسن کا ذکر تھا۔ ہوس کے ساتھ حریم کا لفظ میل نہیں کھاتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس غزل کی فضا فیض کی نظموں کو یاد دلاتی ہے ؎

نہ جانے کس لئے امید وار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

"تنہائی" میں یہی شعر اپنے جملہ امکانات کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت اور مکمل نظم کے قالب میں ڈھل گیا ہے۔ اس شعر سے جوشؔ کی ایک پرانی نظم پھر یاد آ گئی جس کا آخری شعر ہے ؎

اور یہ راز بھی نہیں کھلتا　　کہ مجھے انتظار ہے کس کا

بہر حال کہنا یہ تھا کہ یہ غزل اور چند گنے چنے اشعار ایسے مل جائیں گے جو فیضؔ کے رنگ کلام سے ہم آہنگ کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کو چھوڑ کر اگر ہم فیضؔ کی باقی ماندہ غزلوں کو یہ سوچ کر پڑھیں کہ یہ دس بارہ غزلیں کسی ایسے شاعر کی ہیں جس سے ہم مطلق واقف نہیں تو ان میں کوئی بھی "کرشمہ" نہیں ملتا بجز اس کے کہ بعض اشعار اور مصرعوں کی رومانی غمناکی بتا دیتی ہے کہ ان غزلوں کا شاعر نوجوان ہے۔ وہ کبھی غالبؔ کی طرف بڑھتا ہے اور کبھی داغؔ سے ملتی جلتی سادگی و پرکاری کو اپنانے میں کوشاں ہیں ؎

حسن مرہون جوشش بادۂ ناز　　عشق منت کش فسون نیاز

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی　　مے باندازۂ خمار نہیں

یہ دونوں شعر غالب نما ہیں۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ جس میں نظریں بکھیر دینے کی فرمائش کی گئی ہے۔ کسی بھی نوآموز شاعر کا ہو سکتا ہے۔ مگر دوسرے مصرعے میں پھر غالب کا اثر پایا جاتا ہے۔ان اشعار کے برعکس اب یہ اشعار سنیئے ؎

ہر حقیقت مجاز ہو جائے	کافروں کی نماز ہو جائے
دل رہینِ نیاز ہو جائے	بے کسی کارساز ہو جائے
منتِ چارہ ساز کون کرے	دردجب جاں نواز ہو جائے

ان میں زبان کا لطف پیدا کرنے کا رجحان ملتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے اس قسم کی غزلوں کا شاعر ابھی لفظوں کو آزما رہا ہے۔انہیں ہم رشتہ کرکے ان کے اندر کسی چیز کو تلاش کر رہا ہے۔اس کے دل ودماغ کے پنہاں تقاضوں اور آرٹ کے از خود عیاں تقاضوں کے درمیان گفت و شنید کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچی ہے۔

ان غزلوں کو اگر نقش فریادی کے آہنگ سے ملاکر پڑھیں تو بھی یہ ایک دوسرے کا جزو نہیں معلوم ہوتیں۔نقش فریادی کی ہر نظم اپنے آہنگ اور مزاج کے لحاظ سے شاعر کی انفرادی شخصیت کی تصدیق ہے۔ان نظموں میں ایک نئی آواز ملتی ہے جو رنگ، موسیقی اور درد کی ہلکی ہلکی لہروں سے مل کر بنی ہے۔ان نظموں میں نہ ہجر ہے نہ وصال ہے بلکہ ایک ایسی انوکھی کیفیت ہے جو ان دونوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ان میں ان پھولوں کی بھینی بھینی مہک ہے جو اندھیرے میں کہیں کھلے ہوئے ہیں۔یہ مہک ہم تک پہنچتی ہے مگر پھولوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ بڑی خوبصورت نظمیں ہیں نقش فریادی کی، اردو میں ان سے کہیں توانا، پہلودار اور طویل نظمیں موجود ہیں۔مگر اتنی نازک نظمیں زیادہ تعداد میں شاید نہ ملیں۔ان نظموں کے پہلو بہ پہلو جب ہم فیض کی غزلوں کو رکھتے ہیں تو ہماری مایوسی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔نظموں کے لہجے میں شعری صداقت ہے۔غزلوں میں غزل کہنے کی کوشش ہے۔ان میں تو "وہ" بات بھی نہیں ملتی جو نقش فریادی کے پہلے دو اشعار میں ہے ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

نقشِ فریادی کی تمام غزلیں ہلکی پھلکی رومانی انداز کی ہیں جو تو مشقی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں مگر نو مشقی میں بھی کبھی کبھی ایسی تخلیقی تازگی مل جاتی ہے کہ پڑھنے والا معائب اور اسقام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ان میں یہ چیز بھی نہیں نقشِ فریادی میں شاید نظم گو فیض کا مزاج غزل کے اس مزاج کو قبول نہیں کر سکا جو غزل گوئی میں انفرادیت کو ابھارنے کے باوجود جتا تا رہتا ہے کہ صنفِ غزل کے کچھ اپنے بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ دستِ صبا اور اس کے بعد کے مجموعوں میں ہمیں یہ انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ دیکھیں اس غزل میں فیض کب اور کیسے نمودار ہوتے ہیں۔ ویسے نقشِ فریادی کی غزلیں بھی آنے والی غزلوں کے انتظار میں معلوم ہوتی ہیں۔ فیض کی کئی غزلوں میں "انتظار" کا لفظ بار بار ملتا ہے۔ نقشِ فریادی کی پہلی غزل کا ایک شعر ہے ؎

تو ہے اور اک تغافلِ پیہم — میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

عشق منت کشِ قرار نہیں — حُسن مجبورِ انتظار نہیں

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

چارۂ انتظار کون کرے — تیری نفرت بھی استوار نہیں

تیسری غزل کا شعر ہے ؎

لطف کا انتظار کرتا ہوں — جور تا حدِ ناز ہو جائے

ایک اور غزل کا شعر ہے جو پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے۔ اس میں انتظار کا لفظ تو نہیں ہے۔ مگر کیفیت وہی ہے ؎

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

نقشِ فریادی کے بعد فیض کی غزلیں وہاں تک پہنچ گئیں جو "اس کی" بھی رہ گذر ہے اور غزل کی بھی رہ گذر ہے۔ مگر ایک بات ملحوظ رہے۔ غزل کی "رہ گذر" کبھی کبھی "اس کی" رہ گذر سے بھی زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ فیض کو اب بھی اس راہ سے بہت سنبھل کر گذرنا ہے۔

عتیق احمد

زنداں نامہ کی غزلیں

زنداں نامہ کی شاعری کا دور عجیب و غریب تضادات اور ستم ظریفیوں کا دور تھا۔ ایک طرف فیض قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے جو خود استغاثے کی نظر میں "دو بخت و نیز" کی منزلوں کو بھی پوری طرح نہیں پہنچ پائی تھی دوسری طرف پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم کے قتل میں ملوث اصل سازشی رفتہ رفتہ اعلیٰ ترین عہدوں اور راج سنگھاسن پر براجمان ہوتے جا رہے تھے۔ ان ہی دنوں فیض نے کہا تھا

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت داماں

رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

رندی اور سلامت دامنی کی یہی ستم ظریفانہ فضا سارے ملک میں انتظامی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی فضا پر پنجے گاڑے اس نومولود مملکت کے نئے بنتے اور ڈھلتے ہوئے ذہنوں میں اس دو عملی اور دورُخے پن کو جنم دے رہی تھی جسے ہم اپنی گذشتہ تاریخ میں کبھی میر جعفر اور میر صادق کے حوالوں سے اور کبھی ڈوپلے کی دو عملیوں سے ہدفِ تنقید و تحقیر بناتے رہتے ہیں۔

زنداں نامہ کی شاعری میں فیض کے بیشتر موضوعات اور شعر و سخن کا محور یہی منافقت آمیز ماحول ہے جو ان کی طرح ہر حساس دل، ہر سوچنے والے دماغ اور ہر دیدۂ بینا کے لئے سوہانِ روح ہے۔

دستِ صبا پر لکھتے ہوئے ممتاز حسین نے فیض کی شاعری پر لیلائے وطن سے محبت کے دائمی اثرات کی جامعیت اور گیرائی کا اعتراف کیا اور لکھا تھا "اس جامعیت اور گیرائی کے باوجود یہ خلش باقی رہتی ہے کہ اس عرصے میں ہم پر جو کچھ گذری ہے اس کی مکمل روداد نہیں اور جو گذرنے والی ہے اس کے خلاف آہنی آواز نہیں۔ ... ہمیں امید ہے کہ جب (فیض) جیل سے نکل کر آئیں گے اور ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا ناسُو اور بھی کشادہ ہو چکا ہوگا تو وہ ہمیں رمز و اشارات کی دنیا سے نکال کر کچھ ہمیں اپنی تاریخ کا پتا بھی دیں گے۔

اور کچھ اس زندگی کو اور بھی بے نقاب کریں گے جس کا شعور تند و تیز ہونے کے باوجود اب بھی سایۂ گل میں ہے۔"

فیض کے قید و بند کا دور گذرے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ اتنا ہی عرصہ کم و بیش ممتاز حسین کے اس مضمون کو بھی ہو چکا ہے۔ جن دنوں یہ مضمون لکھا گیا تھا فیض کی شاعری اور شخصیت نقشِ فریادی کے اولین تاثر کی زد سے باہر نہیں نکل پائی تھی۔ پھر بھی ممتاز حسین نے بڑی دیدہ ورانہ کاوش سے فیض کے اندر کی دنیا سے عام قاری کا رابطہ قائم کر دیا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان دنوں کی شاعری پر ابھی سایۂ گل، کچھ زیادہ ہی دبیز تھا۔ یہ سایہ زنداں نامہ کی شاعری تک پہنچتے پہنچتے بھی رہا مگر بہت بڑی حد تک چھدرا ہو چکا تھا۔

فیض کی شاعری کا آرٹ، موضوع، مواد، اظہار، لہجہ، فنی رویے اور زبان کا ایسا گاڑھا اور یک جان قوام ہے کہ اس میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم فیض کے موضوعات کو ان کی امیجری، تشبیہات، استعاروں اور زبان و بیان کی دوسری فنی بنت سے علیحدہ کر کے اسی طرح گفتگو کر سکیں جس طرح غالب یا جوش کی لغات (ووکیبولری) پر بات کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ بہت کچھ چھدرا پڑ جانے کے باوجود آج بھی فیض کی فکر پر سایۂ گل کچھ اس طرح سے عکس فگن ہے کہ وہی اک بات جس کا ذکر فیض سارے فسانے میں نہیں کرتے بادروں کی گدڑیوں اور تھگلوں کی اڑان کا مطمحِ نظر بن جاتی ہے۔

بہر حال زنداں نامہ کی شاعری میں ایک بڑا فرق یہ نظر آتا ہے کہ یہاں فیض کی اس فکری پختگی میں جو بدلتے ہوئے ماحول پر مستقل نظریں جمائے ہوئے رہنے کی بنا پر ان کے اندر پیدا ہوتی رہی ہے گہرائی اور استقامت نے ان کے اظہار کو زیادہ واضح اور زیادہ پر معنی تو بنایا ہے ہی ان کے قاری کو بھی لایعنی تاویلات کے جال سے نکلنے میں مدد دی ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

گر فکرِ زخم کی تو وفادار ہیں کہ ہم ‏ کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

یوں بہار آئی ہے کہ اس بار کہ جیسے قاصد ‏ کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

پوری کی پوری غزل سامنے رکھ لیجئے یہاں وہی مروّجہ لغات برتی گئی ہے جو ہماری کلاسیکی غزل کی عام زبان ہے۔ وہ تراکیب، وہی اشارے کنائے، کوچۂ محبوب، قاصد، پیام نامہ، رقیب، سزا خطائے نظر سے پہلے کی وہی رسم کہ جو تھی، وہی تقاضائے مصلحت کی آڑ، وہی تقاضائے دردِ دل کا بہانہ کہ کوچۂ محبوب میں ہیرا پھیری کا جواز نکلے، وہی محبوب کا سراپا اور اس کی پھبن اور وہی عاشق کی روایتی بیتابی اور وصال کی لگن — لیکن نہ اب محبوب ڈھکا چھپا ہے اور نہ کوچۂ محبوب کی راہ واہموں اور خوفِ رسوائی کی دھند میں لپٹی ہوئی۔ یا یوں کہیئے کہ اب نہ نقشِ فریادی والی لاسمتی ہے کہ اس پر سے لامقصدیت کی دھند چھٹ چکی ہے اور نہ دستِ صبا پر کا گہرا سایۂ گل کہ راہ کی سختیوں اور منزل کے لئے سرفروشی کے جذبے پر پڑے ہوئے حریر و پرنیاں دوسری طرف جھانکنے کی اجازت نہیں دیتے۔ مصلحت کے تقاضے اب بھی ہیں۔ کہ ہر کس ناکس کو "عشقِ محبوب" کا درس نہیں دینے دیتے مگر دل کے تقاضے ہیں کہ دل و زبان پر پہرے ہونے اور اسیری کے بندھنوں میں جکڑے ہونے کے باوجود ذکرِ محبوب جاری اور یہ محبوب "وطن" ہے کہ جس کی خاطر دل اور زبان سنبھلنے کی آزمائش اور ابتلا سے فیض گذر رہے ہیں۔ بیلائے وطن، اور صرف وطن، کا استعمال ہمیں فیض کے یہاں رومانویت کی فضا سے نکل کر بکھ ایسی کھردری حقیقتوں کے اعتراف کی نشاندہی کرتا ہے جو "سایۂ گل" کے زیرِ اثر منزل تک پہنچنے کی راہ کو ایک رومانوی آدرش بنائے ہوئے تھے۔ لیکن پھر تلخیوں کے احساس نے کھردری حقیقتوں کی سنگلاخ راہوں کا احساس دلایا۔

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

غزل کی کلاسیکی روایت میں یہ شجاعت نمائی (دشمنی دل ری) بے حد نمائشی بات رہی ہے لیکن انقلابی رومانویت پسندی کا طلسم ٹوٹنے کے بعد جس طرح فیض نے اِس غمِ ناکامی کو اپنے خون کی گردش میں شامل کر کے نئے حوصلے کی بات کی ہے۔

بادِ خزاں کا شکر کرو فیض جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل کے آئے ہیں

وہ ہمیں اپنی کلاسیکی شاعری میں غالب کے علاوہ دوسروں کے یہاں بربنائے تکلف سے زیادہ نظر نہیں آتی۔

فیض کی غزل نہ روایتی سرمایہ کی صدائے بازگشت ہے نہ اس کا چربہ۔ وہ ہمارے احساس اور ذوقِ جمال کے میڈیم کے ایک رُخ کی جھلک ضرور ہے مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ دراصل مشکل یہ ہے کہ خود فیض تو مقام در مقام راہ انقلاب کی تمام رومان انگیزیوں سے گذر کر کہہ رہے ہیں۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اور ہماری غزل پڑھنے والی شریف مخلوق فیض کی غزل کو متن سے کاٹ کر بار باران غزلوں کے زبان و بیان، استعاروں، محاکات اور کلاسیکی پیٹرن پر داد دستند کے ڈونگرے برسانا چاہتی ہے۔ یہ تو بالکل ویسی ہی بات ہے کہ کسی قدیم خوبصورت برتن کو توڑ پھوڑ کر اس کے ٹکڑوں کو محض کلاسیکی سرمایہ سمجھ کر ڈرائنگ روم کے تابدان پر بطور فیشن سجا لیا جائے اور اس کے انسانی اور تاریخی پس منظر کو طاقِ نسیاں کر دیا جائے۔

زنداں نامہ کی غزلیں بھی اسی درجے کی کلاسیکی پیٹرن کی غزلیں ہیں جس درجے کی "نقش فریادی" اور "دست صبا" کی غزلیں ہیں لیکن "نقش فریادی" سے "زنداں نامہ" تک کے درمیانی وقفوں کے سفرِ تاریخ کو نظر انداز کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ زنداں نامہ کی غزلیں تو ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک کے تاریخی سفر کی بالکل ویسی ہی داستان ہے جس طرح فیض کی غزل کا کلاسیکی پیٹرن ولی سے خود فیض تک کی کلاسیکی روایت کے عروج و ارتقا کی داستان مسلسل ہے۔ ان غزلوں کے کلاسیکی پیٹرن میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک کے حوالوں سے اس دور کی ظلم اور بربریت شعار نوکر شاہی کا سلسلہ ماضی میں انیسویں صدی کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی عیاریوں اور چالاکیوں کی داستان سے جا ملتا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

دستِ تہ سنگ کی غزلیں

"زنداں نامہ" (۱۹۵۶ء) سے "دست سنگ" (۱۹۶۵ء) تک فیض نے کل گیارہ غزلیں کہیں جو مؤخر الذکر مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان غزلوں کی تخلیق کی نو سالہ مدّت کا احوال اور اس کی روداد فیض نے "دست تہ سنگ" کے مقدمے کی آخری سطور میں نہایت مختصر بیان کی ہے۔ اس سے ان کی غزلوں میں شامل احساسات، خیالات، اور پھر اشارات و کنایات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کلام کا یہ مجموعہ پہلے تین مجموعوں کے مقابلے میں اپنی سج دھج، نفس مضمون، جمالیاتی کیفیت اور تاثر کے اعتبار سے قدرے مشترک اور قدرے مختلف ہے۔ اس مختصر لیکن وسیع دنیا میں وہ سب کچھ بھی موجود ہے جو دوسرے مجموعوں میں ملتا ہے اور وہ بھی ہے جو دوسروں میں نہیں ملتا۔ اس کی قدر مشترک فیض کی شخصیت اور ان کا احساس ہے جو ہر مجموعے میں اپنا اظہار قریب قریب یکساں طور پہ کرتا رہا ہے اور یہ فرق میری نظر میں ایک بنا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود اس عہد کی نوعیت کے سبب ہے، جس کے پس منظر میں فیض نے یہ غزلیں تخلیق کیں۔

"نقش فریادی" سے "زنداں نامہ" تک فیض کی شعری خصوصیات و مزاج کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ فیض نے ایک تو وقت کے ان مسائل کی ترجمانی کی ہے جن سے اجتماعی جذبات وابستہ ہوتے ہیں، دوسرے فیض نے زبان و

بیان کے ایسے پیرایے استعمال کیے جو عموماً مانوس اور پُر اثر تھے۔ تیسرے یہ کہ فیضؔ کے شعری مزاج میں ذاتی درد و غم کی کسک بھی موجود ہے۔ پھر انھوں نے شاعری کی مثبت روایات سے اپنی شاعری کو علیحدہ نہیں رکھا۔ ایک تو پرانے استعارے استعمال کیے لیکن اس سے بڑھ کر نئے اور مخصوص معاشرتی و سیاسی پس منظر کے حامل استعارے بھی تخلیق کیے۔ منفرد علامتیں بھی استعمال کیں، روایتوں سے کام لیا اور نئے تجربوں سے استفادہ بھی کیا، زبان کے مانوس اسالیب بھی اختیار کیے اور اپنی ترکیبیں بھی وضع کیں جو خاصی معنی خیز اور انفرادی شان بھی رکھتی ہیں۔ اپنے مخصوص نظریات کو جذبات کے طور پر محسوس کیا۔ لیکن بغاوت اور نعرہ زنی سے دور رہے۔ ان کی نظر اظہار پر رہی۔ رومان سے حقیقت تک اور حقیقت سے رومان کی طرف ان کی آمد و رفت ابتدا سے اب تک جاری ہے۔ یوں ابتدائی شاعری کے نمونوں میں بھی ایک داخلی رومانی کیفیت ہے جو درد آمیز بھی ہے اور آگاہی بھی بخشتی ہے۔ ان میں دل کا درد اور نظریے کا درد الگ الگ بھی نظر آتا ہے مگر کہیں کہیں خلط ملط بھی ہو جاتا ہے۔ رومان اور انقلاب کی آویزش "نقش فریادی" تک محدود نہیں، دوسرے مجموعوں تک یہ کشاکش چلی آئی ہے۔ بنیادی طور سے "نقش فریادی" کے بعد "دست صبا" اور "زنداں نامہ" میں شامل ان کی بیشتر تخلیقات انھیں ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوا تھا۔

فیضؔ کے لیے "زنداں نامہ" کے بعد کا زمانہ کچھ افراتفری کا زمانہ ہے۔ جس میں ان کا اخباری پیشہ چھوٹا، ایک بار پھر سے کچھ انسداد راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کا آئینہ دار ان کا چوتھا شعری مجموعہ "دست تہ سنگ" ہے۔ اپنے اس پس منظر میں فیضؔ کی شاعری کا اصل قابلِ لحاظ عنصر رومان و حقیقت اور جستجو و آرزو کی وہ کیفیت ہے جو شاعر کے قلب اور روح میں جاگزیں ہے۔ اس کی شخصیت سالم نہیں رہی اس میں انقسام و انتشار پیدا ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ چیز تو پہلے بھی بڑی شد و مد سے اپنا اظہار کرتی رہی ہے۔ اب محرومیوں اور ناآسودگیوں

نے اس کے دل کو محشر آرزو بنادیا ہے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ذہنوں میں رومان و انقلاب کا امتزاج ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ فیض اس امتزاج و کشمکش کی کیفیات و احساسات کو اپنے خاص اسلوب میں بیان کرتے رہے ہیں۔ پہلی صورت باعث تسکین ہے تو دوسری نجات کے لیے ضروری۔ عقل دار کی طرف بلاتی تھی تو دل کوچۂ جاناں کا مکین تھا۔ فیض کے اجتماعی شعور میں الجھن اور اختلاف کا سرچشمہ ان کے نصب العین کی مادیت ہی ہے۔ ان کے پیش نظر زندگی کا منتہائے مقصود جسم کی راحت اور حواس کی تسکین رہا ہے۔ چنانچہ انقلاب اسی رومانی مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔ غم روزگار وصال محبوب کی راہ میں رقیب بن کر حائل ہوگیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جس فن کارانہ چابک دستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کرکے پیش کیا۔ یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں بالکل نئی اور منفرد مثال ہے۔ نئی اور مستحسن بھی۔

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پس خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

فیض کی شاعری کا رومانی پہلو نہایت دلآویز ہے۔ رومانیت ان کی شخصیت اور شاعری کا بڑا اہم وصف ہے۔ ان کے فکروفن دونوں میں رومانیت کی جلوہ گری اور کارفرمائی شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ فی الحقیقت اس وقت وہ اردو شاعری کی عشقیہ روایت کے منفرد اور واحد امین ہیں۔ محبوب کی دلفریب اداؤں کا محسوس و معتبر بیان جس کیف و لطافت کے ساتھ ان کے کلام میں نظر آتا ہے اس کی مثال ان کے ہمعصر شاعروں میں نہیں ملتی۔ وہ وصال کے شاعر ہیں لیکن فراق کے تاثر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں فراق کے حرمان و یاس کا سایہ نہیں۔ زیادہ تر وصال کی شادکامی اور نشاط کی پرتاثیر آب و تاب ہے۔ ان کا عشق بہت لطیف اور شاداب ہے۔ یہ محض ان کا شاعرانہ تخیل معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ عام رومانوی شاعروں کے ہاں ہے بلکہ یہ ان کا انسانی جذبہ بن گیا ہے۔ یہ شاید اس لیے بھی ہے کہ فیض کے وجود وفن میں حواس ہی کا غالب عنصر نمایاں رہتا ہے۔ زیر نظر مجموعے کی بیشتر غزلیں اس عنصر کا نمایاں اور بھرپور

اظہار کر رہی ہیں۔

چھلک رہی ہے ترے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

فیضؔ اپنے کلام میں با ذوق جمال پسند ہیں۔ نسائی حسن ان کے اعصاب پر طاری ضرور ہے لیکن یہ خارج سے ہوس انگیز ہونے کے بجائے داخلی طور پر اس درجہ جاگزیں ہے کہ تاثر میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مستقل پرسکون کیفیت موجود رہتی ہے۔ یہ کیفیت ضبط اور سلیقے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کیفیت کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ فرد کا جذبہ ساری کائنات پر مرکوز ہو جاتا ہے یا وہ اپنے اندر مناظرِ فطرت کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ فطرت کے حسین و دلکش مظاہر محبت کا صرف پس منظر ہی نہیں رہتے محرک بھی بن جاتے ہیں۔ ایک دلکش فضا عموماً عشقیہ استعارات سے تیار کی جاتی ہے۔

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

اس دلکش فضا کے کیف کی تکمیل کے لیے ایک بے نام سی خلش، مبہم سی آرزو بھی تحریک پیدا کرنے لگتی ہے۔ مجسم عشق کے اس وفور کا لازمی نتیجہ ایک دائمی تشنگی کا احساس ہے۔ فیضؔ کا تصوّر وصال سے اس قدر معمور ہے کہ انتہائے کار درد کی کسک پیدا ہوتی ہے۔ گرانبار لذتیت کا خمار ہمیشہ طاری نہیں رہ سکتا۔ خمیازہ اس کا فطری نتیجہ ہے۔ نا آسودگی اور بے تابی کے احساسات اسی سبب سے فیضؔ کے کلام میں وافر ہیں۔ ان کی دردمندی محض یاس و محرومی کا نتیجہ ہی نہیں شادکامی کا سبب بھی ہے۔ اسی لیے اس میں تلخی نہیں صرف حسرت ہے۔ اس کی مثالیں زیرِ نظر مجموعے میں بکثرت ملتی ہیں۔

دل و جاں فدائے راہے کبھی آکے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے دل سلگنے لگے داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی
کب جان لہو ہوگی کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی
کب مہکے گی فصلِ گل کب بہکے گا میخانہ
کب صبحِ سخن ہوگی کب شامِ نظر ہوگی
کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

شرحِ فراق مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں
یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل ربا کے نام پہ خالی سبو کریں
سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں
کب تک سنے گی رات کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں

چونکہ فیض کی شاعری عشق کی تشنہ کامیوں کا اظہار کرتی ہے اس لیے اس کا ایک نمایاں وصف یاس وملال اور حزن وحسرت کی کیفیت بھی ہے۔ اس کیفیت اور اس کی فضا کو تخلیق کرنے میں فیض کو جو کمال حاصل ہے اس کی مثال بہت کم شاعروں میں ملتی ہے۔ وہ کم سے کم لفظوں میں ذہنی کیفیات کی تصویریں کھینچ دینے پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی تصویر کشی اور حقیقت نگاری ہمارے احساسات کے لطیف پردوں سے ٹکراتی ہے۔ تسلسل، ربط، احساسات کی نزاکت اور خفیف ساحزن اس شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بجھ گئے ہیں
قریب آاے مہِ شبِ غم نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پر ہوا جام ارغواں کی طرح

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض نے شکستہ دلی اور محرومی و یاس کی ترجمانی کے باوجود اپنی شاعری میں شکست خوردہ ذہنیت کو راہ نہیں دی۔ ان کے کلام میں شکست خوردگی کے بجائے وہ رجائیت بھی شروع سے ہی موجود ہے جو ناسازگار حالات کو بدلنے کے حوصلے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چونکہ وہ حساس دل کے ساتھ ساتھ بیدار ذہن بھی رکھتے ہیں اس لیے اس دنیا کے دکھ درد کی طرف ان کا رویہ وہ نہیں جو فراریت پسندوں کا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ بھی غمِ دوراں کو غمِ جاناں کی شدت میں کمی کا جواز ٹھہرانے لگتے۔

رت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا اشک امڈے کہ ابرِ بہار آگیا
فیض کیا جانیے یار کس آس پر منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں دلفگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

اس مجموعے کی بعض غزلیں سیاسی مزاج اور سیاسی کرب کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ اس میں نہ صرف ان کے ذہن کا تمام درد و غم بلکہ شعور و احساس بھی موجزن ہے۔ ان میں فنی اختصار و ارتکاز اور عبارت و اشارت بڑی معنی خیز ہے۔ ان غزلوں

کا محرک ہنگامی سیاسی واقعات سہی لیکن ان کا حسن اور تاثیر لازوال ہیں۔ سیاست اور غنائیت کا ایسا حسین امتزاج مثالی ہے ـــــــ جو آج کے دور میں فیضؔ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان میں ایک مخصوص آواز اور منفرد لہجے کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بلا شبہ کہی جا سکتی ہے کہ غزلوں میں فیضؔ کی انفرادیت عاشقانہ تاثرات کی بہ نسبت سیاسی تصوّرات کے اظہار میں زیادہ نمایاں ہے۔

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ دار سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

لو سنی گئی ہماری یوں پھرے ہیں دن کے پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے وہی فصلِ گل کا ماتم

فنی اعتبار سے یہ اشاراتی انداز بڑا کارگر ہے۔ تلخ سے تلخ بات کہتے ہوئے بھی متانت کا پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔ رمز و کنایہ نے ہمیشہ ایک لطیف قسم کی ترشی برقرار رکھی ہے۔ اس لیے فیضؔ کا وار بھرپور اور کاری ہوتا ہے۔ اور وہ شعریت کا

دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ اور یہی شعریت عموماً ان کے پیغام کو پروپیگنڈا ہونے سے بچا لیتی ہے۔ چونکہ ان غزلوں میں ماجرائے دل کے ساتھ ساتھ تقاضائے وقت کی طرف بھی اشارے ہیں اس لیے ان میں علامتوں اور استعاروں سے بھی خاص طور پر کام لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے پرانی علامتوں اور پرانے استعاروں کو بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے کلام میں 'جنون' 'قاتل'، 'مقتل'، 'شام و سحر'، 'بہار و خزاں'، 'منصف'، 'مسیحا'، 'شیشۂ و جام'، 'قفس'، 'فصلِ گل'، 'صبحِ فردا' یہ تمام استعارے سیاسی مفہوم و اشارات کے حامل ہیں۔ فیض کے تخیل پر نقوش ہمیشہ استعارے و کنائے کی صورت میں نازل ہوتے ہیں۔ ہر مفہوم اپنا مخصوص رنگین پیرہن لے کر ابھرتا ہے۔ ان کے تاثرات میں حسیت اور تجسیم کو بہت بڑا دخل ہے۔ ان کے کلام میں مجرد تصورات مفقود ہیں۔ جو خیال بھی وہ پیش کرتے ہیں ان میں حسیت کی کوئی نہ کوئی کیفیت یا ملی جلی کیفیات ضرور موجود رہتی ہیں۔ اور یہ کیفیات رنگ برنگ کی تشبیہیں اختیار کرتی رہتی ہیں۔

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح
پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پر ہوا جامِ ارغواں کی طرح
یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح
جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

فیض کا مخصوص رنگِ کلام کچھ اسی قسم کے نقوش سے آراستہ ہے۔ یہ تشبیہات معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی تحلیل سے اثر پذیر ہوئی ہیں۔ یہاں اشعار و تشبیہات

دونوں ایک دوسرے کے ممنونِ احسان ہیں۔ ان کے زیرِ نظر مجموعے کی غزلوں میں اس نوعیت کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ حشر، جنون، دار، لہو، دشمن، سنگ، داغ، جام، حسن، چراغ، کرن، گل، شام، گلشن، سحر، دل وغیرہ۔ ان کی تصویر کاری کا انداز اپنا ہے۔ وہ استعارے سے بکثرت کام لیتے ہیں اور تفصیلی تصویر کشی بہت کم کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ایما، اشارہ اور اجمال کی بلاغتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں استعارے کا خاص استعمال عجیب ہونے کے باوجود دلکش ہوتا ہے۔ یہی صفت تراکیب کے استعمال میں بھی ہے۔ وہ مضمون کی بنیاد پر تراکیب کو دور کی مناسبتوں اور قربتوں پر باندھ کر قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ اور قاری اس کیفیت میں مضمون کی گہرائی تک محو ہو کر گزرتا ہے۔ ان کی بیشتر تراکیب خاصی معروف ہوئی ہیں۔ تراکیب کا استعمال شاعری میں ایک توسیعی عمل ہوتا ہے۔ فیض نے ادبی روایات اور لسانی و صوتی موزونیت کا لحاظ کرتے ہوئے تراش و خراش اور وضع و ایجاد سے بھی کام لیا ہے۔ بعض ترکیبیں جو انھوں نے تخلیق کی ہیں وہ غالب کی تراکیب سے کم جیت اور کم خیال انگیز نہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں ان کی ایسی تراکیب دیکھنے میں آتی ہیں۔ حرفِ لطف، شمعِ وعدہ، خونِ دلِ وحشی، لبِ مشکبو، پیمانِ جنوں، سرکوئے دلفگاراں، صبحِ سخن، شامِ نظر، جنونِ رخِ وفا، قامتِ جانانہ، دعوتِ قتل، ناوکِ نیم کش، کاسۂ داغ، جنونِ گم گشتہ، دلِ ریزہ ریزہ، تنِ داغ داغ وغیرہ۔ ان کے طریقِ تعبیر کی جدت و ندرت نے فرسودہ نکات کو بھی تر و تازہ و درخشاں کر دیا ہے۔ فارسی ترکیبوں کا یہ استعمال، ان غزلوں کی زبان، بیان اور لہجہ میرا خیال ہے کہ ایک نمایاں خصوصیت کی حیثیت سے ان کی شاعری میں ہمیشہ پایا جائے گا۔

فن اور تاثیر کے لحاظ سے جہاں تک اس مجموعے کی غزلوں کا تعلق ہے ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض کے کلام میں معمولات اور شعروں کی جو ترتیب

اور تقسیم ہے وہ خیالات کی رو اور جذبات کی روانی سے عین مطابقت رکھتی ہے اس مجموعے کی بیشتر غزلیں "نقش فریادی" کی غزلوں سے بڑی حد تک اور دستِ صبا اور "زنداں نامہ" کی غزلوں سے قدرے مختلف ہیں۔ زبان، بیان، اور موضوع کے اعتبار سے "نقش فریادی کی غزلیں واردات قلبی کی حیثیت رکھتی ہیں "دست صبا" اور زنداں نامہ' کی غزلیں عشقیہ تاثرات کے ساتھ ساتھ سیاسی تصوّرات سے بھی آراستہ ہیں "دست تہ سنگ" کی غزلیں ایک ذہنی انتشار، کچھ نئی راہوں کی طلب کے احساس، تشنگی، آرزو اور انتظار کی آئینہ دار ہیں۔ یہ غزلیں مختلف آوازوں، مختلف رنگوں اور مختلف لہجوں سے عبارت ہیں۔ اور ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے ہر آواز، ہر رنگ اور ہر لہجہ خود فیض کا ہے۔ جب کہ اس سے قبل کی غزلوں میں فیض پر غالب اور اقبال کا بڑا خوش گوار اثر ملتا ہے اس مجموعے کی صرف ایک غزل کا مطلع یہ ہے۔

شرحِ فراق مدحِ لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

ذوق کی زمین میں کہی گئی ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں فیض اساتذہ کے اثر سے بڑی حد تک آزاد ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ان غزلوں میں فیض نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔ ان میں ایک مخصوص آواز منفرد لہجے کا احساس ہوتا ہے۔

زبان و بیان کے تعلق سے ایک اور بات جو دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں اس میں مستحسن ہے یہ ہے کہ اس میں وہ کوتاہیاں اور خامیاں نظر نہیں آتیں جن کی طرف مختلف ناقدین نے توجہ منعطف کرائی تھی، پہلے مجموعوں کے مقابلے میں اس مجموعے کی غزلوں میں زبان و بیان کے اعتبار سے خاصی ہمواری اور پختگی پائی جاتی ہے۔ ویسے ان کوتاہیوں سے قطع نظر بھی کہ جو انھوں نے بیان و بلاغت کے ضمن میں روا رکھی ہیں، ان کی شاعری کے سحر سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں بھی ایک سحر کارانہ حسن اور دلکشی ملتی ہے۔ اس کا راز نہ صرف ان کے خلوص اور جذبات

میں پوشیدہ ہے بلکہ اس بات میں بھی ہے کہ ان غزلوں کی زمینیں شگفتہ، بحریں مترنم اور لب ولہجہ نرم و شاداب ہے۔ ان غزلوں کے بعض شعر تو خاص و عام میں از بر ہیں۔ میرے نزدیک اس مجموعے کی یہ غزلیں جن کے پہلے مصرعے یہ ہیں ۔

ع ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے

ع کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی

ع نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا

فیض احمد فیض کی بہترین غزلیں ہیں۔ انھیں اردو غزل کی تاریخ میں دوام حاصل ہوگا اور یہ اردو غزل کے اچھے سے اچھے انتخاب میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔

شان الحق حقیؔ

سرِ وادیٔ سینا کی غزلیں

"سر وادی سینا" میں فیضؔ کی ۱۶ غزلیں شامل ہیں۔ ان میں سے ۱۴ میری معلومات کی حد تک نئی زمینوں میں ہیں، دو پرانی زمینوں میں۔ ان ۱۶ غزلوں میں کل ۱۰۷ اشعار ہیں۔ یعنی دو میں چھ چھ اشعار، دو میں پانچ پانچ، ایک میں سات اور ایک میں آٹھ۔ یہ تین غزلیں مطلع اور مقطع سمیت بالکل مکمل ہیں۔ باقی میں مقطع نہیں، مطلع سب میں موجود ہے۔ ایک آٹھ اشعار کی غزل میں چھ مطلع ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے یہ تین غزلیں بے ڈول کہی جائیں گی۔ لیکن اس تکنیکی شرط کو پہلے بھی شاعروں نے پابندی سے نہیں نباہا اور اب تو یہ شرط سرے سے اٹھ ہی گئی ہے۔ ویسے تو ہر شعبے میں تکنیک پر اصرار ہے، ادب میں نہیں۔ ادب میں فیضؔ کا وہ مقام ہے کہ ان کا عمل دوسروں کے لئے سند اور قابلِ تقلید ٹھہرے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ادب میں کسی بدعت کے موجد یا سنت کے مخترع نہیں ہیں۔ ان کے آزاد تخیل اور انقلابی رجحان کے باوصف ان کی شاعری خصوصاً غزل حیرت انگیز حد تک روایتی ہے۔ ان کے بہت سے اشعار ہیں جو اساتذۂ قدیم سے منسوب کر دیئے جائیں تو شاید کسی کو بھی یہ بات کھٹکنے نہیں پائے گی۔ ایسے اشعار ان غزلوں میں بھی موجود ہیں اور ایک دو نہیں بلکہ بیشتر، مثلاً کوئی ان اشعار کو مومنؔ یا حسرتؔ کا کہہ کر سنا دے تو کون مانع آئے گا اور کیوں۔ ؎

شرحِ بے دردیٔ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

پھر دمِ دید رہے چشم و نظر دید طلب
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی

پھر وہاں باب اثر جانے کب بند ہوا
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی

اسی طرح یہ شعر اگر شاد عظیم آبادی پہ نازل ہوا ہوتا تو وہ اس پر ضرور شاد ہوتے۔

لو وصل کی ساعت آپہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا

بلکہ اس شعر کو تو شاید خواجہ میر درد بھی سرآنکھوں پر لیتے کہ اس میں آنکھوں کے دریچے بند کرنے اور سینے کا در باز کرنے والی کیفیت ہے جو ان کا داخلی تجربہ نہیں تو دلی حسرت ضرور ہو گی۔

دم بدم، شب وصل، باب اثر، حکم حضوری، یہ ترکیبیں جو ان اشعار میں آئیں انھیں سے ان کی کلاسکی فضا متعین ہوتی ہے۔

فیض کی غزل کی زبان اساتذۂ غزل کی زبان ہے۔ ان غزلوں میں انھوں نے "پر" بمعنی مگر کی جگہ "پہ" اور کبھی کی جگہ "کبھو" بھی باندھا ہے اور سچ پوچھئے تو اس سے اظہار میں کچھ نیا پن محسوس ہوتا ہے۔

اس کلام کی سب سے بڑی خصوصیت میری نظر میں یہ ہے کہ یہ شعوری کاوش سے تعلق نہیں رکھتا۔ صریح آمد ہے جس کے آگے فیض اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ بلکہ میرا گمان ہے کہ وہ شعوری طور پر کچھ ایسے ٹکڑے اس میں ڈال دیتے ہیں کہ کلام بالکل ہی روایتی بن کر نہ رہ جائے اس میں کچھ نیا فکر اور نیا شعور بھی نظر آئے۔ کہیں کہیں تھوڑا سا اہمال بھی اسی لئے لے آتے ہیں کہ یہ بھی مذاق جدید ہے۔ مثلاً:

کب حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جان جہاں غماز کیا
اعلان جنوں دل والوں نے اب کے یہ ہزار انداز کیا

فیض کی شاعرانہ شخصیت کی ترکیب جن عناصر سے ہوتی ہے، بلکہ جن عناصر سے اس میں وزن و وقار پیدا ہوتا ہے، وہ اپنا زور دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام کلاسیکی ادب کا رنگ رچا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی غزل کو اردو

غزل کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ یا ان کی شاعرانہ شخصیت کا ایک وقیع رخ بلکہ بنیادی رُخ ہے۔
وہ جذباتی طور پر روایت کی گرفت میں رہے ہیں اور فکری طور پر روایت سے آگے۔ شاعرانہ
تخلیق میں جذبات فکر پر حاوی رہتے ہیں۔ فیض نے ان میں خاصا توازن قائم رکھا ہے۔
شاعر کبھی نرا منطقی یا کورا "مفکر" نہیں بن سکتا۔ اس کی باتیں اکثر منطقی طور پر قابلِ فہم
نہیں ہوتیں۔ اس کی نظر حقیقت کے ایسے پہلو دیکھتی ہے، جنہیں منطق اور اصطلاحوں میں بیان
نہیں کیا جا سکتا۔ محبت خود ایک ایسا ہی انوکھا تجربہ ہے۔ جسے اہلِ ہوش کی اصطلاح میں
دماغی خلل کہا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شعر کو فلسفے کی نسبت تصوّف سے زیادہ قرابت ہوتی
ہے۔ دونوں داخلی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں مادی عقلیت اور کاروبار سیاست
سے بہت دور ہیں۔ فیض کے ہاں سیاسی افکار اس طرح در آتے ہیں جیسے کہ دوسرے
اساتذہ رسماً یا تکلفاً حمد و نعت و منقبت لکھتے تھے۔ ان کے کلام میں ان کا شعوری فلسفہ
اس طرح گھلا ملا یا رچا ہوا نہیں ہے جیسا کہ اقبال کے ہاں ملتا ہے کہ وہاں کوئی گریز ہے
نہ تناقص نہ فرار۔ ایک نظریۂ حیات ایک مقصد ایک لگن ہے کہ شاعر میں روح بن کر رما
گئی ہے۔ تمام ادب میں ادب برائے حیات کی سب سے نمایاں مثال اگر کوئی ہے تو
یہی ہے۔

یہ ایک عجیب مثال ہے، لیکن ضروری نہیں کہ دوسروں کے لئے لائق تقلید بھی ہو، یعنی
شاعر ہر ہر سانس میں تبلیغ کرے، ہر ہر آن ایک ہی کیفیت میں مبتلا رہے۔ یہ پیغمبری کا درجہ
ہے اور شاعری، پیغمبری کا صرف ایک جزو ہے۔ میں تو ذاتی طور پر وسیع النظری کو شاعر کی
سب سے بڑی اور لازمی خصوصیت کہتا ہوں۔ وہ اپنے فکر اور تخیل کو محدود و محصور نہ کرے۔ شعوری
طور پر وہ کسی ایک نظامِ فکر کا پیرو ہو سکتا ہے، دوسرے باشعور انسانوں کی طرح وہ بھی کسی سیاسی
گروہ سے منسلک ہو سکتا ہے۔ مگر ہم اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا لکھے اور کیا نہ لکھے۔ وہ چاہے تو
پرچار اور پیکار بھی کرے، یا صرف گائے اور گنگنائے۔ ایک سچی آمد ہزار آورد سے بہتر ہے۔ اب
یہ ذاتی ترجیح کا معاملہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور میں کوئی اچھا اور سچا شاعر غیر ترقی پسند نہیں
ہو سکتا یا کم از کم میں اسے پسند نہیں کروں گا۔ جو شاعری زندگی کی راہ کا روڑا بنے گی، ناپسندیدہ ٹھہرے

گی بلکہ وہ سچی شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔

فیض کی شاعری اچھی اور سچی شاعری کی مثال ہے، یہ چند غزلیں بھی اس کی گواہ ہیں۔ فیض کی دوسری غزلوں کی طرح یہ خوش آہنگ بھی ہیں، گانے اور گنگنانے کے قابل، اور ان میں چند اشعار ایسے ہیں کہ یاد رہیں بلکہ یادگار رہ جائیں۔

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا ہم رنگِ گلِ طناز کیا

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح وردِ وضو کی ہے نہ وہ شام جام و سبو کی ہے
نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن جو لگن اس آئینہ رو کی ہے

طوفاں بدل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا
گل ہو نہ جائے مشعلِ رخسار دیکھنا
جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا نہ سنگ نہ دیوار دیکھنا
کوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آگئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا
خالی ہے گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا

شورشِ بربط و نَے

امین الرحمٰن

فیضؔ کا کلام موسیقی کے روپ میں

فروری ۱۹۷۶ء میں ممتاز شاعر فیض احمد فیضؔ کی پینسٹھویں سالگرہ غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ اور اس طور منائی گئی جسے کئی لحاظ سے ایک یادگار تقریب کی حیثیت حاصل رہے گی۔ جہاں جناب فیض احمد فیضؔ کو ہمعصر شعرا اور ادیبوں کی طرف سے تہنیت کے بے شمار پیغامات موصول ہوئے، ان کی شاعرانہ اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے ادبی مجالس اور مذاکرے منعقد ہوئے، وہاں ان کے کلام کی غنائیت کو عقیدت کا ایک ایسا خراج بھی پیش کیا گیا جس کا ہمارے ملک میں اس سے پہلے نہ تو کوئی رواج تھا اور نہ کوئی روایات۔ یہ غیر روایتی خراج عقیدت ایک لانگ پلے انگ ریکارڈ (ایل پی) کی صورت میں تھا جسے ایک گراموفون ریکارڈ بنانے والے ادارے نے عین اس دن جاری کیا جو جناب فیض احمد فیضؔ کی پینسٹھویں سالگرہ کا دن تھا یعنی ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء۔

مغربی ملکوں میں اس قسم کے یادگار موقعوں پر گراموفون ریکارڈوں کا اجرا کوئی نئی بات نہیں۔ مثال کے طور پر جب ۱۹۶۹ء میں فرانس کے ایک ممتاز موسیقی نگار ہیکٹر برلیو کی صد سالہ برسی کی تقریبات سال بھر بڑے اہتمام اور عقیدت سے منائی گئیں تو ان کے اختتام پر فلپس کمپنی نے فرانس کے اس عظیم موسیقی نگار کے مشہور اوپرا "لے تروئیان" کو، جس کا پلاٹ ہومر کی طویل نظم "ایلیڈ" سے لیا گیا تھا، برطانوی کنڈکٹر ڈیوڈ کوس کی زیر نگرانی

خاص طور پر ریکارڈ کرایا اور ریڈیو کی برسی کی تقریبات کی سب سے اہم یادگار اب اسی ریکارڈ کو سمجھا جاتا ہے۔

غالباً کچھ اسی قسم کے جذباتِ عقیدت کے زیرِ اثر، ای ایم آئی پاکستان لمیٹڈ (سابق گرامو فون کمپنی آف پاکستان) نے جناب فیض احمد فیضؔ کی پینسٹھویں سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار لانگ پلے انگ ریکارڈ جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کا انگریزی عنوان "نیرہ سنگز فیض" ہے جسے اردو میں فیض کا کلام نیرہ کی نغمہ سرائی کہا جاسکتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کو اپنے سیاسی عقائد اور ثقافتی مسلک کی بنا پر ایک متنازعہ فیہ شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن فیضؔ کی شاعری کی تاثیر خاص ہے اس کی غنائیت میں شائد ہی کسی کو کلام ہو۔ اسی طرح فیضؔ کی شاعری کا نفسِ مضمون خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فیضؔ کا ہر مصرع بلکہ مصرع کا ہر رکن ایک خاص قسم کی غنائیت کا حامل ہے۔ جس کے لئے فارسی شاعری میں سعدیؔ، خسروؔ، حافظؔ اور قاآنیؔ کا نام لیا جاسکتا ہے، اردو شاعری میں داغؔ، اقبالؔ اور حفیظؔ جالندھری، انگریزی شاعری میں سوئن برن اور بنگالی شاعری میں رابندر ناتھ ٹیگور۔

فیضؔ کے کلام میں غنائیت کا یہی عنصر ہے جس نے ان کے اشعار کو نغمہ سرائی کے لیے بے حد موزوں بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے مشہور گانے والے اور گانے والیوں نے فیضؔ کے کلام کا جادو اپنی آواز سے جگا کر سامعین سے ہمیشہ تحسین کی داد حاصل کی ہے۔

نور جہاں، مہدی حسن، فریدہ خانم اور اقبال بانو کو یقیناً یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے فیضؔ کے کلام کو اپنی خوش نوائی سے نغمے کی زبان میں ایسے معانی دیے ہیں جن سے دل اور سماعت وجدان کی سی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔

فیضؔ کا کلام یوں تو بے شمار گانے والوں نے گایا ہے لیکن ان کی طرزیں شاید ہی معیار کے اوسط سے بیش ہوئی ہوں۔ مثال کے طور پر مہدی حسن کی طرز "چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" ایک معمولی طرز ہے جس میں اثر انگیز موسیقی کا کوئی شائبہ محسوس نہیں

ہوتا لیکن اس کے برخلاف فیض کی وہ غزل جس کا پہلا مصرعہ "آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے"
مہدی حسن نے بڑے جذبے کے ساتھ گائی ہے۔ بعض سروں پر قیام خاص کیفیت پیدا
کرتا ہے۔ بعض جگہ سروں کی بے ساختہ چھوٹ سے طرز میں جان سی پڑ گئی ہے اور برجستگی کا
اظہار ہوتا ہے۔

یہی حال نورجہاں کی گائی ہوئی فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ
مانگ" کی ہے۔ اس کی طرز غالباً رشید عطرے مرحوم نے کسی فلم کے لیے موزوں کی تھی۔ لیکن
اس میں فلمی طرزوں کا روایتی اوچھا پن نہیں ہے۔ اس کی وجہ اس نظم کی شاعری کا غیر معمولی
ہونا ہے۔ رشید عطرے نے اس کی تال بھی ایسی چنی ہے جس میں الاپ کا انداز بھی کھپ
جاتا ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ نورجہاں کی آواز میں جو سریلا پن ہے اس کی وجہ سے بھی
اس کی موسیقی میں جذب اور شوق کی ایک تڑپ سی دکھائی دیتی ہے۔

فیض کی ایک مشہور نظم کو جو نظم معرّیٰ کی صورت میں ہے اقبال بانو نے گایا ہے۔ اس
نظم کی غنائیت اس کے شروع کے بولوں ہی سے ظاہر ہے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں

لرزاں ہیں'

تیری آواز کے سائے' تیرے ہونٹوں کے سراب'

اور غالباً کچھ اسی قسم کی وجوہ سے مہدی ظہیر نے اس کی موسیقی موزوں کرنے کے
لیے اسے منتخب کیا۔ اس نظم معرّیٰ کی طرز بھی موسیقی میں ایک نیا تجربہ ہے۔ مہدی ظہیر نے
اس طرز میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ طبلہ بالکل ہی پس منظر میں رہے اور کہیں بھی یہ ظاہر
نہ ہو کہ نظم کے بول اور طبلے کی ضربیں مترادف ہیں۔ اقبال بانو کی آواز میں جو برق سا کرشمہ
ہے مہدی ظہیر اسے پورے طور پر بروئے کار لائے ہیں۔ اور بلمپت لے میں اقبال بانو کو یہ
موقع فراہم کیا ہے کہ وہ طرز کے اہم سروں پر طویل قیام سے وارفتگی کی کیفیت کو نغمے کی شکل
مستعار دیتی چلی جائے۔

میرے خیال میں فیض کے کلام کی غنائیت کو موسیقی کے موزوں ترین قالب میں ڈھالنے

کا مہدی ظہیر کا یہ تجربہ انتہائی کامیاب ہے۔
یہ فیض کے کلام کی غنائیت سے استفادہ کرنے کی چند مثالیں ہیں۔ غنائیت کے اعتبار سے فیض کا کلام اردو میں اُسی اہمیت کا حامل ہے جو فارسی میں حافظ شیرازی کو حاصل ہے یا جرمن زبان میں گوئٹے، ہائنے اور شلر کو۔ میں نے ان تین جرمنوں کا نام اس لیے لیا ہے کہ ان عظیم شاعروں نے جرمن زبان میں نہایت خوبصورت گیت اور نظمیں لکھی ہیں جنھیں خود چند عظیم جرمن موسیقی نگاروں جیسے براہمز، شوبرٹ اور شومان نے نہایت دل کش نغموں کی صورت میں اس طرح ڈھالا ہے کہ نظم کے ہر لفظ، رکن یا مصرعے کی معنی خیزی سُر اور آہنگ کی صورت میں آکر دو چند ہو گئی ہے۔
اگر فیض احمد فیض بھی ان شاعروں کے مانند ہوتے جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقار بھی تھے اور جنھوں نے اپنے کلام کو خود ہی موسیقی کے قالب میں منتقل کیا ہے جیسے آئرستانی شاعر ٹامس مور (جس کی ایک مشہور نظم کا اردو میں ترجمہ "اکثر شب تنہائی میں" اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے) یا پھر رابندر ناتھ ٹیگور جو اپنے گیتوں کی دھنیں بھی خود ہی بناتے تھے اور جن کی موسیقی کو رابندر سنگیت کا نام دیا گیا ہے، تو پھر وہ بھی موسیقی نگاروں سے بے نیاز ہوتے لیکن اب جب کہ فیض محض ایک شاعر ہیں اس لیے یہ فرض ہمارے موسیقاروں کا ہے کہ وہ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کریں اور ان کے گیتوں، غزلوں اور نظموں کی ایسی دھنیں موزوں کریں جنھیں نہ صرف ہماری موسیقی ہی میں ایک خاص مقام حاصل ہو بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی انھیں مقبولیت حاصل ہو۔
فیض احمد فیض کو براہمز، شوبرٹ یا شومان جیسے پختہ کار اور بین الاقوامی شہرت کے حامل موسیقی نگاروں کی خدمات ملنے میں شاید ابھی کچھ دیر لگے لیکن موسیقاروں کا ایک نوجوان گروہ ہماری توجہ کا یقیناً مستحق ہے جس نے فیض کے چیدہ چیدہ کلام کو نغمے کے قالب میں اس طرح پیش کیا ہے کہ فیض کی شاعری کی روح بھی برقرار رہے اور اسے سُر اور آہنگ کے ذریعے ایک نیا اظہار بھی ملے۔ اس گروہ میں گانے والے بھی ہیں، موسیقی موزوں کرنے والے بھی اور ساز بجانے والے بھی۔ دو تین برس کے اندر اندر اس بے نام

گروہ نے فیض کے کلام کو خاص کر ٹیلی ویژن کے مقبول پروگراموں "تیج گپ" اور "ٹال مٹول" میں وقتاً فوقتاً پیش کر کے ایک اچھا خاصا مجموعہ تیار کر لیا جسے اب ای ایم آئی پاکستان لمیٹیڈ نے فیض احمد فیض کی ۶۵ ویں سال گرہ پر ایک لانگ پلے انگ ریکارڈ کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ اس "ایل پی" میں کل بارہ چیزیں ہیں۔ جو فیض کی شاعری کی پوری پوری نمائندگی کرتی ہیں کیوں کہ اس میں گیت بھی ہیں اردو کے بھی اور پنجابی کے بھی، غزل بھی ہے اور نظم معرّیٰ بھی ہے۔ ریکارڈ ایک انتساب سے شروع ہوتا ہے جسے شعیب ہاشمی نے پڑھا ہے اور نیّرہ نور نے فیض کی نظم "آج کے نام" کے مصرعے درمیان درمیان میں گا کر پیش کیے ہیں۔

آج کے نام اور آج کے غم کے نام۔

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے ۔۔۔۔۔

اس آزاد نظم کی طرز نوجوان موسیقی نگار شاہد طوسی نے موزوں کی ہے جو بجائے خود ہماری موسیقی میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پس منظر میں وائر و فون اور گٹار کی موسیقی نے غنائیت کی فضا قائم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ اس "ایل پی" کی خاص طور پر جو قابل ذکر چیزیں ہیں ان میں "تم میرے پاس رہو" جسے نیّرہ نور نے اسے بڑی دلسوزی سے گایا ہے "یہ دور کنارا" جس کی موسیقی راگیشوری پر مبنی ہے اور "آج بازار میں پا بجولاں چلو" جس کی دھن بہاگ میں ہے یقیناً بہت پسند کی جائیں گی۔

نیّرہ نور کی آواز میں بے حد ملائمت ہے اور وہ نازک سی نازک جگہوں کو بھی بڑی آسانی سے ادا کرتی ہیں۔ موسیقی کی دنیا میں اسے آئے ہوئے ابھی چھ برس ہی ہوئے ہیں لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلموں میں ایک پلے بیک سنگر کی حیثیت سے اپنے لیے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس ایل پی کی ساری موسیقی دو نوجوان موسیقاروں شاہد طوسی اور ارشد محمود نے موزوں کی ہے۔ دونوں شوقین فن کار ہیں اور کسی نے بھی موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی صرف اپنی شوق اور ریاض کی بدولت انھوں نے موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ شاہد طوسی ہماری کلاسیکی موسیقی سے

نابلد ہے، صرف ذوقِ سلیم ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے برخلاف ارشد محمود کلاسیکی موسیقی کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی طرزوں میں راگوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ فیض کی مشہور نظم "آج بازار میں پابجولاں چلو" کو ارشد محمود نے بہاگ راگ میں اس طرح باندھا ہے کہ راگ کی ساری خوب صورتی سمٹ کر اس طرز میں آگئی ہے۔

"تم مرے پاس رہو" کی طرز شاہد طوسی نے موزوں کی ہے۔ اتفاق سے فیض کی یہی نظم ملکہ پکھراج نے بھی گائی ہے اور ٹھمری کے انداز میں "تم مرے پاس رہو" کے بول ہر بار نئے انداز سے ادا کیے ہیں لیکن شاہد طوسی نے اس کی جو دھن بنائی ہے اور نیرہ نور نے اسے جس جذبے کے ساتھ گایا ہے اس کا ملکہ پکھراج کی طرز اور گانے سے مقابلہ کرنا یقیناً دل چسپی کا باعث ہوگا کیوں کہ دونوں طرزیں الگ الگ اسلوب کی مظہر ہیں۔

اس ایل پی کے تمام گانوں کی موسیقی میں سازوں کو نہایت اہتمام اور سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ "چلو پھر سے مسکرائیں" میں ماجد خان نے ستار کی مینڈ کاری کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ یقیناً ماہرانہ صلاحیت کے غماز ہیں۔ اگرچہ ایل پی میں کوئی کورس نہیں لیکن اس کی کو ایک دوگانے "برکھا برسے چھت پر" نے پورا کر دیا ہے جسے نیرہ نور اور ان کے موسیقار شوہر شہریار زیدی نے گایا ہے۔ اس دوگانے کی طرز شاہد طوسی نے بنائی ہے جس میں بنگالی انگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اس ایل پی کو کوئی عارضی یا ہنگامی حیثیت حاصل نہیں بلکہ جدید پاکستان کی موسیقی میں اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کی موسیقی کے موزوں کرنے، اسے ترتیب دینے اور گانے میں سب شوقیہ فن کاروں نے حصّہ لیا اور اس طرح اس کی موسیقی اس ابتذالِ نغمہ سے بچی رہی جو آج کل کے پیشہ ور موسیقاروں کی موسیقی میں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ ای ایم آئی کے اس ایل پی کی موسیقی میں ایک نیا پن اور تازگی ہے کیوں کہ یہ ان نوجوان فن کاروں کی کاوش سے وجود میں آئی ہے جو موسیقی کے میدان میں پیشہ ور نہیں۔

مرتبہ اظفر الحسن

نغماتِ فیض

اکابر شعراء اور ہمعصروں میں جتنے گرامو فون ریکارڈ فیض احمد فیض کے کلام کے بنے ہیں اتنے یا اس کے برابر بھی کسی کے نہیں بنے۔ غزل گیت ہی کے نہیں بلکہ نظموں کے بھی ریکارڈ۔ ایک قطعہ بھی صدا بند کیا گیا ہے۔

ای ایم آئی پاکستان نے جس کا پہلا نام گراموفون کمپنی آف پاکستان تھا کلامِ فیض کے اب تک ۴۲ ریکارڈ اور تین ایل پی جاری کئے ہیں یعنی طویل دوران کے ریکارڈ (لانگ پلے انگ) تیسرا ایل پی عین ان کی ۶۵ ویں سالگرہ کے دن جاری کیا گیا تھا۔ ان ریکارڈوں میں ۲۰ گلوکاروں نے نغمہ سرائی کی ہے جن میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مقبول ترین فن کار بھی شامل ہیں۔ مثلاً برکت علی خان، ملکہ پکھراج، نور جہاں، مہدی حسن، امانت علی خاں، فریدہ خانم، اقبال بانو اور بیگم اختر، طلعت محمود اور فردوسی بیگم وغیرہ۔

چھ فلموں میں بھی کلام گایا گیا ہے۔ جاگو ہوا سویرا، کنول، قسم اس وقت کی، فرنگی، چاند سورج، دور ہے سکھ کا گاؤں؛ آخری فلم نیف ڈیک کی پیش کش ہے اور ابھی جاری نہیں کی گئی۔ اس کے گانے اور چند دوسرے گانے جو متذکرہ فلموں کے لئے صدا بند کئے گئے غیر مدون ہیں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہ سنگ اور سرِ وادیٔ سینا سے کلام منتخب کیا گیا۔ کچھ سرِ وادیٔ سینا کے بعد کا کلام بھی ہے۔

نغماتِ فیض کی فہرست مرتب اور پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کلامِ فیض کی موسیقیت یا کسی دوسرے موضوع پر کام کرنے والوں کو سہولت ہو، ایک جگہ اور ایک نظر میں انہیں تفصیلات مل جائیں۔ ترتیب حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔ البتہ ایل پی کی ترتیب نغمہ سرائی کے مطابق ہے۔ نغمے کے بعد مجموعہ کلام کے نام کا مخفف دیا گیا ہے۔ مثلاً نقشِ فریادی سے ن ف پھر گلوکار کا نام درج کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فلم کا نام، اگر وہ فلم میں گایا گیا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں ایک سے زیادہ گرامو فون کمپنیاں تھیں جن کے درمیان تجارتی مقابلہ ہوتا تھا، طباعت سستی تھی اس لئے تمام کمپنیاں اپنے ریکارڈوں کی فہرستیں شائع کرتی تھیں۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا اس لئے یہ فہرست اور بھی زیادہ ضروری اور اہم ہوگئی ہے۔

۱	آکہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے	ن ف	نور جہاں	
۲	آتے کچھ ابر کچھ شراب آتے	د ص	ثریا ملتانیکر	
۳	اُس دھوپ کنارے شام		مجیب عالم	
۴	اے وطن تیری للکار پر		نور جہاں	
۵	بھور ہوئی گھر آڈ ماجھی		راحت غزنوی	جاگو ہوا سویرا
۶	بیت چلی ہے رات		راحت الطاف، نیلوفر	جاگو ہوا سویر
۷	تری امید ترا انتظار جب سے ہے	دت س	امانت علی خاں	
۸	ترے غم کو جاں کی تلاش تھی	دت س	تاج ملتانی	
۹	تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے	د ص	امید علی خاں	
۱۰	تم آتے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے	د ص	نور جہاں	
۱۱	تم آتے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے	د ص	مہدی حسن	
۱۲	تم آتے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے	د ص	جاوید اختر	
۱۳	جاگو ہوا سویرا		راحت غزنوی	جاگو ہوا سویرا
۱۴	چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے	ن ف	بیگم اختر	
۱۵	خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو	ن ف	طلعت محمود	
۱۶	خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو	ن ف	عارف علی	کنول
۱۷	دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہے	د ص	اقبال بانو	
۱۸	دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں	د ص	معشوق علی خاں	
۱۹	دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں	د ص	مہدی حسن	
۲۰	دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے	ن ف	برکت علی خاں	

۲۱	دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے	ن ف	طلعت محمود	
۲۲	دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے	ن ف	شبینہ یاسمین	
۲۳	شام ڈھلی شام ڈھلی شام ڈھلی		الطاف محمود	جاگو ہوا سویرا
۲۴	رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی	ن ف	مجیب عالم	قسم اس وقت کی
۲۵	رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا	ن ف	فیروزہ بیگم	
۲۶	سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں	ز ن	فریدہ خانم	قسم اس وقت کی
۲۷	رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام	د ص	فردوسی بیگم	
۲۸	رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام	د ص	شبینہ یاسمین	
۲۹	شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی	ز ن	بیگم اختر	
۳۰	شوقِ دیدار کی منزلیں		مہدی حسن	قسم اس وقت کی
۳۱	عشق کو حسن سے دوچار نہ کر دینا تھا		مہدی حسن	چاند سورج
۳۲	عشق منت کش قرار نہیں	ن ف	فیروزہ بیگم	
۳۳	کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی	د ت س	ملکہ پکھراج	
۳۴	کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی	د ت س	پروین فیضی	
۳۵	گرمیِ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو	ز ن	شوکت علی	
۳۶	گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے	ز ن	مہدی حسن	
۳۷	موتی ہو کہ شیشہ جام کہ دُر (شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں)	د ص	محبوبہ حسن	جاگو ہوا سویرا
۳۸	مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ	ن ف	نور جہاں	قیدی
۳۹	نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا	د ت س	اقبال بانو	
۴۰	نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا	د ت س	مہدی حسن	
۴۱	ہمتِ التجا نہیں باقی	ن ف	علی بخش ظہور	
۴۲	ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے	ز ن	مالا اور جہانگیر	فرنگی
۴۳	یہ دھوپ کنارہ شام ڈھلے		مجیب عالم	قسم اس وقت کی

پہلا ایل پی

ایل کے ڈی اے ——— ۲۰۰۰۶

گیت	گلوکار
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ	نور جہاں
ہمتِ التجا نہیں باقی	علی بخش ظہور
رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا	فیروزہ بیگم
دونوں جہان تری محبت میں ہار کے	برکت علی خاں
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام	فردوسی بیگم
دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں	معشوق علی خاں
آئے کچھ ابر کچھ بہار آئے	ثریا ملتانیکر
تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے	امید علی خاں

دوسرا ایل پی

ایل کے ڈی اے ——— ۲۰۰۰۸

گیت	گلوکار
سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں	فریدہ خانم
گرمیٔ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو	شوکت علی
شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آ کے ٹل گئی	بیگم اختر
گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے	مہدی حسن
کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی	ملکہ پکھراج
ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے	تاج ملتانی
نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا	اقبال بانو
تری امید ترا انتظار جب سے ہے	امانت علی خاں

ای ایم سی پی ایم

۵۰۲۶

تیسرا ایل پی

جو فیض کی ۶۵ ویں سالگرہ پر ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء کو جاری کیا گیا

پہلا رُخ

انتساب (آج کے نام)	نیرّہ نور اور شعیب ہاشمی
تم مرے پاس رہو	نیرّہ نور
اٹھو اب ماٹی سے (سپاہی کا مرثیہ)	نیرّہ نور
چلو پھر سے مسکرائیں	نیرّہ نور
برکھا برسے چھت پر	شہریار زیدی اور نیرّہ نور
یہ دھوپ کنارا شام ڈھلے	نیرّہ نور

دوسرا رُخ

آج بازار میں پابجولاں چلو	نیرّہ نور
یہ ہاتھ سلامت	نیرّہ نور
کدھرے نہ پیندیاں دسّاں	نیرّہ نور
ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد	نیرّہ نور
آئیے عرض گذاریں کہ نگارِ ہستی (دعا)	نیرّہ نور
خیر ہو تیری لیلاؤں کی	نیرّہ نور

مرزا ظفرالحسن

درد آئے گا دبے پاؤں

چند برس پہلے سُنا تھا کہ ممتاز صحافی صفدر میر آواز اور روشنی کی مدد سے کوئی تمثیل تیار کر رہے ہیں مگر پھر آں کتاب را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد۔ اسی طرح غلغلہ مچا تھا کہ مشہور اداکار اور ہدایت کار ضیا محی الدین خواجہ معین الدین مرحوم کے ڈرامے "لال قلعہ سے لالو کھیت" کی فلم پاکستان ٹی وی کے لیے بنا رہے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد وہ بھی ٹائیں ٹائیں فش۔ منصوبے بنانے میں جس طرح ہم بے مثل ہیں ان منصوبوں کو سرد خانے بلکہ مردہ خانے میں ڈالنے میں بھی ہم بے نظیر ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں اور پوچھے کس سے کہ اس قسم کے منصوبوں پر ہمارے ادا کردہ ٹیکس کی رقم اس بے دردی سے کیوں ضائع کی جاتی ہے؟

ڈائرکٹریٹ آف فلمز و پبلی کیشنز کی جانب سے خلیق ابراہیم نے غالب پر ایک رنگین دستاویزی فلم بنائی جو چند ایک کمزوریوں کے باوجود نہایت خوبصورت، معلوماتی اور دلچسپ فلم تھی۔ ایک مرتبہ غالب لائبریری میں دکھائی گئی اور شاید دو چار بار مختصر نجی اجتماعات میں دکھائی گئی اور بس۔ ابھی غالب لائبریری کا افتتاح نہیں ہوا تھا اور اس فلم کے لیے جو رقم مختص کی گئی تھی، ختم ہو گئی۔ مزید رقم کے مستقبل قریب میں ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا، فلم اسٹوڈیو کا کرایہ بہت زیادہ تھا تو خلیق ابراہیم کی درخواست پر میں نے اس فلم کی شوٹنگ کے لیے غالب لائبریری کے دروازے کھول دیے جس کی وجہ سے لائبریری کا افتتاح کئی ماہ تک ملتوی کرنا پڑا۔ فلم بن گئی، ایک سینما میں اس کا افتتاح بھی ہوا، چار پانچ سو ادیبوں، افسروں اور صحافیوں نے وہ شو دیکھا اور اس کے بعد اسے ڈبوں میں بند کر دیا گیا۔ نہ محکمۂ فلمز کے پاس ۳۵ ملی میٹر کا پروجیکٹر ہے جس پر فلم دکھا سکیں اور نہ یہ ان کے فرائض میں شامل ہے۔ سینما کے مالکوں کو غالب سے کیا دلچسپی کہ یہ فلم دکھائیں۔ دکھائیں تو اس کے ناظرین کہاں ہیں؟ مختصر یہ کہ ہمارے ملک کے کاغذی، نامکمل اور ناقص منصوبوں کی فہرست طویل اور داستانیں بڑی دردانگیز ہیں۔ کس سے پوچھیں کس کو سنائیں؟

فیض احمد فیض کی منتخب غزلوں، نظموں اور قطعات پر مشتمل شیلا بھاٹیہ کی ترتیب دی ہوئی غنائی تمثیل "درد آئے گا دبے پاؤں" دلی آرٹ تھیٹر کی جانب سے دلی کے اسٹیج پر پیش کی گئی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس نے اسے ریکارڈ کر کے جون ۱۹۷۹ء کے پہلے ہفتے میں اپنی رات کی نشریات میں سنایا تھا۔

اُسی سروس کے دوپہر کے اناؤنسر کے مطابق بے شمار سامعین کی فرمائشوں کی بنا پر پیر ۱۱ر جون اور منگل ۱۲ر جون کو دوپہر کے پروگراموں میں پنتالیس پنتالیس منٹ کی دو قسطوں میں مکرر نشر کیا گیا۔

مجھے قطعی طور سے معلوم نہیں، غالباً دِلّی آرٹ تھیٹر شوقین یا غیر پیشہ ور اداکاروں اور صداکاروں کی کوئی تنظیم ہے۔ خاصی فعال ہے اور ماضی میں اس نے کئی ایسے پروگرام کیے ہیں۔ دوسرے ادارے بھی اس نوع کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر کلام غالب سے ترتیب دیا ہوا ایک پروگرام کیا گیا تھا اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو علی سردار جعفری اور کیفی جیسے ممتاز ادیب اور فیض آباد والی بیگم اختر مرحومہ جیسی خوش گلو شخصیت اس سے وابستہ تھیں۔ حیدرآباد دکن کے قلعہ گولکنڈہ میں ہر سال جشنِ قلی قطب شاہ منایا جاتا ہے۔ ۱۹۷۸ء کے شروع میں ایسے جشن میں میں شرکت کر چکا ہوں۔ آواز اور روشنی کی مدد سے تمثیل پیش کی جاتی ہے جس کے دیکھنے والے سو دو سو نہیں ہزاروں ہوتے ہیں۔

شیلا بھاٹیہ یا دِلّی آرٹ تھیٹر کی مذکورہ غنائی تمثیل "درد آئے گا دبے پاؤں" قابلِ تحسین ہے کہ اُردو کے ایک مقبول و معروف شاعر کے کلام کو مربوط کر کے اُسے غنائیہ اور تمثیل کا بِلا جُلا روپ دیا گیا۔ پاکستان میں کلام فیض کو بطور غنائیہ پیش کرنے کی واحد مثال رضی اختر شوق کی کاوش ہے مگر یہ بھی تمثیلی غنائیہ نہیں تھا۔ ریڈیو سے نشر کرنے کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ فیضؔ ہی نہیں بہت سے شاعروں کے کلام اور موضوعاتی نظموں میں غنائیے اور غنائی تمثیلیں بننے کے بڑے روشن امکانات ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ نہ ہمارے ہاں تھیٹر ہیں، نہ تمثیلی ادارے اور نہ تمثیلی غنائیوں یا غنائی تمثیلوں کے شائقین۔

"درد آئے گا دبے پاؤں" اپنی تمام دلچسپی کے باوصف نہ مکمل غنائیہ تھا اور نہ کامل تمثیل چھوٹے چھوٹے واقعات کو مکالموں کے ذریعے پیش کرنے کی بنا پر اسے غنائی تمثیل کہہ لیں اور بات ہے مگر وہ اس اصطلاح کا کوئی مثالی نمونہ نہیں تھا جس کی شاید بڑی وجہ یہ ہے کہ برِّ صغیر میں اس کی کوئی خاص روایت اور کوئی خاص ماضی نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں کانسرٹ اور اوپیرا قسم کی چیزوں کی جو افراط ہے اس کا ایک سبب ان کی موسیقی بھی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان اور پاکستان کی موسیقی کا مزاج حجرے اور محفل کے لیے موزوں ہے۔ "درد آئے گا دبے پاؤں" اسٹیج پر دیکھنے والوں کا کیا تاثر تھا اور اس تاثر میں کلام فیض کی کتنی تاثیر تھی، اس کی بابت تو دِلّی والے ہی کچھ لکھ سکتے ہیں البتہ یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ فیض پسندوں نے اسے ضرور سراہا ہوگا۔

فن اور فیضؔ کے ساتھ انصاف کرنے کی خاطر ایک سامع کی حیثیت سے مجھے اس میں جو کمزوریاں محسوس ہوئیں ان کا ذکر میرا ادبی فرض بھی ہے۔ شیلا بھاٹیہ معاف کریں مقصود اس سے ترکِ تعلق نہیں مجھے۔ "درد آئے گا دبے پاؤں" کے مکالموں میں کافی جھول تھے۔ ان کی ادائیگی کمزور بلکہ کہیں کہیں غیر فنکارانہ محسوس

ہوئی۔ تلفظ کی غلطیاں مکالموں میں کی گئیں اور کلام گاتے اور سناتے وقت بھی۔

گلوکار اچھے تھے، بعض تو بہت ہی اچھے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ چند ایک جگہوں پر اور خصوصاً انترے اٹھاتے وقت دو ایک بے سُرے بھی ہوئے۔ عام طور پر ایسی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب موسیقار یعنی میوزک کمپوزر کے پیشِ نظر دُھن تیار کرتے وقت گلوکار کے گلے کی صلاحیت سے زیادہ اپنی بنائی جانے والی دُھن کی دلکشی ہوتی ہے۔ کلامِ فیض گائے جانے کے سلسلے میں ایک اور بات کھٹکی۔ زیادہ کلام گوانے کی ہوس میں یا اس تمثیل کا دورانیہ زیادہ کرنے کی خاطر فیض کی بعض نظمیں اور غزلیں تیزی میں گوائی گئیں۔ بچوں کی تدریسی اصطلاح استعمال کروں تو "فر فر سنائی گئیں" جس کی وجہ سے ایک طرف کلام کی تاثیر مجروح ہوئی، دوسری جانب اچھی دُھن اور اچھے گلوکار ہونے کے باوجود موسیقی کا لطف غارت ہوا۔ کورس تک اس تیزی سے اور جلدی جلدی گوائے گئے، محسوس ہو رہا تھا جلد ختم نہ کیا تو ریل چھوٹ جائے گی۔ شعرخوانی اور موسیقی دونوں میں ایسی تیزی اور عجلت غیر مستحسن ہی نہیں کافی تکلیف دہ ہے۔

حقائق کو، چاہے وہ ادبی ہوں کہ غیر ادبی، مسخ کرنا بہرطور بددیانتی ہے۔ تاریخ میں "زیبِ داستان" جیسی چیز کو جگہ نہیں دی جا سکتی۔ فیض احمد فیض کی اسیری (خصوصاً ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۵ء کی قید) اب تاریخ ادب اردو اور فیض کی سوانح کا جزو لاینفک ہے اور ان دنوں کے بہت سے واقعات جن کا تعلق جیل کی زندگی سے ہے ان کے خطوط کے مجموعے میں درج ہیں۔ "صلیبیں مرے دریچے میں"۔ اس تمثیل کی ایک آدھ جھلک سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیلا بھاٹیہ کی دسترس میں یہ مجموعہ تھا جو فیض سے اجازت لیے بغیر ہندوستان کا ایک پبلشر چھاپ بھی چکا ہے۔

شیلا بھاٹیہ کے پیشِ نظر نہ جانے کوئی مصلحت تھی یا انھوں نے سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کر لیا یا دستاویزی شہادت ان کی دسترس میں ہونے کے باوجود محض تمثیلی چٹخارے کی خاطر بعض ایسے مناظر پیش کیے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک منظر میں بتایا کہ شمس نامی ایک شخص کے ذریعے قیدی شاعر جیل سے اپنا کلام خفیہ طور پر جیل سے باہر بھیجتا ہے۔ فیض اور ان دنوں کے دوسرے اسیروں کی خدمت کے لیے جو لوگ مقرر تھے، سب کے سب قیدی تھے۔ اس لیے ان قیدی خدمت گاروں کے جیل سے باہر جانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اسیری کے خطوط کے مجموعے میں ان تمام غزلوں اور نظموں کے حوالے میں نے فٹ نوٹ میں دے دیے ہیں جو فیض سنسر کی منظوری کے بعد اور اربابِ جیل کے توسط سے ایلس فیض کے موسومہ خطوط سے منسلک کر کے بھیجتے تھے اس لیے یہ بھی سراسر غلط۔ بلکہ فیض پر ایک قسم کا بہتان ہے کہ انھوں نے خفیہ طور پر اپنا کلام جیل سے باہر بھیجا۔ فیض کی پوری اسیری میں "خفیہ" کی (حالانکہ اسے خفیہ نہیں کہا جا سکتا) کوئی مثال ملتی ہے تو یہ ہے کہ راولپنڈی سازش کے مقدمے میں جس دن فیض کے وکیل جناب حسین شہید سہروردی نے اپنی بحث مکمل کر لی، ان کے اعزاز میں حدودِ جیل میں ایک ظہرانہ دیا گیا اور

اس موقع پر فیضؔ نے ایک نظم سنائی۔ سہروردی اس نظم سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کا مسودہ اپنے ساتھ لے گئے اور کسی اخبار یا رسالے میں چھپوا دیا تو متعلقہ عدالت اور جیل میں کھلبلی مچ گئی۔ فیضؔ سے دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا، سہروردی صاحب مسودہ لے گئے تھے' اُن سے پوچھیے۔ سہروردی جیسے محترم وکیل اور شعلہ فشاں سیاست داں سے پوچھنے کی ہمت کس میں تھی؟ میں یہ نظم سہ ماہی غالب کے فیض نمبر میں شائع کر چکا ہوں۔ (اپریل تا جون ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۰) اور فیضؔ کے چھٹے مجموعے "شامِ شہرِ یاراں" میں بھی شامل ہے۔ القصہ جیل میں اس قسم کی یا کسی اور نوع کی خفیہ درآمد برآمد بالکل بے حقیقت اور فیضؔ کے کردار و مزاج کے خلاف ہے۔

ایک اور موقع پر پطرسؔ بخاری کا نام لیے بغیر ان پانچ سو روپوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو اُنھوں نے لاہور میں ایلس فیضؔ کو دیے تھے۔ اصل خط میں تو "باجی کے شوہر" لکھا ہے مگر میں نے فٹ نوٹ میں درج کر دیا ہے کہ یہ پطرسؔ بخاری تھے۔ تمثیل میں پطرسؔ بخاری پر طنز کیا گیا کہ پانچ سو روپے دینے کی بجائے پانچ سو ملاقاتیں کرنا چاہیے تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ پانچ سو روپے ایلس فیضؔ کی ان دنوں کی خستہ حالی میں نہایت قیمتی اور ضروری تحفہ تھا۔ ان کے پاس تانگے تک کا کرایہ نہ تھا تو جون جولائی کی سخت گرمیوں اور نومبر دسمبر کی شدید سردیوں میں سائیکل پر آیا جایا کرتی تھیں اور پانچ سو روپے سے وہ کم از کم ایک ماہ تک اپنے گھر کا خرچ چلا سکتی تھیں۔ دوسرے یہ معمولی سی بات غور طلب ہے کہ قیدی سیاسی ہو کہ عام مجرم، کسی مُلک میں بھی اس سے ملاقاتوں پر ایک خاص پابندی اور اُن کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ بیویاں اپنے شوہروں سے اور ماں باپ اپنی اولاد سے بھی جیل میں پانچ سو بار نہیں مل سکتے۔ پطرسؔ بخاری نے پانچ سو روپے دیے۔ یہ ایک شفیق اُستاد کا اپنے شاگردِ رشید کے لیے بہت قیمتی، موزوں، اور بروقت نذرانۂ شفقت و محبت تھا۔ اس کی تحسین ضروری تھی اور طنز بالکل نامناسب۔

ان باتوں کے باوجود شیلا بھاٹیہ کی فیض پسندی اور اردو دوستی ہندوستان اور پاکستان کے اردو والوں کی نظر میں لائقِ تشکر ہے۔ دِلّی کے ان اصحاب کو جن کا مطالعۂ فیض وسیع ہے، شیلا بھاٹیہ سے زیادہ اشتراک کرنا چاہیے تھا۔ ایسا اشتراک شیلا بھاٹیہ کو اردو کے دوسرے ممتاز شعرا کا کلام غنائی تمثیلوں کی صورت میں پیش کرنے کے لیے اور بلند حوصلہ بنائے گا۔

حدیث یار کے عنواں

شادی کی شرائط

اور

نکاح نامہ

فیض اور ایلس کی شادی ۲۸ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو سرینگر میں ہوئی۔ نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھایا۔ براتیوں میں جوش ملیح آبادی اور مجاز مرحوم بھی شامل تھے۔ فیض کے مالی حالات اتنے سقیم تھے کہ وہ اپنے لیے کپڑے بھی نہ سلوا سکے۔ صرف ایلس کے لیے ایک انگوٹھی خرید سکے کیونکہ ایلس نے صرف یہی خواہش کی تھی کہ انھیں شادی میں انگوٹھی ضرور پہنائی جائے۔ متفرق اخراجات کے لیے فیض کو میاں افتخار الدین مرحوم سے تین سو روپے قرض لینے پڑے تھے۔
نکاح نامے پر فیض اور ایلس کے دستخطوں کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ، جی ایم صادق، ڈاکٹر تاثیر اور نور حسین کے دستخط ہیں جو ان دنوں سرینگر میں ہیلتھ انسپکٹر تھے۔ بیگم تاثیر کے بھی دستخط ہیں جو ایلس کی سگی بہن ہیں۔ نکاح سے پہلے طرفین میں ایک تحریری معاہدہ ہوا جو اس معاہدے کی نقل ہے جو علامہ اقبال نے ڈاکٹر اور بیگم تاثیر کی شادی کے سلسلے میں انگریزی میں مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر کا نکاح بھی علامہ اقبال نے پڑھایا تھا۔ متذکرہ معاہدے اور نکاح نامے کی ایک ایک مستند کاپی غالب لائبریری میں محفوظ

ہے۔ ذیل میں اس معاہدے کا مفہوم اور نکاح نامہ ایلس فیض کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شائع کیا جاتا ہے۔ م ط ح

شادی کی شرائط

یہ معاہدہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو فیض احمد ساکن سیالکوٹ (ہونے والا شوہر) اور ایلس کیتھرین جارج (ہونے والی زوجہ) متوطن لندن کے درمیان طے پایا جن کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ اس کی شرائط حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) اس معاہدے کے تحت دونوں میں طے پایا کہ چونکہ دونوں مسلمان ہیں اس لیے ان کی شادی مسلم شریعت کے مطابق ہو۔

(۲) اس معاہدے کی رو سے اور متذکرہ شادی کے پیشِ نظر فیض احمد اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایلس کیتھرین جارج سے شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد کسی صورت میں بھی کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کریں گے۔

(۳) اس معاہدے کے مطابق اور متذکرہ شادی کے پیشِ نظر فیض احمد اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کے تحت طلاق کا حق ایلس کیتھرین جارج کو منتقل کرتے ہیں۔

(۴) اس معاہدے کے تحت اور اسلامی قانون کی رو سے مہر کی رقم پانچ ہزار روپے مقرر کی گئی ہے جو شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد ایلس کیتھرین جارج کو ادا کریں گے۔

دستخط

جی ایم صادق		ایلس کیتھرین جارج
نور حسین	فیض احمد	شیخ محمد عبداللہ

لیکچرار ہیلی کالج آف کامرس، لاہور

نکاح نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ نحمدہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن
سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل فلا ھادی لہ
ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان محمداً
عبدہ ورسولہ ارسلہ بالحق بشیرا ونذیرا بین یدی الساعۃ من
یطیع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فانہ لا یضر الا نفسہ ولا
یضر اللہ شیئا یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس
واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونسآء واتقوا اللہ
الذی تسآءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا یایھا الذین
امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون یایھا
الذین امنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا یصلح لکم اعمالکم ویغفر
لکم ذنوبکم ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزا عظیما۔ و
نسئال اللہ ان یجعلنا ممن یطیعہ ویطیع رسولہ ویتبع رضوانہ
ویجتنب سخطہ فانما نحن بہ ولہ

امّا بعد

اینذکری است متون و میمون در بیان آنکہ دریں
زمان مسرت اقتران سعادت نشان در مجلسِ عقد نکاح
اصالتاً حاضر آمد پروفیسر فیض احمد خاں ولد سلطان محمد خاں

ساکن سیالکوٹ حال لکچرر ہیلی کالج آف کامرس لاہور و بخواست برای
خود بزنی و نکاح شرعی نفسِ مسماۃ ایلس کیتھرین جارج بالغہ
بنت مسٹر جی - او جارج ساکن ہولسٹریٹ لندن بمبادلۂ مہر
المشروع المتعارف المعجل ~~منہا~~ مبلغ پانچ ہزار روپے رائج الوقت
~~وطلوحبل ______ و تہان طلا مع لوازم آن مساوی قیمت~~
~~______ عدد اشرفی کہ آن نیز بر سبیل تعجیل و متعارف~~
~~قبیلۂ مخطوبہ است - و از قبل مخطوبہ مسطورہ وکیل شرعی است~~
~~______ باخبار مخبرین احدہما ______~~
~~______ و ثلیتہا ______ وکیل مذکور~~ بعد ثبوت
الوکالہ نفس موکلۂ خود بامرہا و اذانہا بزوجیت و نکاح
شرعی داد مر ناکح مذکور را در بدل ماذکر فی الصدر و ناکح مذکور
نفس وی در بدل ماذکر برای خود بزنی قبول کرد و پذیرفت و
ایجاب و قبول شرعی بین العاقدین واقع شد و عقد نکاح
بینہما منعقد گشت نکاحاً صحیحاً شرعیاً جائزاً
نافذاً علی سبیل الشہرۃ والاعلان لا
علی طریق الخفیۃ و الکتمان و وکیل منکوحۂ مذکورہ
بامر و اذن موکلۂ خود منجملۂ مہرین مبلغ پانچ ہزار روپے از ذمۂ
ناکح مذکور ~~حط کرد و اسقاط نمود~~ بحط و اسقاط صحیح شرعی
جملہ رقم مذکور بر ذمہ ناکح مذکور دین صحیح واجب الاداء و لازم الایفا
است ٭ عاجلاً بجانب منکوحہ مذکورہ خواہد رسانید ~~و نیز~~
~~وکیل منکوحہ اقرار نمود کہ ______ تہان و در عوض وصول است~~

المرقوم فی تاریخ ۲۸ ماہ اکتوبر ۱۹۴۱ء مطابق ۷ شوال ۱۳۶۰ھ

(اصل نکاح نامے کی طرح یہاں بھی بعض الفاظ کاٹ دیئے گئے ہیں)

مرزا ظفر الحسن

شورشِ زنجیر

مقدمۂ راولپنڈی سازش میں فیض احمد فیضؔ کو بھی قید اور جرمانے کی سزا سنائی گئی تھی۔ کتاب "فیض سوئے دار چلے" جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہے اسی مقدمے سے متعلق ہے اور ذیل کی تحریر اسی کا دیباچہ ہے۔ اس دیباچے سے ناظرین کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے کتاب میں کون سا زاویۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔

کسی مقدمے پر مدلل اور مفصل گفتگو یا سیر حاصل بحث اسی وقت ممکن ہے جب دعویٰ، صفائی کا جواب، وکلا کی بحثیں، گواہوں کے بیانات، جرح اور عدالت کا فیصلہ وغیرہ دسترس میں ہوں۔ مقدمۂ راولپنڈی سازش کے سلسلے میں یہ سب راز میں ہیں۔

مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ دستیاب ہی نہیں ہوتا۔ ضرورت منتشر مادہ ہائے خیال کو ایک جگہ کرنے کی تھی۔ مثال کے طور پر مرحوم لیاقت علی خان کا بیان ہے جو ہر لحاظ سے اس عمارت کا سنگِ بنیاد ہے اور اہمیت کا حامل ہوں تو ہی نے سب سے پہلے اس "سازش" سے عوام کو آگاہ کیا۔

دوسرے وہ قانون ہے جس کے تحت عدالتِ خاص (ٹربیونل) قائم کی گئی اور اس نے سماعت کے بعد سزائیں سنائیں۔

تیسرے میاں افتخار الدین کی تقریر ہے جو مرحوم نے متذکرہ قانون منظور کرنے والی آئین ساز (یا دستور ساز) اسمبلی میں اس کے ایک رکن کی حیثیت میں کی۔

چوتھے مرحوم ایوب خاں، جنرل اکبر خاں اور ظفر اللہ پوشنی کی کتابیں اور فیض احمد فیضؔ کی اسیری کے خطوط ہیں ("صلیبیں مرے دریچے میں") جن میں کچھ حوالے اور تبصرے ہیں۔ کچھ انکشافات اور اشارات درج ہیں۔ میں نے ان سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا ہے۔ ان کے کچھ حصے مستند معلوم ہوئے اور کچھ لمحاتِ فکر فراہم کرتے نظر آئے۔ میں نے ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ میری دانست میں اور دیانت کے مطابق معروضی ہیں، منطقی ہیں، جذباتی قطعاً نہیں ہیں۔ میرے پیشِ نظر یہ رہا ہے کہ ان کا کوئی حصہ کسی کی گمراہی کا سبب نہ بنے۔

ایک نکتہ پر میں بہ طورِ خاص زور دینا چاہتا ہوں جس سے عام لوگ ہی نہیں، تعلیم یافتہ طبقہ بھی واقف نہیں ہے۔ جو ناظرین فیضؔ کے مزاج شناس ہیں وہ اس نکتہ پر غور کریں کہ اگر فیضؔ نے اکبر خاں کی رتی برابر بھی حوصلہ افزائی کی ہوتی یا اکبر خاں کو ذرا بھی یقین ہوتا کہ اُن کی سازش کی پہلی منزل قریب تو نظر آنے پر فیضؔ اُن کی کوئی حمایت کریں گے تو معاملہ سنگین ہو جاتا اور اکبر خاں ضرور کچھ کر گزرتے (چاہے حشر کچھ ہی ہوتا)۔ لیکن فیضؔ نے انھیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ یہ فوجی نوعیت کا مسئلہ ہے اور ان جیسے بے بس شہری نہ اس کی تائید کر سکتے ہیں اور نہ کوئی دخل دے سکتے ہیں۔ "جنرل طارق" جیسے شعلہ بدن پر ٹھنڈے مزاج والے فیضؔ کی بات کا ضرور اثر ہوا ہوگا۔ کاغذی منصوبہ گرفتاری کے دن تک میز کی دراز میں پڑا رہا اور گرفتاری کے بعد کی خانہ تلاشی میں برآمد ہوا۔ اکبر خاں نے متذکرہ منصوبہ ترک کر دیا اور سمجھے کہ معاملہ ختم ہو گیا (حالانکہ "معاملہ" تو وہیں سے شروع ہوا)۔

ایک اور اہم نکتہ بھی ہے۔ دو میجر جنرلوں، ایک ایر کموڈور، دو بریگیڈیروں، دو لیفٹیننٹ کرنلوں اور چند چھوٹے فوجی افسروں کی پشت پناہی کے باوجود مبینہ منصوبہ (ہو سکتا ہے خفیف سے خون خرابے کے بعد ہی سہی مگر) بہت بُری طرح ناکام ہو جاتا۔ ایسا ہی بلکہ اس سے بہت بڑا اور مُلک گیر انقلابی منصوبہ مرحوم ایوب خاں نے بھی بنایا تھا۔ میرے خیال میں اُن کی کامیابی کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ پوری فوج اُن کے قابو میں تھی۔ ان کے انقلاب کے پیچھے غالباً سیاست کو سنوارنے کا نہیں بلکہ اقتدار پر قبضہ جمانے کا جذبہ کار فرما تھا۔ اُن کی ایک جیب میں سربراہِ مملکت تھا جو خود اقتدار کا زبردست پجاری تھا دوسری جیب میں افسر شاہی تھی۔ افسر شاہی اگر ان کی حمایت میں اس وقت نہ بھی تھی تو اچانک اور پہلی مرتبہ مُلک گیر مارشل لا نافذ کرنے، حکومت کو برطرف اور آئین کو منسوخ کرنے کی وجہ سے وہ بالکل بے دست و پا ہو گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں بقول ایوب خاں ایک سپاہی بھی اکبر خاں کی کمان میں نہ تھا۔ اُن کے کاغذی منصوبے کی رُو سے تین مہینے کے اندر آئین سازی سے لے کر الیکشن تک کے سارے مرحلے طے کر کے وہ حکومت سول انتظامیہ کو سونپنے والے تھے۔ بہ الفاظ دیگر وہ حکومت کی باگ ڈور سیاستدانوں کے سپرد کرنے والے تھے۔ یہ میں اُن کے مبینہ منصوبے کے متن کی بات بتا رہا ہوں۔ اُن کے دل میں کیا تھا خدا بہتر جانتا ہے۔ آئین سے الیکشن تک کے جو بے شمار کٹھن، پیچیدہ اور مُلک گیر مسائل ہوتے ہیں (میں آئین کمیشن، الیکشن کمیشن اور حلقہ بندی کمیشن سے اپنی سرکاری وابستگی اور تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں) انھیں تین ماہ کے اندر اکبر خاں اپنے بیٹن تو کیا جادو کی کسی چھڑی کے ذریعے نہ ۱۹۵۱ء میں حل کر سکتے تھے اور نہ بتیس ۳۲ سال گزرنے کے بعد ویسے ہی حالات ہوتے تو آج حل کر سکتے۔ ان دنوں مسائل بہت زیادہ اور ان کے لیے تین ماہ کی مہلت بہت کم ہے۔ اور لیاقت علی خان جیسی مقبول شخصیت کی موجودگی میں عوامی تائید کی توقع دیوانے کا خواب تھا۔

ہمارے معاشرے کا یہ المیہ رہا ہے کہ جب بھی کسی حکومت سے اختلاف رہا یا اُس کی مخالفت یا اس پر نکتہ چینی کی گئی تو اسے مملکت سے غداری اور بغاوت قرار دیا گیا (موجودہ حکومت اس باب میں مستثنیٰ ہے) علم السیاست کا اور بین الاقوامی نظریہ یہ ہے کہ حکومت اور مملکت دو الگ الگ عنصر ہیں مملکت سے وفاداری، اس کے رہنے والوں کا مقدس فرض ہے اور اس فرض کی خلاف ورزی کرنے والا بلاشبہ غدار ہے۔ حکومت کی حمایت کوئی حق نہیں ہے جو حکومت اہلِ وطن سے طلب کرے اور نہ ملے تو اُسے وطن سے بے وفائی قرار دیا جا سکے۔ مملکت اپنی جگہ دائم و قائم رہتی ہے اس لیے فرض کو بھی دوام حاصل ہے۔ حکومت بدلتی رہتی ہے اس لیے حمایت بھی عارضی ہوتی ہے یا بدل سکتی ہے۔ جمہوریت کے لیے سب سے موذی مرض یہی ہے کہ اختلاف کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی جائے۔ جمہوریت میں یہ تک ہو سکتا ہے کہ یکے بعد دیگرے اقتدار میں آنے والی دو حکومتوں کے نظریات میں بُعد المشرقین ہو۔ ایسا بھی ہُوا ہے کہ پارلیمانی نظام کے تحت اقتدار سنبھالنے کے بعد اُسی جماعت نے آئین میں بنیادی تبدیلی کر کے پارلیمانی کو منسوخ اور صدارتی نظام کو رائج کر دیا یا پارلیمانی اور صدارتی نظام ہائے حکومت کو ملا کر ایک ملغوبہ قسم کا نظام رائج کر دیا ہو۔ آمریت کا راستہ روکنے کی موثر تدبیر یہ ہے کہ حزبِ اختلاف کو زندہ رہنے دیا جائے اور دُوسرے چھوٹے اختلافات کو غداری کا جامہ نہ پہنایا جائے کیوں کہ مُلک کے قوانین ہر قسم کی سیاسی بے راہ روی، ہڑبونگ اور شورشرابے کا انسداد کرنے کے لیے موجود ہیں محض لیبل لگانے، اخباری بیانات جاری کرنے اور کھوکھلی تقریریں کرنے سے کام نہیں بنتا۔

پاکستان میں غداری، بغاوت، کمیونسٹ یا کسی دُوسرے مُلک کا ایجنٹ قرار دیا جانا مُلک دُشمنی، اسلام دشمنی اور اسی قسم کے خطابات سے اتنا نوازا گیا ہے اور ایسی ایسی سرکردہ شخصیتوں کو سرفراز کیا گیا ہے کہ اب یہ لیبل اور الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ ایک ممتاز سیاسی جماعت کے سربراہ نے اپنے اخباری بیان میں ارشاد فرمایا کہ ہماری پولیس میں "رُوسی ایجنٹ" گھس گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ کسی نے، اور اخباری شواہد نہیں ملتے کہ حکومت نے بھی ان سے دریافت کیا ہو کہ مولانا آپ کے ذرائع معلومات کیا ہیں اور ذرا ان رُوسی ایجنٹ قسم کے پولیس والوں کے نام تو بتا دیجئے تاکہ انھیں دار پر لٹکایا جا سکے۔ بتا دیتے تو ان کے طفیل یہ ایجنٹ تو پکڑے جاتے۔

اسی طرح اس پر بھی تعجب ہوتا ہے کہ کوئی "امریکی ایجنٹ" کی تو بات ہی زبان پر نہیں لاتا میں بنیادی طور پر ہر ایجنٹ کا مخالف ہُوں خواہ وہ رُوس کا ہو، امریکہ کا یا کسی اور مُلک کا۔ پاکستان کو دلالی کا کوئی سودا منظور نہیں۔ ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ نئی نسل کو ایسے گمراہ کن خطابات اور پریشان کرنے والے القاب سے ذہنی اذیتوں میں مبتلا نہ کیا جائے، تو جوانوں تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ کتنے ہی "غدار" ایسے نکلے جن کے سر پر حکومت کا تاج رکھا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ خود راولپنڈی سازش کے مجرمین وزیر اور سفیر

تک بنائے گئے ہیں۔ وزیر داخلہ محمود ہارون صاحب کے بیان کے مطابق (روزنامہ جنگ کراچی ۳۱ مئی ۱۹۸۲ء) "دوسروں کو غدار کہنے کی روایت ختم کی جائے .... ماضی میں یہ روایت رہی ہے کہ حکومت کی مخالفت کرنے والوں کو غدار کا لقب دیا جاتا تھا حالانکہ حکومت سے اختلاف کرنا کوئی غداری نہیں، اور پھر جن لوگوں کو غدار کے لقب سے نوازا گیا بعد میں وہی ملک کے سربراہ بھی بنے "

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران اور ختم کرنے کے بعد ناظرین جن امور پر خاص طور سے غور کریں ان میں سے چند یہ ہیں۔ کیا اکبر خاں کا مبینہ منصوبہ اور ایوب خاں کا انقلاب، جہاں تک مرکزی خیال اور بنیادی مسائل کا تعلق ہے، ایک جیسے نہیں تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اوّل الذکر پر عمل ہی نہیں ہوا اور ثانی الذکر کامیاب قرار دیا گیا۔

کیا دادرسی کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا قانون اور انصاف کے مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی نہ تھا کہ ملک کے مروجہ قوانین کی موجودگی میں ایک خاص قانون منظور کیا گیا کہ نہ صرف سماعت کون کرے بلکہ کس طرح کرے؟

کیا یہ ملک کی عدلیہ کی توہین نہ تھی کہ عدلیہ کے مکمل اور فعال نظام کی موجودگی میں دوسری تمام عدالتوں کو جن میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت فیڈرل کورٹ آف پاکستان بھی شامل تھی، اس مقدمہ سازش کی کسی جزوی سماعت سے بھی قانوناً روک دیا گیا تھا۔

ہر مہذب ملک میں دو ادارے سب سے زیادہ مؤقر اور محترم ہوتے ہیں۔ ان ہی سے اس ملک کی بین الاقوامی ساکھ قائم ہوتی ہے۔ ایک اس کی فوج ہے، دوسرے اس کی عدلیہ۔ اگر ان دونوں کا احترام مجروح ہو تو اقوامِ عالم اس ملک کی عزت و عظمت پر شک و شبہ کی نظریں ڈالنے لگتی ہیں۔ اندرونِ ملک بھی ذہنی اضطراب و اضطرار کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، معاشرے کو مدتوں مفلوج رکھتی ہے۔ ہم اپنی افواج اور عدلیہ پر جس قدر فخر کریں کم ہے۔

عدلیہ کے ضمن میں اس مقدمے کے ستائیس سال بعد کا ایک واقعہ آپ کے غور کا محتاج ہے۔ ہندوستان سے متعلق ہے۔ جہاں اُس وقت جنتا پارٹی حکمران اور اندرا کانگریس پارٹی قوم کے زیرِ عتاب تھی۔ روزنامہ جنگ کراچی میں ۲ راگست ۱۹۷۸ء کو ایک خبر اس سُرخی کے ساتھ چھپی تھی —— "اندرا پر خصوصی عدالت میں مقدمہ چلانے کے لیے سپریم کورٹ سے رائے طلب کرلی گئی۔" (نئی دہلی)

> "بھارت کے صدر سنجیوا ریڈی نے شاکمیشن کی تحقیقات کی رپورٹ کی بنیاد پر سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور بعض دوسرے افراد پر مقدمہ چلانے کے لیے خصوصی عدالتوں کے قیام کے بارے میں سپریم کورٹ (آف انڈیا) سے رائے طلب کی ہے۔ صدر نے سپریم کورٹ کو اس سلسلے میں درخواست

کے ساتھ خصوصی عدالتوں کے قیام کے بارے میں (لوک سبھا کے) مجوزہ بل کا مسودہ بھی بھیجا ہے .... توقع ہے کہ سپریم کورٹ کی رائے موصول ہونے کے بعد اندرا اور دوسروں پر مقدمہ چلانے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کر دی جائیں گی۔"

اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں جو کچھ کیا گیا ہے یہ کتاب اس کا احاطہ کرتی ہے۔ اب کچھ اور امور۔

کیا یہ حیرت ناک بلکہ ایک عجوبہ نہیں ہے کہ ایک سول ٹریبونل کو آرمی ایکٹ کی دفعات میں ملوث گیارہ فوجی ملزمین کے مقدمے کی سماعت کا اختیار دیا گیا؟ مارشل لا میں فوجی عدالتیں تو شہریوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتی ہیں مگر تاریخ پاکستان کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ سول ٹریبونل نے عام حالات میں فوجیوں کا مقدمہ سُنا اور سزا سُنائی۔

کیا اس کا کوئی جواز ہے کہ سازش تو اس لحاظ سے "فوجی" تھی کہ کوئی ۶۵ فی صد ملزمین فوجی تھے۔ مگر تفتیش پولیس نے کی اور "ایف آئی آر" بھی اسی نے پیش کی۔ فوج کی جانب سے نہ کوئی مفتش پیش ہوا نہ کوئی وکیل۔ اس سازش کو فوجی کہنے کا ایک سبب خود وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے بیان کا وہ حصہ ہے جس میں انھوں نے پاکستان کے لیے ہماری افواج کی "والہانہ اور شک و شبہ سے بالاتر" محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا، "تمام شر پسند عوامل کا مقابلہ انھوں نے کس بے جگری کے ساتھ کیا ہے یہی تو وہ صفات تھیں جن کی بنا پر سازش کے منصوبے کو اس عدیم المثال کامیابی کے ساتھ شکست دی گئی ہے۔"

کیا اس کا کوئی جواب ہے کہ پہلے چار ملزمین کو شروع مارچ میں گرفتار کیا گیا اور بقیہ کو کوئی دو ماہ بعد مئی میں پکڑا گیا؟ جبکہ وزیر اعظم کے بیان کے مطابق "یہ لوگ اگر کامیاب ہو جاتے تو ان کی کارستانی کی ضرب براہِ راست ہمارے قومی وجود کی بنیادوں پر پڑتی اور پاکستان کا استحکام معرضِ خطر میں ہوتا۔ پہلے چار گرفتار شدگان میں ایک میجر جنرل اکبر خاں تھے۔ دوسرے بریگیڈیر لطیف۔ اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک میجر جنرل اور ایک بریگیڈیر کی گرفتاری سے باقی کو سانپ کیوں سونگھ گیا جبکہ ان میں بھی ایک میجر جنرل ایک ایر کموڈور، ایک بریگیڈیر، دو لیفٹیننٹ کرنل اور چند دوسرے چھوٹے افسر موجود تھے۔ آخر اس کاغذی منصوبے میں یہ بھی تو لکھا اور طے کیا گیا ہوگا کہ کون کس کا جانشین ہوگا یا کس کے بعد کون کیا کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ حکومتِ وقت نے باقی گیارہ کی گرفتاری دو ماہ تک کیوں روکے رکھی؟ رہا پاکستان کے استحکام کا معرضِ خطر میں ہونا یا ہمارے قومی وجود کی بنیادوں کا سوال، تو افراتفری اور سیاسی قلابازیوں کے باوجود ۱۹۵۱ء میں ہماری بنیادیں اتنی مستحکم تھیں کہ ہم سے بڑے اور مضبوط تر ملک کو ہمارے خلاف کوئی اقدام کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچنا پڑتا کہ اقدام کی صورت میں خود اس کا کیا حشر ہوگا۔ لیاقت علی خاں نے مذاق میں مُکّا نہیں دکھایا تھا۔

ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔ اکبر خاں کے گھر میں ۲۲ر فروری ۱۹۵۱ء کو ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں فیض بھی شرکت کرتے ہیں۔ بحث و تمحیص کا دوران سات گھنٹے ہوتا ہے۔ راولپنڈی افواجِ باقاعدہ کا ہیڈ کوارٹرز ہے۔ کمانڈر اِن چیف کا قیام بھی راولپنڈی میں ہے۔ انھیں اور ان کی خفیہ کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اکبر خاں کے مکان پر اتنی طویل نشست ہوئی۔ میں کمانڈر اِن چیف اور ان کی ملٹری اِنٹیلی جینس کی لاعلمی کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ وزیر اعظم کو اس سازش کی معلومات صوبہ سرحد کے گورنر چندریگر نے بہم پہنچائیں ——— ارجنٹینا نے اچانک اپنی فوجیں جزائر فاک لینڈ میں اتار دیں تو برطانیہ کے وزیرِ خارجہ نے اپنی بے خبری کے اعتراف کے طور پر وزارت سے استعفیٰ دے دیا ——— چند برس پہلے ہندوستان میں ریل کا ایک زبردست حادثہ ہوا تو ریلوے کے وزیر مستعفی ہو گئے۔ اسی طرح جب وزیر اعظم کے بیان کے مطابق "پاکستان کے دشمنوں کی ایک سازش پکڑی گئی" جس میں گیارہ فوجی افسر ملوث تھے اور جرنیل صاحب بالکل ہی لاعلم نکلے تو انھیں چاہیے تھا کہ وہ اپنا استعفیٰ پیش کر دیتے یا لیاقت علی خاں کے لیے لازم تھا کہ وہ ان کا استعفیٰ طلب کر لیتے کیونکہ ان ہی کے بیان کے مطابق اس سازش کا "مقصد ملک کی سلامتی کو معرضِ خطر میں ڈالنا اور پاکستان کی مسلح افواج کے باوقار نام کو بٹہ لگانا تھا"۔

اس باب میں دو متضاد رائیں نہیں ہو سکتیں کہ اکبر خاں نے ایسی اسکیم کیوں سوچی تھی۔ وہ ایک جوشیلے فوجی تھے۔ کشمیر کے معاملے میں انھیں سخت شکایت تھی۔ اس جلتی پر ملک کی آئینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی بدحالی نے تیل چھڑکا اور انھیں گمان گزرا کہ وہ انقلاب لا کر حالات سدھار سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۲۲ر فروری کی نشست میں جو بحث مباحثہ ہوا اس سے اکبر خاں نے نتیجہ نکالا ہو گا کہ کامیابی کے امکانات نہیں ہیں۔ چنانچہ اکبر خاں کے بیان کے مطابق اُن کی مجوزہ اسکیم ترک کر دی گئی۔ ایوب خاں نے اپنی کتاب میں کچھ نہیں بتایا ہے کہ اُس سازش پر کب اور کس طرح عمل کیا جانے والا تھا۔

استغاثے نے جس بات کو بنیاد بنا کر مقدمہ چلایا تھا، یہ تھی کہ حکومت کا تختہ اُلٹا جانے والا تھا۔ اکبر خاں کو اس سے انکار تھا اور اُن کا بیان ہے کہ سارا معاملہ ۲۲ر فروری ہی کو ختم ہو گیا تھا۔ اتنی سی بات کو حکومتِ وقت نے اتنا بڑا افسانہ کیوں بنا دیا؟ میں اس سازش کو "اتنی سی بات" اس لیے کہہ رہا ہوں کہ گرفتاری سے فیصلہ تک کے مراحل کے تجزیے سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ استغاثہ کمزور تھا۔ اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ خاص قانون منظور کیا گیا اور سماعت صیغہ راز میں ہوئی۔ اور کئی امور ہیں جن کا مفصل ذکر متن میں ملے گا۔ میرے خیال میں متعلقہ ملزم افسران کے خلاف محکمہ جاتی تحقیق و تفتیش کے بعد قانونی نہیں بلکہ ضابطے کی محکمہ جاتی کارروائی کر کے معاملہ ختم

کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

مجھے یہ کامل احساس ہے کہ کچھ ناظرین کو ضرور یہ تجسس ہوگا کہ ساری رد و قدح اور قیل و قال کے بعد خود اس مصنف کا اپنا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے اکبر خاں کے مبینہ منصوبے کو بچکانہ قرار دیا ہے۔ میں اسے انصاف کے مسلّمہ اصولوں کی خلاف ورزی قرار دیتا ہوں کہ نظامِ عدلیہ کی موجودگی میں ایک خاص عدالت محض اس مقدمے کی خاطر تشکیل دی گئی۔ میرا یہ کہنا ہے کہ کھلی عدالت میں مروجہ قوانین اور طریقِ سماعت کے مطابق مقدمہ چلایا جاتا ــــــ ضرور چلایا جاتا ــــــ اور جن پر الزام ثابت ہو جاتا، چاہے وہ فیض ہوتے یا کوئی دوسرا، اُسے قانون کے مطابق ضرور سزا دی جاتی۔ اس مقدمے کے پس منظر میں کوئی سیاسی چال تھی یا کوئی دوسری معقول وجہ تھی، اس کا کوئی دستاویزی ثبوت میری دسترس میں نہیں ہے اس لیے قیاس آرائی کے ذریعے میں مستقبل کے مورخ کو کسی اُلجھن کا شکار نہیں ہونے دوں گا۔ جتنے مُنھ اتنی باتیں۔ فیض اور اُن کے ساتھی ملزموں کی موافقت اور مخالفت میں اور اسی طرح ان دنوں کی حکومت کی تائید اور تردید میں کافی سُنتا رہا ہوں مگر ان سب سے میں نے یہی کہا اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے کہ صحیح فیصلہ مستقبل کرے گا جب ساری متعلقہ دستاویزات دسترس میں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکبر خاں نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ ضرور بنایا تھا مگر ان کا کہنا ہے کہ اُسے ترک کر دیا تھا۔ اس سے یہ مُراد بھی نہیں ہے کہ اکبر خاں نے فیض سے امداد و اشتراک کی خواہش نہیں کی تھی۔ ضرور کی تھی مگر فیض نے اس کی تائید سے انکار کر دیا تھا اور ان کے انکار ہی نے اکبر خاں کو اپنی اسکیم ترک کرنے پر مجبور کیا تھا۔

"راز" کا جو بیج اس قانون اور مقدمے کے سلسلے میں بویا گیا اس سے ایک پودا اُگا اور اس کی پہلی شاخ لیاقت علی خاں کی شہادت کی تحقیقاتی رپورٹ ہے جو اتنی مُدت گزرنے کے بعد آج بھی "راز" ہے۔ آخر حکومتیں اپنے سینوں میں کتنے راز چھپائے رکھیں گی اور کیوں؟ دوسروں کو کیا کہیں خود سہروردی مرحوم نے، جو اس مقدمے میں فیض کی جانب سے وکالت کر چکے تھے، جب وزیر اعظم ہوئے تو انھوں نے بھی مقدمے کی ساری کارروائی کو "راز" ہی رہنے دیا۔

متن میں بعض نکات کی بار بار کی تکرار کا مجھے کامل احساس ہے۔ اسے تصنیف کی کوئی غیر شعوری خامی قرار نہ دیا جائے بلکہ یہ ترتیب کی ناگزیر ضرورت اور کتاب کی نوعیت کا ایک لازمی تقاضا تھا۔

میں نے کتاب کا نام اور ابواب کی سُرخیاں کلامِ فیض سے حاصل کی ہیں۔ کتاب بہت پہلے تیار کر چکا تھا مگر بوجوہ اب تک شائع نہ کر سکا مگر اس بیچ میں فیض کے خیال سے قطعاً غافل نہیں رہا۔ چنانچہ پندرہ روزہ "آہنگ" کے لیے مسلسل بارہ مضامین لکھے۔ سہ ماہی غالب کا فیض نمبر مرتب کیا "عمرِ گزشتہ کی کتاب" (فیض اور مخدوم کی زندگی کے حالات اور تخلیقات کا تذکرہ) شائع کی اور فیض کے

دیباچوں اور مقدموں کا تجزیاتی مطالعہ "قرضِ دوستاں" کے نام سے شائع کیا۔

جن اصحاب کو مجھ سے شکایت ہے کہ مَیں فیض پر بہت لکھتا ہوں، مجھے اُن سے اُلٹی یہ شکایت ہے کہ وہ تو فیض کی مخالفت میں بھی کچھ نہیں لکھتے۔ اُن سے گزارش ہے کہ فیض کے خلاف ہی سہی، کچھ لکھیں تو۔ فیض بہت بڑا اور اہم موضوع ہے۔ اس پر کچھ تو کام کریں۔

آخر میں یہ عرض کر دوں کہ مقدمے کے پندرہ متعلقین میں بشمول فیض احمد فیض تین ایسے اصحاب ہیں جن سے مَیں سازش اور سماعت کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کر سکتا اور معلومات حاصل کر سکتا تھا یا کتاب کا مسوّدہ انھیں دکھا سکتا تھا مگر مَیں نے ایسا نہیں کیا۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ اس پر اُن کی فکر یا جذبے کا کوئی عکس پڑے۔ مَیں نے یہ کتاب کسی سے نفرت ظاہر کرنے کے لیے نہیں بلکہ فیض کی محبّت میں اور اپنے وطنِ عزیز کی عدلیہ کے احترام کی خاطر لکھی ہے۔ عدلیہ زندہ باد' افواج پاکستان پائندہ باد۔

مرزا ظفر الحسن

فیض ایلس اور میں

فیض کو یار کی یاری سے مطلب ہے اس کے فعلوں سے نہیں۔ کسی کی کمزوری کی نشان دہی کرو تو کہتے ہیں ہر تیسرے چوتھے آدمی میں اس جیسی یا اس سے زیادہ بڑی کمزوری ملے گی۔ محبت کرتے ہیں مگر اندھی محبت نہیں جس کا ایک نام عشق اور دوسرا خلل ہے دماغ کا۔ کاہل ہیں اور اس حد تک کہ کہتے ہیں کاہلی کے لیے جتنی فراغت چاہیئے نصیب نہیں ہوتی۔ مستعد ہیں اور اتنے کہ رات دو بجے تک جاگ کے لیٹ گئے اور صبح پانچ بجے اُٹھ کر دیارِ مغرب روانہ۔ کچھ باتوں میں با اختیار ہیں، بعض میں بے اختیار اور چند ایک میں پتا نہیں چلتا اختیار کس کا ہے۔ نیند اختیاری مضمون ہے۔ چار منٹ بھی سو لیں گے چار گھنٹے بھی۔ زمان و مکاں کی قید نہیں۔ صبح نو بجے بھی نیند طاری کر لیں گے شام چھ بجے بھی، موٹر میں بھی، ہوائی جہاز میں بھی، سوٹ میں بھی سو لیں گے اور اوورکوٹ پہن کر بھی۔ شامِ یاراں کی محفل میں ان کا میزبان با اختیار ہوتا ہے۔ گیارہ بجے محفل برخاست کر دے تو گھر واپس، دو بجے تک روک لے تو "حاضر سائیں"۔ کالی پتلون پر گہرا نیلا بش شرٹ پہن کر کہیں گے "اپنی دوست مریم بلگرامی نے دلی میں دلایا تھا۔" مریم کیا تمھارے شہر میں ہمارے شاعر کے لیے بس یہی ایک رنگ ملا تھا؟

فیض سے میری دوستی اور قرب نہ حادثہ ہے نہ راز۔ نہ میرا کوئی کمال ہے نہ ان کی کوئی کمزوری۔ بات ایک تو مزاج شناسی کی ہے، جس میں فیض کی حد تک میں ماہر

ہوں۔ دوسرے یاری کی ہے جس کے فیض ماہر ہیں۔ صرف دس سال سے جانتا ہوں جس میں پانچ سال فیض نے ضائع کیے کہ مجھے اپنے قریب نہیں کیا اور پانچ سال میں نے اس طرح صرف کیے کہ انھیں دور نہ ہونے دیا۔ اب وہ لاہور میں رہتے ہیں۔ اور ان سے ہزار میل دور میں کراچی میں۔ اس کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کی دسترس میں ہیں۔

ایلیس لندن نژاد خاتون ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کی فارغ التحصیل اور بقول فیض امتحان ان سے زیادہ نمبروں سے پاس کیا ہے۔ اگرچہ ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ پروفیسر لینگ ہارن نے فیض کو ایک سو پچاس میں سے ایک سو پینسٹھ نمبر اس عجز کے ساتھ دیئے کہ اس سے زیادہ کے فیض مستحق تھے مگر پروفیسر صاحب دے نہیں سکتے تھے۔ ایلیس نہ یاری کی قائل ہیں نہ عیاری کی۔ ہر ایک سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتیں مگر جن سے ملیں گی اچھی طرح ملیں گی۔ جس سے دل مل گیا اس کی ہو رہیں جیسے خدیجہ بیگم، شمیمہ شکور اور میں۔ جو پسند نہیں آیا اُسے محاورتاً ٹھینگا دکھا دیا۔ قریباً گوشہ نشین ہیں۔ تقریبوں اور دعوتوں میں کم جاتی ہیں۔ جہاں جاتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ یہی فکر وہی جو فیض کی ہے۔ فیض کی طرف سے فکر مند کہ وقت پر کھانا کھائیں، آرام کریں اور سگریٹ کم پییں۔ فیض اپنی مرضی کے مطابق جس سے چاہیں ملیں، جس کو ایلیس نہ چاہیں اس سے بھی ملیں۔ چنانچہ فیض کے ملنے والوں میں ایسے بھی ہیں، ویسے بھی اور بعض تو بالکل ایسے ویسے۔ حورانِ شہر فیض پر فدا ہوں کوئی حرج نہیں خود فیض ایلیس پر فدا ہیں یہ ایلیس کے حق سے زیادہ فیض کے فرض کی بات ہے۔ فیض بڑے فرض شناس ہیں۔ سلیقہ، صفائی، کم آمیزی، مدرسی مطالعہ اور پابندی ایلیس کی خوبیاں یا خامیاں ہیں۔ اپنوں اور بیگانوں کو ان کی حدود میں رکھنے کا گر جانتی ہیں۔ نہ جان چھڑکیں گی اور نہ جان چھڑائیں گی۔ ایلیس ایک ایسی کتاب ہیں جس کا مطالعہ لغت کے بغیر ممکن نہیں اور وہ لغت فیض کو حفظ ہے۔ کچھ مجھے بھی یاد ہے اسی لیے ان کے گھر میں ایلیس اور میں فیض کے میزبان کی طرح رہتے ہیں۔ میں دونوں کو جانتا ہوں۔ اور زیادہ جاننا چاہتا ہوں۔ ان کی شخصیت اور زندگی پر

لکھنا چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ لکھنا چاہتا ہوں۔

جب (۶۸-۱۹۶۶ء میں) انجمن طلباء قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی کا سیکرٹری تھا تو میں نے ایک ادبی مقدمے کی طرح ڈالی جس میں امراؤ جان آدا نے مرزا رسوا کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کیا۔ تین میں سے دو ججوں کا انتخاب کر لیا مگر چیف جج کے لیے کوئی موزوں نام سوجھ نہیں رہا تھا۔ اتفاق سے کسی جگہ فیض احمد فیضؔ کا کوئی ذکر ہوا تو میں نے سوچا کراچی کی زبان میں انھیں "ٹرائی کروں"۔

ایک شام ان کے گھر پہنچا، گھنٹی بجائی، نوکر نے دروازہ کھولا۔ اندر ایک انگریز خاتون نظر آئیں۔ ان سے انگریزی میں کہا مسٹر فیض احمد فیضؔ سے ملنا چاہتا ہوں، موصوفہ نے اردو میں جواب دیا "بیٹھیے ابھی آتے ہیں" خاتون نے ذرا اونچی آواز میں پکارا "فیضی" اور اپنے کمرے سے ایک صاحب برآمد ہوئے جو فیض احمد فیضؔ تھے۔ اب تک صرف تصویر دیکھی تھی آج تصویرِ مجسم کو دیکھ لیا۔ نہ کوئی خاص خوشی ہوئی نہ حیرت۔ آدمی کی طرح آدمی نکلے۔

اپنا نام بتایا، مدعا بیان کیا تو کہا "ٹھیک ہے"۔ جواب مجھے مبہم معلوم ہوا تو واضح سوال کیا کہ آپ چیف جج بنیں گے؟ پھر فرمایا "ٹھیک ہے"۔ اس پہلی ملاقات میں نہ گل کھلے نہ مے پی بس تین منٹ ملے اور بہار گزر گئی۔ اگر وہ بہار تھی۔ حیران ہوا کہ فیضؔ نے نہ انجمن کے متعلق کچھ پوچھا نہ مقدمے کی بابت اور نہ یہ کہ میں کون ہوں کیا کام کرتا ہوں سگریٹ کے چار چھ کش لیے اور قصہ ختم۔ دل ہی دل میں اپنی داد دی کہ فیض جیسے شاعر کو ایک مقدمے میں پھانس لیا۔ ان دنوں فیضؔ عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل تھے۔ سرکار اور شاعر ایک دوسرے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

چند روز بعد ہاجرہ مسرور کے گھر پر ججوں کو جمع کیا تاکہ مقدمے کی سماعت کے سلسلے میں تینوں کوئی طریقہ کار طے کرلیں۔ فیضؔ، مہدی علی صدیقی اور خود ہاجرہ مسرور۔ فیضؔ کے گھر انھیں لینے پہنچا تو کہا آپ چلیے میں ابھی آتا ہوں۔ آئے، مہدی علی صدیقی سے تعارف ہوا کہ یہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ و سیشن جج ہیں تو بولے یہ تو اچھا ہوا عدالت کا

طریقہ کار ہم کیا جانیں اور کیا طے کریں صدیقی صاحب خود جج ہیں جو یہ کہیں گے ہم کریں گے۔ فیصلہ بھی یہی سنائیں گے۔ پانچ منٹ ٹھہر کر چلے گئے تو میں نے چپکے سے کہا "مہدی بھائی اب عدالت کا زیادہ بوجھ آپ پر ہوگا کیونکہ یہ تو واقعی شاعر آدمی ہیں۔ سماعت کے دوران فکرِ شعر کرتے رہیں گے"۔ فیض کا اپنا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ مدت سے کوئی بڑا مشاعرہ نہیں ہوا تھا اس لیے مجھے ذاتی طور سے اندازہ نہ تھا کہ شاعر کے چاہنے والے کتنے ہیں۔

اتوار ۴ ستمبر ۱۹۶۶ء کو کراچی کے تھیوسافیکل ہال میں مقدمہ پیش ہوا۔ اتنا بڑا ادبی اجتماع میں نے ہی نہیں کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسٹیج پر ونگ کی جانب سے پہلے فیض ان کے بعد ہاجرہ مسرور اور پھر مہدی علی صدیقی نمودار ہوئے۔ چیف جج کی کرسی باقی دو کرسیوں کے مقابلے میں زیادہ شاندار تھی اور فیض کو اس پر بیٹھنا تھا۔ فیض نے ہاجرہ مسرور سے کہا اس کرسی پر آپ بیٹھیں۔ وہ بیٹھ گئیں اور میں نے سر پیٹ لیا کہ لو شاعر آدمی نے ابتدا ہی میں گڑبڑ کر دی۔ ہمیں ان کے رتبے کا خیال اور انھیں انگریزی تہذیب سوجھی۔

جج عدالتی لباس پہنے ہوئے تھے، ان کے آنے سے پہلے میں نے سنجیدہ مگر رعب دار آواز میں حاضرین سے کہا تھا کہ عدالت کا احترام ملحوظ رکھا جائے اور جب وہ تشریف لائیں تو مقدمے کے وکلاء اور حاضرین ادباً کھڑے ہو جائیں۔ سب کے سب بشمول حضرت جوشؔ ملیح آبادی کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ جج بیٹھ نہ گئے۔ کارروائی شروع ہوئی مگر حاضرین بالکل گم سم۔ جوشؔ صاحب بھی جن کے منھ میں پان تھا نظر بچا کر ہی منھ چلا رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ گزرے تو میں نے محسوس کیا فیض کو کوئی خاص بے چینی ہے اور بار بار پہلو بدل رہے ہیں۔ اشارے سے مجھے بلایا اور کان میں کہا "سگریٹ پینے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟" میں نے کہا "ایک ہی صورت ہے، یہ کہ عدالت حاضرین کو سگریٹ نوشی کی اجازت مرحمت کرے" فرمایا "ہماری طرف سے اجازت ہے"۔ میں نے اعلان کر دیا اور فیض ہی نے ہال میں

پہلا کش لگایا۔ جب اس مقدمے کی روداد اور مضامین وغیرہ اخباروں میں چھپے تو ان میں فیض کا اور میرا نام بار بار آیا۔ اس پر کچھ احباب نے مجھے ڈرایا کہ فیض معتوب سرکار ہیں۔ ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگی ہوئی ہے تم چکر میں آجاؤ گے۔ میں نے جواب دیا مخدوم محی الدین کی وجہ سے خفیہ پولیس تو ہماری جوانی سے ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

امراؤ جان کے بعد میں نے دوسرا ادبی تضیہ کھڑا کیا "غالب کے اڑیں گے پرزے" اور اس کے ساتھ "نقوش غالب" کے عنوان سے تصاویر کا ایک انعامی مقابلہ۔ نمائش کے ضمن میں اعلان کیا کہ کراچی کے مصوروں کو غالب کے اشعار کا مفہوم سمجھانے کے لیے "درس غالب" شروع کیا جا رہا ہے۔ ۱۲ فروری ۱۹۶۷ء کو فیض نے غالب پر اپنی ایک تقریر سے اس درس کا افتتاح کیا۔ میری ملاقات کا یہ دوسرا سلسلہ تھا جس کے لیے مجھے ان کے گھر صرف ایک مرتبہ جانا پڑا۔ جہاں کوئی تین چار منٹ ہی ٹھہرا۔

نقوش غالب اور غالب کے اڑیں گے پرزے کی مصروفیات ختم ہونے پر میں نے شرکا اور معاونین کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ فیض بھی آئے دیکھا ساری خواتین ایک طرف ہیں اور مرد دوسری طرف تو بولے خواتین نے پاکستان کے اندر ایک اور پاکستان بنا رکھا ہے۔ فیض نے پہلی مرتبہ میرے گھر کھانا کھایا مگر یہ دعوت انجمن کی جانب سے تھی۔

جنوری ۱۹۶۸ء کے پہلے ہفتے میں سبط حسن نے ٹیلی فون پر کہا فیض نے تمھیں بلایا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو کہا میرا اندازہ ہے کہ تم نے غالب کے پرزے اڑانے کی جو کوشش کی تھی شاید اس کی کوئی سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس جملے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے دن سبطے کے گھر پہنچا جو سرک پار فیض کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہم دونوں فیض کے گھر گئے جہاں انھوں نے کہا فروری ۱۹۶۸ء میں پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جانے والی ہے۔ ہمارا بھی ارادہ ہے کہ کراچی میں کچھ کام کریں۔ آپ ایک انجمن بنائیں اور کام شروع کر دیں" اس کے بعد

کہا" البتہ ایک بات یاد رکھیے۔ ویسے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے مگر از خود کوئی کام نہیں کریں گے۔ آپ جو کام ہمارے سپرد کریں، کریں گے"۔ اس کے بعد اضافہ کیا" دوسروں کے متعلق سمجھ لیجیے کہ وعدے سب کریں گے پورا کوئی نہیں کرے گا"۔ اس پر سبط حسن نے کہا"ہم تو وعدہ بھی نہیں کرتے۔ سارا کام تم ہی کو کرنا ہوگا"۔ فیض نے آخری جملہ کہا " بالکل تنہا"۔

یہ میرے لیے کوئی چیلنج نہیں اعزاز تھا۔ کیونکہ فیض جیسی شخصیت کو مجھ پر اعتماد کہ میں انجمن بنا سکتا ہوں، صد سالہ برسی کا انتظام کرسکتا ہوں۔ اور سب کچھ اکیلے۔ اُسی وقت نام طے کیا" بزم غالب" اور پانچ سات منٹ ٹھہر کر آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات سے پہلے یا اس کے بعد سبطے اور فیض میں میری بابت کیا گفتگو ہوئی۔ نہ میں نے پوچھا نہ کسی نے بتایا۔ بزم غالب کے قیام اور نام کا اعلان اخباروں میں چھپوا دیا۔ دو چار دن بعد بزم کے پیڈ بنوانے انجمن پریس گیا تو وہاں معلوم ہوا کہ اس نام کی ایک انجمن دس پندرہ برس سے قائم ہے۔ اس خیال سے کہ نام پر کیوں کسی سے جھگڑا مول لیں اور وہ بھی ابتدائی دنوں میں اپنے طور پر طے کیا کہ بزم غالب کی بجائے ادارۂ یادگار غالب نام رکھوں۔ فیض سے پوچھا تو انھوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اب نام کی تبدیلی کا اعلان اخباروں میں شائع کرادیا۔

جیب میں دھیلا نہ دمڑی ادارۂ یادگارِ غالب قائم ہوگیا۔ ایک آدھ ہفتے بعد فیض کے بتائے ہوئے چند لوگوں کو ٹیلی فون کیا کہ فلاں اتوار کو صبح فیض کے گھر جمع ہوں ادارے کی بابت کچھ گفتگو ہوگی۔ وہ سب آئے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ فیض ادارے کے صدر ہوں۔ سبطے نے یا شائد فیض نے میرا نام لے کر کہا یہ اس کے معتمد عمومی ہوں۔ اس کے بعد مجلس عاملہ تشکیل دی گئی جتنے مدعوئین اتنے ہی عہدیدار اور اراکین بلکہ بعض جو نہیں آئے تھے انھیں بھی رکن عاملہ بنا لیا گیا۔ کوئی خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ جاتے وقت سبط حسن نے پھر کہا تم نے ہمیں رکن تو بنایا ہے مگر کام ہم دمڑی کا نہیں کریں گے۔ سبطے اپنے قول کا سچا نکلا۔

ترقی اردو بورڈ کے دفتر میں جب وہ ناظم آباد میں تھا تیس چالیس ادیب جمع کیے گئے جن سے فیض نے خطاب کیا اور میں نے بتایا کہ صد سالہ برسی پر کچھ کتابیں شائع کی جائیں گی شعر و سخن اور موسیقی کی محفلیں ہوں گی۔ اور غالب اور متعلقاتِ غالب پر کتابوں کی ایک نمائش، چائے پیتے ہوئے فیض نے مجھے طلب کیا اور کہا مسلم ضیائی صاحب کے پاس ایک کتاب تیار ہے اسے اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کر لیجیے غالب کا منسوخ دیوان۔ اس دن فیض خوش تھے۔ شاید محسوس کر رہے تھے کہ ادارے کی گاڑی چل پڑی ہے۔

ابھی تک فقط ہوائی باتیں ہو رہی تھیں کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ماہ دو ماہ بعد فیض کے توسط سے پیش کش آئی کہ ایک ادارہ ہمارے لیے فنڈ فراہم کرے گا اور سارا خرچ برداشت کرے گا۔ شرط یہ تھی کہ رسائل بھی وہی چھپوائے گا رقم بھی وہی جمع کرے گا حساب کتاب بھی اُسی کے پاس ہوگا۔ ہمیں جب اور جتنی رقم درکار ہو اس کی منظوری سے حاصل کریں اور خرچ کی اُسے رپورٹ دیں وغیرہ وغیرہ۔ بہ الفاظ دیگر جس نے روپے کی پیش کش کی تھی اُسے ادارۂ یادگار غالب کی آمدنی اور خرچ پر مکمل کنٹرول ہوگا اور ہماری مجلس عاملہ مالی امور میں عملاً بے بس اور پیش کش کرنے والے کے رحم و کرم پر ہوگی۔ پیش کش کے اس ستم کو محسوس کر کے میں نے فیض کو ایک خط لکھا (سب سے پہلا خط) اور تفصیل سے عملی دقتیں بتائیں کہ معتمد عمومی اور اس کے رفقا پیسے پیسے کو پیش کش کرنے والے کے محتاج ہوں گے۔ انھیں آمدنی کا کوئی علم نہ ہوگا اور ایک وقت آئے گا جب یہ ادارہ طفیلی بن کر رہ جائے گا۔ آخر میں لکھا مجھے ذاتی طور سے یہ پیش کش منظور نہیں ہے ہاں آپ بہ حیثیت صدر حکم دیں تو تعمیل کروں گا۔ فیض نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کے بعد پھر اس پیش کش کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا۔ اس طرح ادارۂ یادگار غالب کی اپنی انفرادیت اور حیثیت برقرار رہ گئی ورنہ وہ کب کا ضم یا ختم ہو چکا ہوتا۔

میں ابھی تک فیض کی پسند ناپسند سے قطعاً واقف نہیں ہوا تھا۔ ان کا مقام

جانتا تھا مزاج نہیں پہچانتا تھا۔ مگر اس واقعہ کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ اب میں پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اعتماد یہ نہیں کہ سیاں کوتوال ہیں کیونکہ کوتوالی انھیں آتی نہیں بلکہ یہ کہ میری تجویز فیض نے مسترد نہیں کی۔ میں نے جو بھی تھوڑا بہت کام کیا ہے اس کا پہلا سبب فیض کا مجھ پر اعتماد ہے۔

ادارے کے کاروبار میں کچھ میں گرمی آئی۔ تماشائے اہلِ کرم نام کی محفل میں غالب پنسل بیچی گئی۔ آدم جی سائنس کالج آڈیٹوریم پنسل خریدنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ خود فیض نے ایک پنسل پچاس روپے میں خریدی۔ پی ای سی ایچ اسکول میں رالف رسل نے غالب کیلنڈر کا افتتاح کیا عشائیہ دیا گیا جس میں کوئی سو مہمان بشمول گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان شریک ہوئے۔

صدسالہ برسی کے انتظامات شروع ہوئے۔ افتتاح کا دن قریب آیا۔ افتتاحی تقریب مشاعرے اور محفلِ موسیقی کے مدعوئین کی فہرست مرتب کرنی اور ان کے پتے لکھنے تھے۔ میرے دفتر میں سبطِ حسن، راغب مراد آبادی اور دو ایک دوسرے ادیب جمع ہونے والے تھے۔ سبطے نے شرط رکھی کہ صدرِ ادارہ کام کریں گے تو ہم بھی آئیں گے۔ اس وقت تک میرے گھر یا دفتر آنا بڑی بات تھی فیض از خود مجھے ٹیلی فون بھی نہیں کرتے تھے۔ سارے پیامات سبطے کے توسط سے ملتے تھے۔ بعد کے دنوں میں ان سے سبب پوچھا تو بتایا تم ملازم سرکار ہو میرا ٹیلی فون ٹیپ ہوتا ہے تمھیں کیوں مصیبت میں ڈالتا۔ دفتر سے فیض کو ٹیلی فون کیا تو آگئے۔ سب کی طرح انھوں نے بھی کچھ پتے لکھے اور شعرا اور مدعوئین کی فہرست مرتب کرنے میں رہبری کی۔

اسی زمانے میں غالب لائبریری کا غلغلہ مچا۔ عمارت کس طرح بنی، کس طرح ہاتھ سے نکل گئی ایک طویل عبرت آموز کہانی ہے جو میں نے لکھ لی ہے مگر مصلحتاً شائع نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں اتنا اشارہ کردوں کہ عمارت کو منہدم ہونے سے فیض نے بچایا۔ اگر ان کا نام اور شخصیت درمیان میں نہ ہوتی تو آج غالب لائبریری کی جگہ اس عمارت کا ملبہ ہوتا۔

میں اس مدّت میں صرف ادارے کے کام سے فیض کے گھر گیا اور ہمیشہ چند منٹ کے لیے۔ یہی سمجھتا رہا کہ ہم دونوں میں صرف غالبؔ کا رشتہ ناتہ ہے اور بس۔ ایلس فیض سے بھی دوری کی صاحب سلامت رہی اور وہ ہلو ہلو ہی میں ٹرخادیتی ہیں کبھی کھانے کے وقت پہنچا تو کھانے کی صلاح نہیں، آم کھاتے وقت گیا تو یہ نہیں کہ دو چار قاشیں ہماری طرف۔ غیر وقت پر چائے 'کافی کا کوئی اصرار نہیں۔ یہ رویّہ مجھے ناگوار نہیں گزرا کیونکہ ہمارے مشرقی تکلف اور بے تکلفی دونوں سے مجھے ہول آتا ہے

دسمبر ۱۹۷۰ء میں ایک دن فیض کے "سر یا۔ فیض اپنے کمرے میں تھے۔ ایلس دیوان خانے میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میں سگریٹ پیتا رہا۔ ایلس پڑھتی رہیں۔ فیض کے برآمد ہونے میں زیادہ دیر ہو گئی تو ایلس نے کتاب بند کی اور مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ پہلا موقع تھا طرفین کی گفتگو کا۔ میں نے پوچھا فیض پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں کیا آپ انھیں محفوظ کرتی ہیں؟ بولیں نہیں۔ میں نے کہا میں جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سبب پوچھا تو کہا اسے میں ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس پر ایلس نے کہا ایک لطیفہ سناتی ہوں۔

ایک دن میں نے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ فیض کو ان کی خواب گاہ میں یہ کہہ کر بند کر دیا کہ تم آج اپنی سوانح ریکارڈ کر دو۔ فیض ریکارڈ کرنے لگے اور میں وقفے وقفے سے کان لگا کر سن لیتی تھی کہ حضرت واقعی ریکارڈنگ کر رہے ہیں یا شاعری سے شغل فرما رہے ہیں۔ غریب نے ریکارڈنگ تو کی اور کوئی آدھے گھنٹے تک مگر ریکارڈر چالو کیے بغیر۔ اندازہ لگاؤ مجھے کتنی کوفت ہوئی ہو گی۔ میں نے جواب دیا خود انھیں کتنی تکلیف ہوئی ہو گی کہ اتنی محنت کی مگر اکارت گئی۔ اتنے میں فیض کپڑے بدل کر آئے اور ایلس نے کہا میں ابھی ظفر سے تمھاری ریکارڈنگ کی باتیں کر رہی تھی۔ لاہور سے تمھارے واپس آنے کے بعد ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ تمھیں دوبارہ کمرے میں بند کر دوں گی اور اس مرتبہ مائکروفون میں خود چالو کروں گی۔ ریکارڈنگ کے بعد ظفر سے کہوں گی کہ اس ٹیپ کو سن کر مسودہ تیار کریں۔ بعد میں تم اس پر نظر ثانی کر لینا۔ کیا خیال ہے تمھارا؟ فیض نے جواب دیا "ٹھیک"۔ یہ دوسرا موقع تھا جب مجھ میں اعتماد پیدا ہوا۔ اس دفعہ ایلس

کی وجہ سے۔

ساٹھویں سالگرہ آئی۔ ایلس نے دوسرے مہمانوں کے ساتھ مجھے اور حمیدہ کو بھی رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اُسی دن فیض کی خود نوشت کا قصہ چھیڑا۔ فیض نے کوئی حوصلہ شکنی نہیں کی مگر ایلس نے اتنی ہمت افزائی کی کہ اسیری کے خطوط کا مجموعہ (صلیبیں مرے دریچے میں) تیار ہوگیا جس کی تفصیل میں کتاب کے دیباچے میں لکھ چکا ہوں۔ وہاں ایک بات عمداً نہیں لکھی تھی جواب بیان کرتا ہوں۔ ایلس روز مجھ سے حساب لیتی تھیں کہ کتنے خطوط کا ترجمہ ہوا۔ بعض اوقات ترجمہ کرنے کی بجائے فیض کوئی قصہ چھیڑ دیتے یا میں خود کوئی تذکرہ شروع کر دیتا تو اس دن ترجمہ شدہ خطوط کی تعداد کم ہوجاتی مگر میں ایلس کو غلط تعداد بتاتا۔ ایک تو مجھے فیض کی گفتگو اور گپ شپ میں لطف آتا تھا دوسرے اس ہم نشینی کو میں ایک نعمت سمجھتا تھا۔ بھروسہ تھا کہ مقررہ وقت پر کتاب تیار ہوجائے گی۔ اور وہ ہوئی۔

اسی زمانے میں میری کتاب ذکر یار چلے بھی شائع ہو رہی تھی۔ مسودہ فیض کو دیا کہ اس کا دیباچہ لکھ دیں۔ مہلت دس دن دی۔ ایک ہفتے بعد ایلس سے فون پر کہا ذرا فیض کو دیباچے (کے لیے) یاد دلائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ مسودہ سرمئی رنگ کی فائل میں ہے۔ ایلس نے جواب دیا وہ تو روز پڑھتے ہیں اور ایک دن میں نے فیض سے پوچھا یہ کیا پڑھتے رہتے ہو تو مصنف کا نام بتائے بغیر جواب دیا" ایک دلچسپ کتاب ہے' مزے لے کر پڑھ رہا ہوں" ایلس کے یاد دلانے پر اور پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد فیض نے ایلس سے کہا اگر میں نے کبھی اپنی سوانح حیات لکھی تو چاہوں گا کہ ظفر کی طرح لکھوں۔ ایلس نے مجھے بتایا تو میں سمجھا حوصلہ افزائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ چار سو سوا چار سو صفحات پڑھ لینا ہر کسی کے لیے مشکل کام ہے۔ دیباچہ ملا تو اس کے ایک جملے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ فیض نے کتاب کی تعریف تو بہت کی مگر یہ بھی لکھ دیا کہ اس میں نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہے اور نہ سوائے مخدوم کے کسی اہم شخصیت کا تذکرہ۔ یہی وہی جملہ تھا جس سے میں اپنی کتاب کو متاع بے بہا سمجھنے لگا۔ مجھ میں

یہ احساس بھی جاگا کہ فیض نے مجھے صاحب طرز ادیب ہونے کی سند دی ہے۔

میری فیض اور ابن انشا کی کتابوں کی تعارفی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فیض نے کہا "آج کی تقریب کے منتظمین نے فرمائش یہ کی تھی کہ سبط حسن صاحب کے تعارف کے بعد ہم لوگ اپنے فن کے بارے میں اپنی زبان سے کچھ عرض کریں۔ اس میں میرے لیے دقت یہ ہے کہ میرے جو دوسرے دو ساتھی ہیں یعنی ابن انشا اور مرزا ظفر الحسن تو یہ دونوں زبان داں بلکہ زباں دراز لوگ ہیں۔۔۔۔۔" پہلے فیض اور ایلس کا اعتماد حاصل ہوا پھر دیباچے میں فیض نے مجھے "حرب نویس" سے یاد کیا اس کے بعد "زبان دراز" قرار دیا تو مجھے تکلف کے پردے اٹھتے نظر آئے۔ یہ ۲۰ اگست ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ اُسی دن کے روزنامہ حریت میں میرا مضمون "فیض اور ان کی ساتویں کتاب" شائع ہوا جس میں قلم کی شوخی اور اپنے حافظے کی مستعدی دکھائی اور بہت سی ایسی باتیں لکھیں جن سے نہ کوئی واقف اور نہ کسی کے واقف ہونے کا کوئی امکان تھا۔ فیض پر یہ میرا پہلا مضمون تھا جسے میں فیض کی جانب قرب کی ایک چھلانگ سے تعبیر کروں گا۔ فیض نے یہ مضمون پسند کیا۔ مجھ سے نہیں ایلس سے کہا۔

غالب لائبریری کی افتتاحی تقریب (یکم ستمبر ۱۹۷۱ء) میں میرا ذکر کرتے ہوئے فیض نے کہا "یہ جتنا کاروبار آپ کے سامنے ہے اس کے لیے اگر کسی ایک ذات کو ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کے لیے بھی اور خرابیوں کے لیے بھی۔ تو وہ مرزا ظفر الحسن ہیں"۔ خوبیوں کے ذکر سے میں سمجھا فیض نے مجھے اپنی انگلی دی ہے۔ خرابیوں کے تذکرے سے مجھے یقین ہو گیا کہ میں بہت جلد ان کا پہنچا پکڑ لوں گا۔ ایک صاف دل آدمی ہی دونوں کا ذکر کر سکتا ہے اور مجھے ایسے ہی لوگ پسند ہیں۔

۷۱ء کی جنگ شروع ہوئی۔ دن میں تین چار بار فون کر کے فیض اور ایلس سے پوچھ لیتا کہ کوئی ضرورت تو نہیں، کچھ کام ہو تو بتائیں۔ صبح شام ایک چکر بھی لگا لیتا جس میں ایلس مجھے بتاتیں کہ کس قسم کی دھمکیوں کے ٹیلی فون آ رہے ہیں۔ دو تین جلسوں میں فیض تقریریں کرنے گئے تو زبردستی ان کے ساتھ ہو لیا۔ شاید ان "خطرناک" دنوں میں

اگر فیضؔ نہیں تو ایلس فیضؔ کو پتا چل گیا کہ کون لاتعلق ہے اور کون فیضؔ اور ایلس سے متعلق۔ جنوری ۷۷ء میں مجھے ہارٹ اٹیک ہوا۔ اطلاع ملتے ہی ایلس مزاج پرسی کو پہنچیں اور ہسپتال میں قیام کے زمانے میں کئی بار آئیں۔ فیضؔ اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ لوٹتے ہی مجھے دیکھنے آئے۔ بعد میں بھی تین چار مرتبہ آئے۔ کبھی اکیلے کبھی ایلس کے ساتھ۔ ان دنوں انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو ویسکیولر میں لفٹ نہیں تھا دونوں اگر ہانپتے کانپتے نہیں تو تھم تھم کر سیڑھیاں چڑھتے آئے ہوں گے۔ فیضؔ چند منٹ بیٹھتے اور چلے جاتے۔ بس ایک مرتبہ بات کی "سچ مچ ہارٹ اٹیک ہوا ہے یا کوئی ڈھونگ رچایا ہے" مجھے سگریٹ پینے کی ممانعت تھی۔ فیضؔ دیر تک بیٹھتے تو سگریٹ کس طرح پیتے ؟ سگریٹ نہ پیتے تو بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ؟ اس لیے چند منٹ کے بعد چلے جاتے۔ مجھے عیادت کرنے والوں میں سب سے زیادہ فیضؔ پسند تھے جنھوں نے بیماری، اس کے اسباب احتیاطی تدابیر، ادویات، انجکشن قارورے قبض وغیرہ کی کوئی بات نہیں کی۔ فیضؔ کو مزاج پرسی نہیں آتی۔ نہ بیماری کا چارٹ دیکھا، نہ پرہیز کی تفصیل پوچھ کر بتایا کہ حکیم کا علاج ہوتا تو وہ کیا پرہیز بتاتے اور دوائیں دیتے۔ تین ہفتوں کے بعد مجھے پلنگ سے اتر کر کھڑے ہونے اور قدم دو قدم چلنے کی اجازت ملی۔ اتفاق کہ جس وقت میں کھڑا ہوا عین اسی وقت ایلس میرے وارڈ میں داخل ہوئیں۔ مجھے کھڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، پیار کیا اور سمجھ گئیں دل بہل گیا، جاں سنبھل گئی، موت ٹل گئی۔

فیضؔ کراچی کو خیرباد کہہ کر اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ پھر ایلس بھی چلی گئیں۔ جانے سے پہلے مجھے خدا حافظ کہنے آئیں۔ کوئی گھنٹہ بھر ٹھہریں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور کہا اب تم ٹھیک ہو گئے ہو۔ ذرا اور ٹھیک ہو کر فیضؔ کی سوانح عمری لکھ ڈالو۔ جاتے وقت حمیدہ سے کہا میرے لوائے فرینڈ کا خیال رکھنا۔

مرزا ظفر الحسن

مجروح، فیض اور میں

میں مئی ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتے میں بمبئی میں تھا اور اردو کے ممتاز طنز نگار یوسف ناظم کے ہاں مقیم، جنھوں نے بمبئی کے بہت سے ادیبوں، شاعروں اور سرکردہ شخصیتوں کو مجھ سے ملانے کے لیے ایک محفل سجائی تھی۔ بڑی خوبصورت محفل۔ مجروح سلطان پوری کو مدعو کیا تو انھوں نے دعوت تو قبول کر لی مگر یوسف کو متنبہ کر دیا کہ محفل میں مرزا ظفر الحسن سے دو دو ہاتھ ضرور ہوں گے۔ یوسف نے بہت منع کیا اور کہا کہ محفل کو بے مزہ نہ کریں۔ ظفر صاحب پاکستان سے آئے ہوئے میرے ہی نہیں تمام ادیبوں کے محترم مہمان ہیں مگر مجروح کو شاعری کے ذریعے شہرت اور فلم کے ذریعے دولت جو ملی ہوئی تھی۔ بعض ہندوستانی حلقوں میں یہ مسئلہ متنازع ہے کہ مجروح کسی "لفٹ" کے ذریعے موجودہ مقامِ شہرت تک پہنچے ہیں یا فلمی "اسکیلیٹر" نے انھیں اتنی اونچائی تک پہنچایا ہے۔ کیونکہ فلمی دنیا میں جتنے وہ نیک نام ہیں اس سے زیادہ ادبی حلقوں میں اپنی تنک مزاجی کی وجہ سے بدنام ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، چاہے وہ راس کماری ہو کہ ایورسٹ کی چوٹی، لڑ کر ہی لوٹتے ہیں۔

بات شہرت سے زیادہ شائستگی کی ہے اس لیے گریز اور قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی ایک کتاب عصمت چغتائی کو بھیجی۔ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود موصوفہ نے رسید بھیجی اور شکریہ ادا کیا۔ کیفی اعظمی کراچی آئے۔ اُن کے اعزاز میں ایک جلسہ غالب لائبریری میں کیا گیا۔ حاضرین نے اُن سے فرمائش کی کہ پہلے وہ ایک تقریر کریں اور اس کے بعد اپنا کلام سنائیں۔ کیفی نے جواب میں کہا کہ جب میں حیدر آباد دکن جاتا اور شہ نشین پر مرزا ظفر الحسن صاحب جیسے مقرر کو دیکھتا تھا تو تقریر نہیں کر پاتا تھا۔ اِس وقت تو وہ بالکل برابر والی کرسی پر تشریف فرما ہیں اس لیے میں اِن کی موجودگی میں کس طرح تقریر کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے صرف شعر سنیئے۔ اسی طرح پروفیسر آلِ احمد سرور کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا گیا۔ میں نے غالب لائبریری کے دروازے پر اُن کا استقبال کیا تو بڑے پیار سے مجھے گلے لگاتے ہوئے فرمایا "ارے بھئی جب سے کراچی آیا ہوں فرش تا عرش مسلسل آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔"

میں نے یہ مثالیں کوئی اپنی بڑائی جتانے کے لیے نہیں دی ہیں۔ میں تو ایک معمولی ادیب ہوں۔ صرف

یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، آلِ احمد سرور اور دوسرے کئی ادیب اور شاعر دنیائے ادب میں محترم، مقبول اور معروف ہی نہیں نہایت شائستہ، شرافت شناس اور انسانیت کے دلدادہ ہیں۔

میں نے یوسف ناظم کی متذکرہ دعوت میں راجندر سنگھ بیدی سے درخواست کی کہ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے تاثرات اور واقعات ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کرا دیں۔ بیدی نے ازراہِ محبت نہ صرف وعدہ کیا بلکہ دوسرے دن پہنچ بھی گئے۔ اتفاق کہ اس وقت میرا ریکارڈر خراب ہو گیا اور میں ریکارڈنگ نہ کر سکا۔ اختر الایمان سے ایسی ہی استدعا کی تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنے فلم یونٹ کے ساتھ بمبئی سے باہر جا رہے ہیں۔ وقت پر واپس آ گئے تو ضرور ریکارڈنگ کرا دیں گے۔

مجروح سلطان پوری کافی دیر سے بالکل خاموش اور الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ جب میں نے یہی درخواست ان سے کی تو ایک دم بپھر گئے کیونکہ میری تازہ تخلیق "عمرِ گزشتہ کی کتاب" کے وہ دو حصے انھیں ناگوار گزرے تھے جن کا تعلق ان سے تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر مجھے مجروح سے کوئی کد ہوتی یا میرے دل میں کوئی چور ہوتا تو ڈاک کے خرچ کے علاوہ پچیس روپے کی مالیت کی یہ کتاب میں انھیں بمبئی کیوں بھیجتا؟ مجروح کو مجھ سے حسبِ ذیل شکایتیں تھیں جو انھوں نے یوسف ناظم کی بھری محفل میں کیں، ان کی زبان درشت اور لہجہ تلخ تھا۔

(۱) میں فیض پر اتنا زیادہ کیوں لکھتا ہوں؟

(۲) یا تو فیض نے مجھے اپنا بھونپو بنا لیا ہے یا میں از خود بن گیا ہوں۔ فیض کو اپنے پروپیگنڈے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

اتنے اچھے ادیبوں کی ایسی حسین محفل کو بدمزگی سے بچانے کی واحد صورت یہ تھی کہ ان اعتراضات کا جواب ہی نہ دیا جائے۔ یا پھر دیا جائے تو مجروح کی سطح پر اُتر کر۔

دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر خواجہ عبدالغفور نے سوائے مجروح کے ان سب ادیبوں کو مدعو کیا۔ یہ محفل بھی بہت اچھی رہی البتہ سلمیٰ صدیقی اور خدیجہ جاں نثار اختر نے ظ انصاری کی جان عذاب میں کر دی اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی کہ مجروح کی تلخ کلامی کے سلسلے میں ظ انصاری نے ہونٹ کیوں سی لیے؟ ان کے منھ سے کچھ پھوٹا کیوں نہیں۔ مانا کہ مجروح ان کے سمدھی ہیں مگر ان سے یہ تو پوچھا جا سکتا تھا کہ پاکستان سے آئے ہوئے ایک محترم مہمان سے تلخ گفتگو کے لیے ان کے میزبان یوسف ناظم کے مکان کو کیوں تاکا گیا۔ اگر مرزا ظفر الحسن سے کوئی ادبی شکایت ہے تو ان کے خلاف مضمون لکھیں، تنقید چھاپیں، نظم کہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ محفل درہم برہم کر دی۔ ظ انصاری کو مخاطب کر کے کہا آپ کے گھر مجروح صاحب کی بیٹی آئی ہے۔ آپ بیٹے کے باپ ہیں، ڈرتے کس بات سے ہیں؟

اب وہ بیان ملاحظہ فرمایئے جو میں نے مجروح کی تلخ کلامی کے جواب میں کراچی سے بھیجا اور بلٹز (اردو

بمبئی) میں چھپا۔ بلٹز کی ہفتہ وار اشاعت پینسٹھ ہزار ہے (۱۹۷۸ء) میں معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے اس بیان میں نہ تو مجروح کا نام لیا اور نہ اپنی کتاب کے صفحات کے نمبر دیے۔ ان اقتباسات ہی سے مجروح برافروختہ ہوئے۔ اگر میں صفحات کے نمبر دے دیتا تو ناظرین کو معلوم ہو جاتا کہ بات مجروح کی ہے۔ یوسف ناظم کی دعوت میں جہاں یہ ہنگامہ ہوا، بلٹز کے ایڈیٹر حسن کمال موجود تھے۔ انھوں نے بھی مجھے کھانے پر مدعو کیا اور کہا تھا کہ آپ اس سلسلے میں جو بھی لکھیں گے میں بلٹز میں چھاپوں گا۔ "فن اور شخصیت" کے ایڈیٹر صابر دت بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ فن اور شخصیت" کے غزل نمبر اور جاں نثار اختر نمبر پر مجروح نے فساد کیا تھا۔ بلٹز کے ۱۷ر جون ۱۹۷۸ء کے شمارے میں میرا جو بیان شائع ہوا وہ ہے:

"ہندوستان میں ساڑھے تین ماہ قیام کرکے پاکستان لوٹنے سے ایک ہفتہ قبل بمبئی میں ٹھہرا جہاں دو تین محفلوں میں شہر کے محترم ادیبوں کا ہم نشین ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ ان سے علمی و ادبی موضوعات پر اور بالخصوص غالب لائبریری کی بابت تفصیلی گفتگو ہوئی جس میں ان سے میں نے عرض کیا کہ غالب لائبریری ہندوستان کے علمی و ادبی اداروں اور ادیبوں سے ہر ممکن علمی و ادبی اشتراک کرے گی۔

میں اپنے ساتھ ان تمام ممتاز و معروف ادب دوستوں کی حسین و خوش گوار یادیں پاکستان لایا ہوں۔ ان یادوں کو اپنے سفرِ ہند کا سب سے عزیز تحفہ سمجھتا ہوں۔ خلوص، پیار اور مہمان نوازی کے لیے ان سب کا احسان مند ہوں۔

میری تازہ تحقیق "عمرِ گزشتہ کی کتاب" (فیض اور مخدوم کی زندگی اور تخلیقات) کے دو نسبتاً کم اہم اور چند سطری حصوں کی بابت غزل کے ایک شاعر نے ایک محفل میں سخت برہمی کا اظہار کیا کیونکہ وہ حصے فیض کے علاوہ ان شاعر سے بھی متعلق تھے۔

ہر تحریر یا اس کے کسی حصے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اختلاف کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ زبانی یا تحریری اختلاف ادب اور اخلاق کے دائرے میں رہ کر کیا جائے۔ اختلاف میں دلائل دیے گئے ہوں، اس سے کسی غلطی کی اصلاح یا نشان دہی ہو یا اس کی وجہ سے ادب میں کوئی خاطر خواہ یا قابلِ قدر اضافہ ہو۔ میں نے شاعرِ موصوف کو نہایت دھیمے لہجے اور شائستہ زبان میں سمجھانے کی کوشش کی کہ میری کتاب کا (شاعر کے نقطۂ نگاہ سے متنازع) حصہ خود ان کی اپنی تحریر کا اقتباس ہے اور دوسرا حصہ ایک نقاد کی (مطبوعہ) رائے ہے۔ دونوں مطبوعہ صورت میں میرے پاس بطور ثبوت موجود ہیں اور خود شاعر کی نظر سے بھی گزرے ہوں گے مگر شاعر موصوف پہلے سے طے کرکے محفل میں تشریف لائے تھے کہ کوئی ہنگامہ ضرور کریں گے، سو انھوں نے اپنی دانست میں ایک تماشا کیا۔

گزشتہ چالیس پینتالیس سال سے میں بھی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہوں۔ جتنے جلسوں میں مجروح شریک ہو چکے ہیں اس سے زیادہ تو میں منعقد کر چکا ہوں۔ مجھے محفل سجانے کا سلیقہ آتا ہے اور ایسی ویسی

نہیں گئی گئی ہزار کی ادبی محفلیں جن کا اعتراف فیض احمد فیض تک کر چکے ہیں محفل کو درہم برہم کرنے والوں کے ہتھکنڈوں سے بھی خوب واقف ہوں۔ محض اس خیال سے کہ ممتاز ادیبوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کے لیے زیادہ وقت ملے اور حاضرینِ محفل بے مزہ نہ ہوں میں نے رسماً اور اخلاقاً شاعر صاحب سے معذرت چاہی (حالانکہ معذرت کی کوئی ضرورت نہ تھی) اس معذرت کو غالباً موصوف میری کمزوری سمجھے اور تنک کر نہایت ترش لہجے میں فرمایا "میں زبانی معذرت قبول نہیں کرتا" اللہ اللہ ذرا اس شاعر کی حیثیت ملاحظہ فرمایئے اور پھر اس غرور پر غور فرمایئے کہ زبانی معذرت قبول نہیں کرتے۔ اس جملے پر ایک ادیب نے چپکے سے کہا۔ "یہ شاعر نہیں فلم کا نشہ بول رہا ہے۔" میں نے تلخی کم کرنے کی خاطر دوبارہ انکسار کے ساتھ (انکسار کا بھی کوئی جواز نہ تھا) عرض کیا۔ "آپ معذرت نامہ لکھوا دیں میں اُس پر دستخط کر دوں گا" موصوف یہ سمجھے میں نے مکمل بے بسی کے عالم میں سارے ہتھیار اُن کے آگے ڈال دیے ہیں۔ ایک ایسا جملہ ترش و تلخ لہجے میں کہا جس سے نہ صرف میری بلکہ فیض احمد فیض کی بھی توہین ہوئی۔

اپنی نام نہاد توقیر کی خاطر فیض کی تحقیر کوئی بے علم اور غیر معروف آدمی کرتا تو بات سمجھ میں آجاتی کہ اُسے فیض کے اعلیٰ مقام کا علم نہیں مگر ایک مشہور اور مقبول شاعر کی زبان سے غیر ادبی بلکہ بے ادبی اور فیض جیسی شخصیت کے لیے توہین آمیز الفاظ سُن کر سارے حاضرینِ محفل حیران رہ گئے۔ ابھی تک اُن پر اس کا انکشاف نہیں ہوا تھا کہ مجروح خود کو فیض سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم خود کو فیض سے بہتر اور بڑا غزل گو تو ضرور ہی سمجھتے ہیں۔ شاعرِ موصوف نے اِسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے ملنے والوں سے بعد کے دو تین دنوں میں اس واقعہ کا اظہار کچھ اِس انداز میں کیا جیسے وہ نپولین ہیں اور اِس محفل میں انھوں نے واٹرلو کی جنگ جیتی ہے۔ کئی ایک اصحاب نے مجھ سے تفصیل دریافت کی تو جو جواب میں نے انھیں دیا، دیگر ادیبوں اور اصحاب کے علم میں لانے کے لیے یہاں رقم کر رہا ہوں تاکہ شاعرِ موصوف فلمی دولت اور شعری شہرت سے مزید بدمست نہ ہوں اور یہ کہ شاعرِ موصوف میری معذرت کی پیشکش اور اس کے بعد کی چند روزہ خموشی کو میری کمزوری پر محمول نہ کریں۔ میں ہمیشہ ادب کے ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرتا ہوں۔ البتہ یاوہ گوئی، افترا پردازی اور شر کے خلاف میرا قلم زہر کی روشنائی سے لکھنا اور میری زبان لاوا اُگلنا بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ اس میں مُلک اور شہر کی کوئی قید نہیں۔ اگر میں اپنے ویزا کی توسیع، ہوائی جہاز کی بکنگ اور اگزٹ پرمٹ کے جھمیلوں میں نہ پڑا ہوتا تو یہ بیان بمبئی میں ہی لکھ کر اخبار کو دے آتا۔

میں نے اپنی (زیرِ بحث) کتاب کے متعلقہ صفحات کے نمبر عمداً نہیں لکھے کیونکہ میں اس ناخوشگوار واقعہ کو طول دینا نہیں چاہتا۔ اگر شاعرِ موصوف یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے غلط بیانی کی ہے اور اگر انھیں میری نیت پر شبہ ہے تو میں اُنھیں دعوتِ تحریر دیتا ہوں کہ جس اخبار میں چاہیں اصل

صورتِ حال بطور جواب شائع کریں اور اس کا تراشہ مجھے ارسال کریں تاکہ میں مزید کچھ عرض کرسکوں۔

میں آخر میں پھر ایک بار بمبئی کے ادیبوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اپنے ساتھ ان کی محبت سے معطر یادیں لایا ہوں اور متذکرہ واقعہ کا اثر بمبئی ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

مندرجہ بالا بیان میں شاعر کا نام میں نے "عمداً" ظاہر نہیں کیا تھا مگر اب آپ کو ان کا اسمِ گرامی معلوم ہوگیا ہے۔ فلمی دُنیا کے نامی گرامی "گیت نگار" ہیں جیسا کہ ریڈیو والے کہتے ہیں۔ بیان کے بعد اب "عمرِ گزشتہ کی کتاب" کے وہ اقتباسات نقل کرتا ہوں جن کے سرسری حوالے متذکرہ بالا بیان میں دیے تھے اور جن پر مجروح نے اتنی واویلا مچائی اور محفل میں ہنگامہ کیا تھا۔ وہ عنوانات بھی درج کررہا ہوں جن کے تحت یہ اقتباسات کتاب میں شائع کیے گئے ہیں۔

تقابل، تاثر، تجزیہ

مجروح اور فیض

نظریاتی شاعری کے بیان میں ظہیر صدیقی کو مجروح سلطان پوری سے شکایت ہے کہ "شان دار" غزلیں کہنے والے اس شاعر نے "لال پھریرا اس دُنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا" والی غزل کہہ کر غزل کی "دُرگت" بنادی اور اسی باعث رشید احمد صدیقی کو بھی مجروح سے شکایت پیدا ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں ظہیر صدیقی لکھتے ہیں "واہ رے فیض کی ثابت قدمی.... غزل تو غزل اپنی نظموں میں بھی اُنھوں نے اس بے راہ روی کو جگہ نہیں دی۔" (ص ۳۶۵)

"فیض دُوسروں کی نظر میں"

"کچھ اور اصحاب کی طرح مجروح سلطان پوری کو بھی شکایت ہے کہ سماجی اور سیاسی موضوعات پر فیض کھُل کر شعر نہیں کہتے۔ مجروح پوچھتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جب اُن کی آواز کو "حرفِ حق" کی طرح بلند ہونا چاہیے تو ان کی صدا "پیامِ زیرِ لب" بن کر رہ جاتی ہے اور غوغائے فتنہ و شرمیں لوگ فیض کے لب تو ہلتے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ بات کچھ دھیمے لہجے میں ہوتی ہے کہ آواز سُنائی نہیں دیتی، جبکہ اُن کی راہ نما آج بھی یہی آواز ہوسکتی ہے۔" اس شکایت کا جواب فیض یہ دیتے ہیں کہ "ہم سے سیاسی شاعری نہیں ہوتی۔" (ص ۴۱۴)۔

بلٹز میں میرا خط شائع ہونے کے بعد ہندوستان کے کئی معروف اور کم معروف ادیبوں اور بعض جِینی اصحاب نے مجھے خط لکھے اور پوچھا کہ شاعر کا نام کیا ہے اور آپ نے ظاہر کیوں نہیں کیا۔ چند ایسے بھی تھے جنھوں نے لکھا کہ یہ سوائے مجروح سلطان پوری کے کوئی اور نہیں ہوسکتا کیونکہ اس قسم کا دنگا فساد صرف اُن کی گھُٹّی میں پڑا ہے جس مشاعرے، جلسے یا تقریب میں جاتے ہیں، لڑ کر لوٹتے ہیں۔

مَیں نے ہر ایک کو یہی جواب دیا کہ اگر میرا ارادہ پانی پت کی مسلسل جنگوں کا ہوتا تو ان کا نام ابتدا ہی میں ظاہر کر دیتا۔ مَیں تو انھیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ہندوستان کے چند محدود حلقوں میں مختلف مصلحتوں کی بنا پر اُن کی جتنی اور جیسی پذیرائی ہوتی ہے اس سے انھیں مزید مغرور اور بدکلام نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہیں مگر اتنے اچھے بھی نہیں کہ جوش، فراق اور فیض کی صف میں گھسنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسے ہوتے تو اُن پر بھی اتنا اور اسی طرح لکھا جاتا جتنا ان تینوں پر لکھا گیا یا انھیں بھی اتنا ہی چاہا جاتا۔

ادیب اور شاعر کی ہر تخلیق نہ صرف اس کی فکر کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اُس کے کردار کی جھلک بھی کسی نہ کسی طور پر پیش کرتی ہے۔ تاریخِ ادبِ اُردو ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ سطورِ ذیل میں مجروح سلطان پوری کے اُس انٹرویو کے اقوالِ زریں نقل کروں گا جو موصوف نے پاکستان کے ایک صاحب کو دیا اور انھوں نے کراچی کے روزنامہ حُرّیت کے ادبی ایڈیشن (یکم اگست ۱۹۷۰ء) میں شائع کرایا۔ واوین کے حصے فرمودات مجروح ہیں۔ یہ اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ مجروح کے ذہنی نشو و نما اور فکری بلوغ و بلاغت کو سمجھنے میں آسانی ہو اور اُن کی اَنا کی وجہ معلوم ہو سکے۔

(۱) "مَیں یہ بھی عرض کر دوں کہ میرا ترنم اوریجنل تھا۔ مَیں نے کبھی کسی کے ترنم کی نقل نہیں کی۔"

(۲) "دوسرا مشاعرہ ۱۹۴۵ء میں بمبئی کا تھا۔ تخشب کے فوراً بعد میرا نام پکارا گیا ... سامعین میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، بیدی اور فلم ایکٹریس ببّو سامنے ہی بیٹھے تھے۔ مَیں جب غزل پڑھنے کے لیے آیا تو ان سب لوگوں نے شور شروع کر دیا کہ نہیں سُنیں گے۔ اس میں کرشن چندر پیش پیش تھے .... مَیں نے تین شعر پڑھے بہت داد ملی .... واپس آنا چاہتا تھا کہ لوگوں نے اصرار کیا کہ پوری غزل پڑھوں۔ مَیں نے پوری غزل پڑھی۔ مشاعرے کے بعد کرشن چندر میرے پاس آئے اور اپنے رویہ پر مجھ سے معذرت کی۔" (کرشن چندر کے انتقال سے فائدہ اٹھا کر مجروح صاحب چاہیں تو لاکھ معافیاں کرشن سے منسوب کر سکتے ہیں مگر انھیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ۱۹۴۵ء تک کرشن چندر نے دُنیائے ادب میں کتنا اونچا مقام حاصل کر لیا تھا اور اُس وقت مجروح کی حیثیت ہی کیا تھی۔ معذرت کی یہ بات اُنھوں نے کرشن چندر کی زندگی میں کیوں نہیں لکھی۔ م ظ ح)۔

(۳) "۱۹۴۶ء میں ترقی پسندوں میں غزل دشمنی پورے شباب پر تھی۔ مَیں نے سب سے پہلے ترقی پسند گروپ میں غزل کو ایک قابلِ قبول جنس کی حیثیت سے پیش کیا۔"

(۴) "یہ کریڈٹ مجھے ملتا ہے کہ مَیں نے غزل کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ مَیں نے غزل کو ایک نئی وضع کے ساتھ پیش کیا اور لوگوں نے اِسے تسلیم کیا۔"

(۵) "میرے یہاں زبان اور فن کی وہ غلطیاں نہیں ملتیں جن سے آج کل بعض بہت بڑے

شعرا کا کلام بھی مبرّا نہیں ۔"

(۶) آج کل کے فلمی گانوں کے سلسلے میں مجروح نے کہا " یہ ایسا ہی ہے جیسے میں آپ سے کہوں کہ تین منٹ تک آپ ایسی اُردو بولیے جو گرامر سے بالکل خارج ہو۔ بس تو سمجھ لیجیے کہ ہمیں مستقلاً یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے (انھوں نے ہنستے ہوئے کہا) میں اِس فاؤل کھیل کا کھلاڑی مانا جاتا ہوں ۔"

(۷) "میں فلموں میں رہ کر بھی فلمی آدمی نہ بن سکا۔ اس کا نقصان مجھے یہ ہوا کہ مجھ سے کمتر لوگ مجھ سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں ۔"

(۸) "فیض صاحب بہت بڑے شاعر ہیں۔ تسلیم۔ مگر میرے یہاں بھی کم نہیں ۔"

مندرجہ بالا آٹھ نکات بیان کر کے شاعرِ موصوف نے اپنا فکری اور ذہنی پورٹریٹ پیش کیا ہے۔ اس سے ان کے علم، علمی اخلاق، ادبی تہذیب، زبان اور زندگی کی بابت ان کے رویّے کا صاف پتا چلتا ہے اور یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ ہر وقت ان کے ہاتھ میں شمشیرِ برہنہ کیوں رہتی ہے۔ وہ کسی نعمت سے محروم ہیں یا خواہ مخواہ خود کو محروم سمجھتے ہیں جس نے ان میں احساسِ کم تری پیدا کر دیا ہے۔

اس قضیے سے روزنامہ "حریت" کراچی کی دو تحریروں کا بھی تعلق ہے۔ پہلی تحریر ایک اِنٹرویو ہے جس کا ابھی ابھی حوالہ دے چکا ہوں۔ دُوسری تحریر افق اجمیری کے نام سے روزنامہ "حریت" میں شائع ہوئی (۲۹ دسمبر ۱۹۷۸ء) اور دونوں مجھے افق اجمیری کی مہربانی سے ملیں جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

جب مبیّنہ انٹرویو روزنامہ "حریت" میں شائع ہوا تو افق نے جو مجروح کے دوست ہیں انھیں صورتِ حال کی وضاحت کے لیے ایک خط لکھا۔ افق نے اپنے تاثرات کے ساتھ وہ جواب شائع کر دیا۔ افق کا تجزیہ میرا موضوع نہیں ہے اس لیے نہ ان سے بحث کروں گا نہ ان کی شکایت۔ ممکن ہے کہیں ان کی دو ایک باتوں کا ذکر کر دوں۔ ویسے بھی وہ کسی نقّاد کی نہیں ایک صحافی دوست کی تحریر ہے جو اخبار کے لیے قلم بند کی گئی ہے۔

مجروح کا خط

۳۰؍اگست ۱۹۷۸ء۔ بمبئی

عزیزم افق صاحب

جس جذبۂ بے اختیار کے ساتھ آپ نے مجھے یاد کیا ہے اس کے لیے ابھی الفاظ نہیں مل سکے ہیں۔ جس مضمون کے بارے میں آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے وہ کوئی مفصّل و معتبر چیز نہیں ہے بلکہ چار سطر

کا اس طرح کا موازنہ ہے ۔ مجروح اور فیض کی نظریاتی شاعری کے بیان میں ظہیر صدیقی کو مجروح سلطانپوری سے شکایت ہے کہ شان دار غزلیں کہنے والے اس شاعر نے "لال پھریرا اس دُنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا" والی غزل (مزدوروں کے لیے ایک گیت یا غزل؟ مجروح) میں غزل کی دُرگت بنا دی اور اسی باعث رشید احمد صدیقی کو بھی مجروح سے شکایت ہو گئی ۔ اس کے مقابلے میں کہتے ہیں واہ رے فیض کی ثابت قدمی کہ غزل تو غزل انھوں نے نظموں میں بھی ایسی بے راہ روی کو جگہ نہیں دی ۔ تو یہ ہے جناب وہ معرکہ آرا موازنہ جو ظفر الحسن صاحب (بوسیلہ ماہنامہ غالب) کی "عمرِ گزشتہ کی کتاب" میں صفحہ ۳۶۵ پر آپ کو مل جائے گا ۔ (جملہ معترضہ کے طور پر کہتا چلوں کہ درحقیقت رشید صاحب مرحوم کی رائے میرے بارے میں کیا تھی ۔ اُنھی کے خط میں اعجاز میاں کو دکھا چکا ہوں (اگر میری یادداشت غلط نہیں ہے) ۔ غرض کہ قصہ یوں شروع ہوا کہ "عمرِ گزشتہ کی کتاب" کی ترتیب و تالیف کے دوران میں ظفر الحسن صاحب نے مجھ سے فیض اور مخدوم کے بارے میں مضامین مانگے تھے ۔ چنانچہ میں نے انھیں دو خطوط کی صورت میں بھیج دیے تھے ۔ آں قبلہ نے وہ خطوط تو شائع نہیں کیے البتہ کئی کئی صفحات کے بعد کہیں کہیں پر ایک آدھ جملہ اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے اس طرح استعمال کیا ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ میں فیض کا مخالف ہوں ۔ اس پر میرا برہم ہونا غلط نہیں تھا ۔ چنانچہ اُسی مئی جون میں جب ظفر صاحب اپنی زاد بوم حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے تو واپسی میں بمبئی والوں کو بھی ملاقات کا موقع دیا تھا ۔ میں نے ایک محفل میں شکایتاً مگر ذرا سخت لہجے میں اُن سے پوچھا تھا کہ جناب آپ نے کب کی دُشمنی نکالی ہے ؟ آخر آپ کو فیض اور مجروح کے اس عزت افزا موازنے کی ایسی کون سی ضرورت پیش آ گئی تھی جبکہ میں نے ہمیشہ فیض صاحب کو اپنا پیشرو اور بزرگ مانا ہے اور پھر موازنہ کرنا ہی تھا تو ذرا علمی اور تحقیقی رویّہ اپنایا ہوتا ۔ فرمایا "نقاد" کی رائے ہے ، میں کیا کر سکتا ہوں ۔ اس پر میں نے کہا ۔ اگر آپ کے نقاد صاحب ایک مخصوص قسم کی وقتی بات کو میرا معیارِ کلام بنا کر اس پر لے دے کر سکتے تھے تو انھیں اردو زبان تو آتی ہی ہو گی ۔ فیض صاحب کے بارے میں بھی کم از کم اتنا ہی لکھ دیتے کہ فیض جس رُتبے کے شاعر ہیں اس لحاظ سے اُن کے وہاں زبان کی غلطیاں زیادہ ہیں اور مصرع کی تجسیم میں بھی کہیں کہیں وہ پختہ کاری نہیں ہوتی جس کا مطالبہ بجا طور پر ان سے کیا جا سکتا ہے ۔

پھر اس کے بعد واہ رے فیض کہہ کر اگر یہ لکھتے کہ انھوں نے اس دَور میں اُردو شاعری کو ایک نئی طرزِ فغاں دی ہے تو موازنہ وزن سے خارج نہ ہوتا اور دُوسروں سے پہلے میں انھیں پسند کرتا ۔ مگر ظفر الحسن صاحب نے تو پاکستان سے ہندوستانی اخبار بلٹز کے نام ایک خط میں میرے اس دُرست مطالبے کو فیض کی توہین قرار دیا ہے اور مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں فیض کے مقام سے بے خبر ہوں اور اس پردے میں اپنے آپ کو فیض سے بڑھنے کی ناکام کوشش کی ہے ۔ ع

تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

البتہ فیض صاحب انھیں دنوں جب ایک دن کے لیے بمبئی آئے تھے تو میں نے اُن سے اتنا ضرور کہا تھا کہ فیض صاحب آپ کا جو مقام ہے اس کے دیکھتے ہوئے آپ کو "عمر گزشتہ کی کتاب" جیسے بھونپو کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کہ میرا یہ طرزِ کلام ایک رفیقانہ شوخی سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ لیکن جب میں نے یہی بھونپو کا لفظ ظفر الحسن صاحب کی شان میں استعمال کیا تو اس کی سختی کے اعتراف کے باوجود مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ کم لوگ ہوں گے جو اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھ سے متفق نہ ہوں گے۔"

مجھے نہ غم ہے نہ غصّہ کہ مجروح سلطان پوری نے کسی محفل، انٹرویو یا خط میں میری بابت کیا کہا کیا لکھا اور اپنی مبینہ "رفیقانہ شوخی" میں فیض سے میرے متعلق اور "عمر گزشتہ کی کتاب جیسے بھونپو" کے تعلق سے کیا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں نہ جانے کتنے مجروح سلطان پوریوں نے ان سے میرے خلاف باتیں کیں اور فیض نے سگریٹ کا ایک کش چھوڑ کر بادِ مخالف کا رُخ بدل دیا۔ کاش مجروح اپنے خط میں یہ بھی لکھ دیتے کہ ان کی رفیقانہ شوخی کے جواب میں فیض نے کیا کہا۔ رہی کتاب کی بات، تو شاعر نہیں نثر نگار ہی جانتا ہے کہ "عمر گزشتہ کی کتاب" کا مواد فیض اور مخدوم کے اگلے محققین اور سوانح نگاروں کے لیے کتنا قیمتی سرمایہ ہے۔ مجروح صاحب نے آج تک کون سا علمی اور تحقیقی کام کیا ہے جو میرے یا کسی اور کے کام کی قدر و قیمت جان سکیں۔

(الف) جہاں تک محترم نقاد ظہیر صدیقی کی تنقید اور اس پر مجروح کی رائے کا تعلق ہے یہ حصّہ میں صدیقی صاحب ہی کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ مجروح کے اعتراضات کو وقیع سمجھیں تو جواب دیں۔

(ب) یہ سراسر غلط ہے کہ میں نے "عمر گزشتہ کی کتاب" کے سلسلے میں فیض اور مخدوم پر مجروح سے یا کسی اور سے مضامین مانگے تھے۔ وہ کتاب ہے رسالہ تو نہیں۔ سہ ماہی غالب، کراچی کا "فیض نمبر" (جلد ۲ شمارہ ۲) مرتب کرتے وقت مجھے خیال آیا کہ میں "فیض اور مخدوم" کے عنوان سے کوئی مضمون لکھوں۔ لکھنا شروع کیا تو وہ اتنا پھیلتا گیا کہ اس کے ایک کتاب بننے کے امکانات بہت ہی واضح ہو گئے۔ چنانچہ مضمون ملتوی کر دیا۔ کچھ تو اپنی اچانک اور انوکھی علالت (فروزن شولڈر) اور کچھ غالب لائبریری کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے کتاب کا کام شروع نہ کر سکا۔ اور جب شروع کیا تو مکمل کر کے ہی دم لیا۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

(ج) رہی مجروح کی تحریر کی بات، تو مجروح نے مجھے کوئی مضمون نہیں بلکہ ایک خط بھیجا تھا۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب میں نے "ارمغانِ فیض" کے نام سے فیض کی پینسٹھویں سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار مجلہ شائع کرنا چاہا تھا۔ اس کے لیے مجروح سے فیض پر مضمون مانگا تھا جس کے جواب میں انھوں نے محض ایک خط لکھا تھا جو میں نے کہیں استعمال نہیں کیا۔ "عمر گزشتہ کی کتاب" (ص ۲۱۴) میں اُن کی جس تحریر کے اقتباسات میں نے شائع کئے، ماہنامہ "افکار" کراچی کے فیض نمبر (ص ۱۳۱) سے لیے ہیں۔

صہبا لکھنوی کے نام ان کا پورا خط نقل کر رہا ہوں تاکہ مجروح پھر "سیاق و سباق" کا راگ الاپنے لگیں اور اس حصّے کے اوپر لکیر لگا رہا ہوں جو میں نے استعمال کیا ہے۔

۲۷ جنوری ۶۵ء مجروح سلطان پوری بمبئی

صہبا صاحب! میاں ایسی بھی کیا بزرگی کہ خط میں مجھے آپ نے بڑا صاحبزادہ ہی بنا ڈالا۔

آپ نے فیض نمبر کے لیے مجھ سے کوئی غزل یا نظم موضوع سے متعلق مانگی تھی۔ نظم یا غزل تو ہنگامۂ روزگار کی نذر سمجھیے البتہ ایک خط سا ہے مناسب سمجھیے تو حاضر ہے۔

فیض صاحب، مجاز، ن م راشد، اختر الایمان، مخدوم محی الدین اور علی سردار جعفری کی طرح میرے پیش رو ہیں۔ ۳۸ء میں جب میں نے شاعری شروع کی تو ان میں سے بیشتر حضرات صاحبِ دیوان ہو چکے تھے۔ لہٰذا کم و بیش ان سبھی کا عقیدت مند ہوں۔ لیکن یہ بات کہنے میں مجھے باک نہیں کہ ن م راشد اور فیض صاحب کی شاعری اردو کے لیے ایک نیا طرزِ بیان لے کر آئی جس کے بنیادی رشتے خواہ اقبال سے ہوتے ہوئے غالب و ناسخ تک جا ملتے ہوں لیکن پھر بھی یہ زبان ان ہی حضرات کی دین کہی جائے گی۔ گو ان کے ہم عصروں میں پنجاب کے بیشتر شعرا اس نئی سی اور بدلتی ہوئی زبان میں شعر کہہ رہے تھے۔ لیکن ان دو حضرات جتنی کامیاب شاعری وہ لوگ نہیں کر سکے۔ چنانچہ ان دونوں میں بھی ن م راشد کی شاعرانہ زبان تمکین و رعنائی ہی تک رہی لیکن فیض نے اس کی رعنائی کو سوز و غم کی تابندگی بھی عطا کی اور پھر سے وہ اپنے ہم چشموں میں سر بلند ہوئے۔ مجاز کی سرمستی نے تھوڑی دور تک البتہ ساتھ دیا لیکن اس کے بعد وہ خود بھی سب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ چنانچہ آج فیض کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان سے شاعر اور غیر شاعر سبھی نہ صرف عقیدت بلکہ محبت بھی کرتے ہیں۔ یہ ان کی جادو بیانی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

البتہ فیض کے بارے میں ان کی شاعری کے اعتراف کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں یہ بات بھی عام ہے کہ فیض صاحب بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل کو اتنا کھل کر نہیں بیان کرتے جتنے کہ وہ مسائل مستحق ہیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال کچھ اس طرح اٹھتا ہے کہ فیض جیسا شاعر آج اپنے ملک کے جدید شاعر کو ابہام و بے دلی کی تاریکی سے نکالنے میں کامیاب کیوں نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جب ان کی آواز کو "حرفِ حق" کی طرح بلند ہونا چاہیئے تو ان کی صدا "پیامِ زیرِ لب" بن کر رہ جاتی ہے اور غوغائے فتنہ و شر میں لوگ فیض کے لب تو ہلتے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ بات کچھ اتنے دھیمے لہجے میں ہوتی ہے کہ آواز سنائی نہیں دیتی جبکہ ان کی راہ نما آج یہی آواز ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ تو ہر شخص کی اپنی اپنی رائے جزوی حیثیت سے ہوئی لیکن مجموعی حیثیت سے فیض کی شاعری شاخِ گل کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اب یہ ہنرمندوں پر منحصر ہے کہ پھول کی پتی سے "ہیرے"

کا جگر کاٹ دیں ۔"

(د) یہ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ "کئی کئی صفحات" کے بعد مجروح کے اقوال اس نیت سے دیے ہیں کہ انھیں فیض کا مخالف ثابت کیا جاسکے۔ فیض کے مقابلے میں مجروح کون سے اور کہاں کے "پھنے خاں" (پنجاب کے طرّہ باز خاں) ہیں کہ اُن کا نام اور قول استعمال کیا جائے ۔

"عمر گزشتہ کی کتاب" میں ایک لحاظ سے دو تنقیدی یا تجزیاتی ابواب ہیں اور ان دونوں کا درمیانی فصل چالیس صفحات ہے نہ کہ "کئی کئی صفحات"

(۱) تقابل، تاثر، تجزیہ (ص ۳۵۵ تا ۳۶۷)

(۲) فیض دوسروں کی نظر میں (ص ۳۹۷ تا ۴۲۵)

اوّل الذکر فصل میں بندرہ اہم ادبی شخصیتوں کے تاثرات ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوہرؔ، حسرتؔ، فراقؔ، جگرؔ، راشدؔ، سردار جعفری، میراجی، سوداؔ، مومنؔ، جوشؔ، آرنلڈ اور مخدوم سولھویں سوا مجروح سلطان پوری ہیں۔ مجروح کا حوالہ دو مقامات پر ملتا ہے مگر یہ کوئی اتفاق، حادثہ یا سازش نہیں ہے کیونکہ اس میں غالبؔ، حسرتؔ اور راشدؔ کا تذکرہ تین تین مرتبہ اور میرؔ، اقبال اور مخدوم کا دو دو مقامات پر ہے۔ مجروح کا ایک حوالہ تو نقاد ظہیر صدیقی نے نظریاتی شاعری کے سلسلے میں دیا ہے (ص ۳۶۵) اور اُسی صفحہ پر دوسرا حوالہ میں نے اس خط سے نقل کیا ہے جو "افکار" کراچی کے فیض نمبر میں شائع ہو چکا ہے اور میں نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے ۔

ثانی الذکر فصل "فیض دوسروں کی نظر میں" چالیس آرا کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض نام یہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، اثر لکھنوی، شورش کاشمیری، ڈاکٹر مسعود حسین خان، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر گیان چند، سید سبط حسن، آل احمد سرور، شان الحق حقی ——— اور مجروح سلطان پوری۔ اگر ان ممتاز شخصیتوں کے ساتھ میں نے مجروح کو بھی شامل کیا تو انھیں اس شمولیت پر فخر کرنا چاہیئے کیونکہ نثر نگاروں اور تنقید نگاروں کی فہرست کے بالکل آخر میں بھی مجروح کا نام نہیں ملے گا۔ یہ بھی تو ہے کہ میں نے اُن کی مطبوعہ تحریر استعمال کی ہے جس کے وجود سے وہ یا کوئی اور انکار نہیں کر سکتا ۔

میں نے اس فصل میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ نہ کوئی رائے دی ہے بلکہ ماہنامہ افکار کے کچھ حصے داوین میں دیے ہیں اور فیض کا یہ جواب لکھ دیا ہے کہ "ہم سے سیاسی شاعری نہیں ہوتی۔" ایک التماس مجروح کے دوست افق اجمیری سے کہ "حریت" میں اُنھوں نے حضرت جوشؔ کی یہ دُعا تو نقل کر دی کہ اللہ فیض کی "عمر دراز کرے اور فن اور زبان کے دروازے اُن پر کھول دے"۔ مگر جوش صاحب نے اِسی پیام میں اور جو وزنی اور وقیع باتیں ارشاد فرمائیں، اُنھیں کیا مجروح دوستی میں نظر انداز

فرمایا گیا ہے ۔ اسی پیام میں جوش صاحب کا ارشاد ہے ۔" اردو شعرا کی سیرت کے متعلق مَیں اچھی رائے نہیں رکھتا ۔ یہ ایک دُوسرے کو بُرا بھلا کہنے اور ایک دُوسرے کو ذلیل کرنے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں ۔

مَیں نے اپنی تمام عمر میں صرف تین چار شاعروں کو پاک نفس دیکھا ہے اور مجھ کو ایک راست گو انسان کی طرح اس بات کے اظہار سے مسرت ہو رہی ہے کہ ان چند اِنے گِنے پاک نفس شعرا کے درمیان فیض کا چہرہ بھی دمک رہا ہے ۔

میرا ساحل اب سامنے آچکا ہے ۔ میری کشتی کے بادبان لپیٹے جا رہے ہیں لیکن ڈوب جانے سے پیشتر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مَیں اطمینان سے مَروں گا اور محض اس بنا پر کہ اُردو ادب کے ایک ملّاح کو اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں اور اس ملّاح کا نام ہے فیض ۔" (ص ۱۱۵)

فیض کی زبان کے متعلق مجھے یہاں کچھ نہیں کہنا ہے مگر یہ سوال ضرور کرنا ہے کہ آج سے سولہ سال پہلے مجروح نے جس زبان کو فیض کی "دین" کہا تھا اس مدّت میں آخر وہ کون سا انقلاب آگیا جس نے مجروح کو اتنا جَری بنا دیا کہ وہ فیض کی بڑائی کو (دِل سے یا بادلِ نخواستہ ہی سہی) تسلیم کرتے ہیں مگر خم ٹھونک کر کہتے ہیں "فکر میرے یہاں بھی کم نہیں"۔ ایک پُرانے لطیفے میں کچھ اس طرح تبدیلی کروں گا ۔ فیض اور مجروح سبزہ زار پر چہل قدمی کر رہے تھے ۔ مجروح نے فیض سے کہا ۔ فیض صاحب! ہمارے تمام اُردو شاعروں میں فکر صرف دو شاعروں کے یہاں ملتی ہے ۔ ایک آپ اور دُوسرا مَیں ـــــ اور پھر آپ کے پاس بھی کیا ہے ؟

مجھے نہیں معلوم کہ مجروح کے ذہن میں "حرفِ حق" کا کیا تصوّر ہے جسے اُنھوں نے بعد کی ایک اخباری تحریر میں "نعرۂ حق" میں بدل دیا ۔ دونوں صورتوں میں اگر اُن کا اشارہ "لال پھریرا" قِسم کی شاعری کی طرف ہے تو فیض اس کا جواب دے چکے ہیں کہ اُن سے سیاسی شاعری نہیں ہوتی ۔ اور جب وہ سیاسی شاعری کہتے ہیں تو اس کا مفہوم "لال پھریرا" قِسم کا نعرہ ہوتا ہے ۔ خواہ وہ مزدُوروں کے لیے ہو یا کسی اور کے لیے ۔ فیض پر اگر مَیں اتنا زیادہ نہ لکھتا تو مجروح کیا کسی کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ دستِ صبا کی مشمولہ نظم (ص ۲۰) "سیاسی لیڈر کے نام" فیض نے گاندھی جی کو ذہنی طور پر مخاطب کر کے اس وقت لکھی جب جاپان غیر منقسمہ ہندوستان کی سرحد کے بہت قریب پہنچ گیا تھا اور خدشہ تھا کہ فاشست درندے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے ۔

مجروح کے خیال میں "یہ داغ داغ اُجالا" "حرفِ حق" نہیں ہے ۔ فیض کے سات مجموعوں (نقشِ فریادی ، دستِ صبا ، زنداں نامہ ، دستِ تہِ سنگ ، سرِ وادیٔ سینا ، شامِ شہرِ یاراں ، مرے دِل مرے مسافر) کے کلام کا جائزہ بہت بڑا کام ہے ۔ صرف دو تین مثالیں دے کر پوچھتا ہوں کہ ان پر "حرفِ حق" کا

اطلاق ہوتا ہے کہ نہیں - ایوب خاں مرحوم کے دورِ آمریت کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو (سرِ وادیٔ سینا ص ۴۲)

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُن کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

راولپنڈی سازش کے مقدمے کی سماعت ہو رہی ہے ۔ محتسب کی اجازت اور منظوری کے بغیر نہ کوئی تحریر جیل کے باہر جا سکتی ہے اور نہ اندر آسکتی ہے ۔ ایسے میں فیض ایک ترانہ لکھتے ہیں جو سرکاری اجازت کے بعد ان کی بیوی کو بھیج دیا جاتا ہے ۔ انصاف کیجیے اور مجروح کو بتائیے کہ فیض کی کون سی صدا "پیامِ زیرِ لب" بن کر رہ گئی ۔

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے

فیض کی ایک اور نظم نقل کرتا ہوں - یہ بھی جیل کی تخلیق ہے (لاہور جیل ۱۱ فروری ۱۹۵۹ء) اس کا کون سا پیام زیرِ لب بن کر رہ جاتا ہے اور بقول مجروح غوغائے فتنہ و شر میں لوگ فیض کے لب تو ہلتے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ بات کچھ اتنے دھیمے لہجے میں ہوتی ہے کہ آواز سنائی نہیں دیتی - جبکہ اُن کی راہ نما آج بھی آواز ہو سکتی ہے ۔

یہ نظم دستِ تہِ سنگ میں شامل ہے (ص ۵۲)

آج بازار میں پا بجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

مجروح کے ذہن میں "حرفِ حق" کا کیا تصور ہے وہی جانتے ہیں۔ نہ انھوں نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے اور نہ ان کی طرف سے کوئی خفیف سا ہی سہی، اشارہ ملا ہے، جس سے سمجھ میں آسکے کہ اُن کی مُراد کیا ہے۔ البتہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نعرہ بازی کو وہ حق گوئی سمجھتے ہیں اور اس باب میں جو حرف اُن کے قلم سے نکلے، زبان سے ادا ہو، وہی ان کے نقطۂ نگاہ سے "حرفِ حق" ہے۔ فیض کی عظمت کی یہ بھی بہت بڑی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنی پوری شاعری میں کبھی کوئی نعرہ نہیں لگایا، کوئی نعرہ نہیں دیا۔ اس کے باوجود انھوں نے ایسی سیکڑوں شعری تراکیب استعمال کی ہیں جن کا اثر کبھی زہر اور کبھی شہد کی طرح ہوا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اردو کی ایک انوکھی اور محققینِ فیض کے لیے نہایت کارآمد اور سہولت بخش کتاب لکھی ہے "اشاریۂ کلامِ فیض" جس میں اپنے کلام میں استعمال کی ہوئی فیض کی کوئی گیارہ سو تراکیبِ شعری درج ہیں۔ ان میں سے چند نقل کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ مجروح کے ذہن میں غالباً جس قسم کی شاعری کا تصور ہے ویسی شاعری فیض نے کی ہے کہ نہیں۔ تراکیب ہیں۔ بارشِ سنگ، خونِ خاک نشیناں، داغ داغ اُجالا، شورِ آوازِ حق، کہرامِ دار و گیر، جگر کے داغ، ستم کی رسمیں، فرازِ دار وغیرہ۔۔۔

مَیں نے فیضؔ کی توہین جو کہا ہے اس کی تشریح ضروری ہے ۔ مجروحؔ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مَیں نے "عمرِ گزشتہ کی کتاب" یا اُن پر دُوسری کتابیں خود فیضؔ کے اشارے پر لکھی ہیں یا فیضؔ کو اپنے پروپیگنڈے کا شوق ہے جس کی تکمیل وہ میرے ذریعے کرا رہے ہیں ۔ فیضؔ پر اس سے زیادہ سنگین اور ظالمانہ الزام کوئی اور نہیں ہو سکتا ۔

مجھ سے یہ شکایت ہے کہ مَیں فیضؔ پر اتنا زیادہ کیوں لکھتا ہوں' اُس وقت واجب ہوتی جب مَیں خرافات لکھتا ۔ فیضؔ بہت ہی زرخیز موضوع ہے ۔ اس پر ابھی بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے ۔ مجروحؔ صاحب کو تو دُوسرے ادیبوں سے یہ شکایت کرنی چاہیے تھی کہ انھوں نے فیضؔ جیسی شخصیت پر اتنا کم کیوں لکھا ۔ اس کے برعکس مجروحؔ بقول صابرؔ دت ان سے ناراض ہیں کہ ان پر خاص نمبر کیوں نہیں نکالتے یا خاص نمبر میں ان کی غزلیں اتنی کم تعداد میں کیوں شائع کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے جس کی سوچ کا سانچہ ایسا ہو گا وہ ایسی ہی شکایتیں کرے گا ۔ سردارؔ جعفری، کیفیؔ اعظمی، ساحرؔ لدھیانوی، .... اخترالایمان، مخدوم محی الدین جیسے شاعروں اور صاحبانِ فکر و کردار نے نہ کبھی اوچھے حربے استعمال کیے نہ گھٹیا باتیں کیں اور نہ بے تُکے اعتراضات کیے ۔ اسی لیے ان کی شاعری بھی "بڑی شاعری" تسلیم کی جاتی رہی ہے ۔

مجروحؔ غالباً اس قسم کی شاعری کو "حرفِ حق" سمجھتے ہیں :

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

لینن کے پیغام کی جے ہو اسٹالن کے نام کی جے ہو
جے ہو اُس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہو کے رہے گا

ہشیار سامراج کہ زنجیرِ ایشیا
ٹوٹے گی تیرے سلسلۂ جان و تن کے ساتھ

یہ شاعری نہیں رُوس کا بھونپو ہے جو کم از کم مجروحؔ کو زیب نہیں دیتا جو لکھ پتی، کروڑ پتی سیٹھ کی نوکری کرتے ہیں، کوٹھی میں رہتے ہیں، کاریں گھومتے ہیں، مشاعرے کا معاوضہ لیتے ہیں ۔ گھٹیا فلموں کے لیے بھی گیت لکھ کر اُس کی کمائی کھاتے ہیں، اُونچی سوسائٹی میں شب و روز بسر کرتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں جس میں اسٹالن کی جے بھی شامل ہے ۔ فیضؔ موجود ہوں تو اپنی "رفیقانہ شوخی" دکھاتے ہیں اور موجود نہ ہوں تو کہتے ہیں فیضؔ کے ہاں زبان کی غلطیاں زیادہ ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ

اس موضوع پر مجروح لکھتے کیوں نہیں؟ فیض سے گفت گو کیوں نہیں کرتے؟ کسی مذاکرے میں تقریر کیوں نہیں کرتے۔ یہ منافقت کیوں۔

محبوب مشغلہ لڑائی ہے۔ جس مشاعرے میں جاتے ہیں منتظمین یا حاضرین سے لڑ کر آتے ہیں نئے شہر میں دوست پیدا کرنے کی بجائے دُشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر کے آتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اور جس کی چاہتے ہیں توہین کر دیتے ہیں چاہے وہ مرزا ظفر الحسن ہوں یا فیض احمد فیض۔

مجھے رتی برابر رنج نہیں کہ مجروح نے میرے یا میری کتاب کے متعلق ایک نجی محفل میں تلخ کلامی کی۔ اگر وہ کسی جلسۂ عام میں بھی ایسی گفتگو کرتے تو میں کوئی اثر نہ لیتا۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے جگہ جگہ اور بہتوں سے سُنا ہے یا وہ گوئی ان کی زندگی کا جُزو لاینفک بن گیا ہے۔ صرف اس بات کا افسوس ہے، "گو خود کردہ را، علاجے نیست" کہ غزل کا ایک اچھا شاعر ہاتھ میں ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپا لیے نہ معلوم کس مصلحت کے زیر اثر اس قسم کا گیت (دو گیتوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ساتھ) بے سُری آواز میں گاتا ہے ع

ہَوا میں اُڑتا جائے مرا لال پھریرا رشیا کا

یہ وہ شاعری ہے (اگر شاعری ہے تو) تاریخ ادب اُردو میں لکھے ہُوئے مجروح کے نام کو حرفِ غلط کی طرح مٹوا دے گی۔ انھیں صرف ان کی غزل زندہ رکھ سکتی ہے مگر بہ حیثیت شاعر۔ بہ حیثیت انسان مجروح کو اپنی انسانیت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ شر اور شرارت شیوۂ انسانیت نہیں ہے۔

میں یہ سب نہ لکھتا اور پورے واقعہ ہی کو نظر انداز کر جاتا مگر فیض کا نام آگیا ہے اور مستقبل کے مورخ کے لیے دُرست ریکارڈ محفوظ کرنا ضروری تھا اس لیے یہ ساری کتھا بیان کی ہے۔ اپنی تحریر کے بعض تلخ حصّوں کے لیے فیض کے اس شعر کے ساتھ معذرت خواہ ہوں سے

لب پر ہے تلخیٔ مےِ ایّام ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے!

مرزا ظفر الحسن

ن م راشد اور فیض احمد فیض

مجھے یہ مضمون لکھنے کی تحریک پاکستان کے جریدے "نیا دور" کے ن م راشد نمبر میں ساقی فاروقی کے ایک طویل مضمون "حسن کوزہ گر" پڑھنے کے بعد ہوئی خصوصاً وہ حصہ (ص ۳۵) جہاں راشد اور فیض کی دو ملاقاتوں اور دعوتوں کا تذکرہ ہے۔ جب لکھنے بیٹھا، اپنی یادیں مجتمع کیں تو اسی شمارے کے دوسرے مضامین سے بھی استفادہ کرنا پڑا۔ بیشتر حوالے راشد نمبر ہی کے ہیں۔ بہ صورت دیگر میں نے نام درج کر دیے ہیں۔ ابتدا میں ہی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد تردید یا تنقیص نہیں محض تنقیح ہے۔

میں ریڈیو پاکستان کراچی میں پروگرام آرگنائزر تھا (۱۹۵۵ - ۱۹۵۷ء) تو ساقی فاروقی اکثر ریڈیو اسٹیشن آیا کرتے تھے۔ کئی ملاقاتیں ہوئیں مگر سرسری یا سرراہے۔ میں ان دنوں کے ساقی فاروقی سے واقف ہوں جن کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں کہ راشد کے بیٹے شہریار کو اردو پڑھا کر فیس لینے میں وہ اپنی "ہتک" محسوس کرتے تھے۔ مگر جمیل جالبی اور جمیل الدین عالی سے سو روپے مانگ لینے میں انھیں کوئی عار نہ تھا۔ اس زمانے میں ان کا مزاج کچھ ایسا ہی اور باغیانہ تھا مگر ذرا مختلف قسم کی بغاوت۔ بگڑے تو شمشیر بہ دست۔ مانے تو دست بستہ۔ پھر وہ لندن چلے گئے جس کے بعد سے آج تک ملنا نہ ہوا۔ وہ نوجوان ساقی فاروقی مجھے پسند تھا۔ بہ حیثیت شاعر بھی اور بہ حیثیت ایک کڑیل جوان بھی۔

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء) کے دنوں میں انگریزوں نے سیلون (اب سری لنکا) میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا جس کا نام "ریڈیو سی ایک سیلون" یعنی ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ (SEAC) کا ریڈیو اسٹیشن تھا۔ اس کے آخری اسٹیشن ڈائریکٹر ن م راشد تھے۔ کیپٹن این ایم راشد جو فیض احمد فیض کی طرح برطانوی ہند کی فوج میں ملازم تھے فیض ترقی کر کے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے تھے۔ جس دن یہ ریڈیو اسٹیشن اپنی نشریات ہمیشہ کے لیے ختم کر رہا تھا ایک خاص وداعی پروگرام نشر کیا گیا جس کے اعداد و شمار تفصیلات

اور معلومات نوٹ کر کے میں نے اس اسٹیشن اور اس کے وداعی پروگرام پر ایک مضمون لکھا اور حمایت علی شاعر کے اس وقت کے ماہنامے "سازِ نو" میں شائع کیا جو حیدر آباد دکن سے نکلتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس پروگرام میں راشد بھی حصہ لیں گے اور میں ان کی آواز سن سکوں گا مگر ایسا نہیں ہوا۔

ن م راشد کا نام میں اس وقت سے جانتا تھا مگر ان سے میری پہلی ملاقات ریڈیو پاکستان پشاور میں ہوئی (اپریل ۱۹۵۵ء) جہاں وہ اسٹیشن ڈائریکٹر تھے اور پہلا تقرر کر کے مجھے پشاور بھیجا گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے کارڈ بھیجا، بلایا ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد پوچھا "آپ شاعری کرتے ہیں؟" میں نے جواب دیا "ساری عمر شعر کہنے کی کوشش کی اور اپنی ہر ناکامی پر خوش ہوا"۔ اس جواب پر ایک قہقہہ لگایا، داد دی اور بعد کے دنوں میں کئی بار یہ فقرہ دُہرا کر ہنسے۔

اپنی زندگی میں راشد نے چند دُکھ سہے ہیں۔ انھیں ناکامیاں بھی ہوئی ہیں جن کا علم ان کے احباب میں بطور خاص آغا عبدالحمید کو ہے۔ ایک ناکامی جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں ریڈیو میں ہوئی کہ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو یا ریڈیو پاکستان میں کوئی نام پیدا نہیں کیا وہ بنیادی طور سے ریڈیو کے آدمی قطعاً نہیں تھے۔ نہ ریڈیو کے لیے لکھ سکتے تھے نہ ریڈیو پر بول سکتے تھے۔ وہ تو کہیے کہ پطرس بخاری کی نظرِ انتخاب تھی کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز اور قابل قدر شاگرد کو پروگرام اسسٹنٹ بنا دیا۔ اور سنیئر ہونے کی بنا پر وہ ترقی کرتے ہوئے اسٹیشن ڈائریکٹر ہو گئے۔ ورنہ جیسا کہ ان کا مزاج تھا کسی ادارے یا محکمے میں ان کا ترقی کرنا میرے خیال میں ذرا مشکل ہی تھا۔ ریڈیو میں صرف علمی و ادبی لیاقت سے کام نہیں چلتا۔ چمکنے چمکانے کے لیے قابلیت کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ اس کے کارکن کا پورا ذہن ریڈیائی ہو اور ریڈیو اسکا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ یہ جراثیم محترم زیڈ اے بخاری مرحوم میں سرتاپا موجود تھے۔ اور اسی طرح میرے ساتھیوں میں مرحوم محمد عمر مہاجر میں بھی۔ راشد مرحوم کی سوچ ہمیشہ غیر ریڈیائی رہی۔ صرف ایک مثال دوں گا۔

آل انڈیا ریڈیو کے قیام (۱۹۳۶ء) سے تقریریوں کے اناؤنسمنٹ کا جو رواج تھا اور جس پر دنیا کے تقریباً تمام اسٹیشنوں میں عمل ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہوتا ہے۔ راشد نے ایک نادری حکم کے ذریعہ بدل دیا جس کے مطابق اناؤنسمنٹ اس طرح کیا جانے لگا:

"پشاور ریڈیو ـــــ فکرِ اقبال ـــــ پروفیسر طاہر فاروقی"

اس حکم سے پہلے یہی اناؤنسمنٹ اس طرح کیا جاتا تھا "یہ ریڈیو پاکستان پشاور ہے

اب پروفیسر ؟ - فاروقی صاحب تقریر نشر فرمائیں گے۔ موضوع ہے فکر اقبال ــــــ پروفیسر طاہر فاروقی ۔ سامعین نے اس تبدیلی پر احتجاج کیا، مخالفت میں خطوط لکھے بلکہ خاصا مذاق اڑایا مگر راشد ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنی انا کی تسکین کے لیے سلسلہ جاری رکھا۔ بخاری صاحب نے منع کیا تو راشد مرحوم کو ماننا پڑا۔

میرا دینی عقیدہ اور اس کے ساتھ عمل بھی یہ ہے کہ مرحومین کا جب بھی ذکر ہو، ذکر خیر ہی ہو۔ ممکنہ حد تک کوشش کرتا ہوں کہ ذکر خیر کروں اور سنوں۔ ساقی فاروقی نے راشد کے حوالے سے دو دعوتوں کا ذکر کیا ہے جسے اب نہیں تو آئندہ سوانحی ادب میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور جگہ مل سکتی ہے۔ ایک کی ماتحتی اور دوسرے کے قرب کی بنا پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ میں بھی لکھوں۔ تعلق چونکہ سیرت سے ہے اس لیے دونوں کے مزاج پر روشنی ڈالنی ہوگی اور زندگی کے کچھ واقعات کی طرف اشارے کرتے ہوں گے۔ اور یہی وہ مقام ہوگا جہاں میں اپنے دینی عقیدے اور عمل سے انحراف کروں گا۔ اس کا جواز یہ ہے کہ راشد اور فیض ادب کی ملکیت ہیں۔ ان کی زندگی تاریخ ادب کا حصہ ہے اور ادب اور تاریخ میں لگی لپٹی صریحاً بددیانتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا انحراف نہ میرے عقیدے کی تکذیب ہے اور نہ محولہ عمل سے روگردانی بلکہ محض ایک ادبی ضرورت ہے۔ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک ماتحت اور افسر کی حیثیت میں میرے اور راشد کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ دوسرے پروگرام آرگنائزروں کے مقابلے میں وہ مجھے زیادہ پسند کرتے تھے۔

دونوں بلاشبہ بڑے شاعر ہیں۔ میں انھیں "عظیم" نہیں لکھوں گا اور دوسروں کو اس طرح لکھنے سے منع کروں گا۔ کیونکہ یہ مستقبل کے ادبی مورخ کا منصب ہے کہ وہ ان کا مقام متعین کرے۔ بہ حیثیت انسان دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ قریباً ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ راشد اور فیض صرف تین ماہ تین دن کے چھوٹے بڑے ہیں۔ (۹ نومبر ۱۹۱۰ء۔ ۱۱ فروری ۱۹۱۱ء) دونوں نے ایک سال کے فرق سے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ (۱۹۳۲ء - ۱۹۳۳ء) ایک کا مضمون معاشیات تھا دوسرے کا انگریزی ادب۔ دونوں کے اوّلین شعری مجموعے ۱۹۴۱ء شائع ہوئے (ماورا۔ نقش فریادی)۔ پتا نہیں چلا کہ راشد نے شاعری کب شروع کی۔ فیض نے اوّلین غزل ۱۹۲۸ء میں کہی۔ دونوں کی قابل ذکر شاعری کالج کی طالب علمی کے دنوں سے شروع ہوئی۔ فیض کہتے ہیں ہم جب پڑھتے تھے تو راشد کی حیثیت کالج کے "ملک الشعراء" کی تھی۔ راشد کے ابتدائی اساتذہ کا مجھے کوئی سراغ نہ ملا۔ فیض نے سیالکوٹ میں مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی اور اقبال کے استاد

شمس العلماء مولوی میر حسن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ دونوں کو پطرس بخاری کے شاگرد ہونے کا شرف رہا۔ دونوں اس لحاظ سے بھی بڑے ممتاز ہیں کہ پطرس دونوں کو بہت چاہتے تھے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مرحوم نے سہ ماہی غالب کے فیض نمبر میں اپنے ایک مضمون "فیض سے میری پہلی ملاقات" (ص ۴۴) میں ۱۹۳۱ کے ایک مشاعرے کا حال لکھا ہے جو پطرس بخاری کی صدارت میں گورنمنٹ کالج میں ہوا اور جس میں نیاز مندانِ لاہور بھی مدعو تھے۔ صرف دو نوجوان طالب علم شاعروں کے نام لیے ہیں، حفیظ ہوشیارپوری اور فیض احمد فیض۔

راشد نمبر میں غلام عباس کی تحریر (ص ۵) کے مطابق ۱۹۳۵ء میں پطرس بخاری کو راشد کی نظم "اتفاقات" نے چونکایا جبکہ کالج چھوڑے ہوئے انھیں تین چار سال ہو چکے تھے۔ حیرت اور اس کے ساتھ افسوس بھی ہے کہ ابھی تک کسی نے راشد کی طالب علمی کے دنوں کا کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کا تعلق ان کی شاعری سے ہو۔ میرے خیال میں یہ کام اب ان کے ہمدم دیرینہ اور محب صادق آغا عبدالحمید کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ انھیں لکھنا چاہیے۔ ملتان کے کمشنر کے دفتر میں راشد کلرک کس سال مقرر ہوئے۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ آغا عبدالحمید کے نام راشد کا اولین مطبوعہ خط جو ملتان سے لکھا گیا تھا، ۲۸ فروری ۱۹۳۹ء کا ہے۔ اس وقت تک فیض ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی ادب کے استاد مقرر ہو کر تین سال تک درس دیتے اور ماہوار سوا سو روپے پاتے رہے تھے۔ غالباً راشد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہونے تک کلرک ہی رہے۔ تنخواہ کوئی تیس چالیس روپے ہوگی۔

خاکسار تحریک سے راشد کی والہانہ وابستگی کا ثبوت یا تو غلام عباس کی تحریر سے ملتا ہے یا ان خطوط میں ہے جو آغا عبدالحمید کے نام لکھے گئے ہیں۔ غلام عباس کا بیان ہے (ص ۵۸) کہ انھیں گورنمنٹ کالج لاہور میں خاکسار تحریک پر تقریر کی دعوت ملی تو انھوں نے شرط لگائی کہ وردی پہن کر اور ہاتھ میں بیلچہ اٹھا کر آئیں گے۔ آغا صاحب کے نام اپنے خط (ص ۵۲) میں راشد لکھتے ہیں "میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان اور بالخصوص ہندی مسلمان کے "زندہ" ہونے کا نسخہ ایک ہی ہے، خاکسار تحریک!۔ اگر اس نسخے کو ہم نے استعمال نہ کیا تو ابدی ہلاکت میں کم مدت باقی ہے۔ خدارا دفتر "الاصلاح"، اچھرہ، لاہور سے کچھ کتابیں منگوا کر پڑھو۔ تم اُسے "صرف مذہب" نہیں پاؤ گے تمھیں معلوم ہوگا کہ کیا ہونے والا ہے، صرف آئندہ پانچ سال کے عرصے میں۔" اس تحریر کے ایک سال کے اندر اندر ریڈیو میں ملازم ہو کر راشد اس تحریک کو بھول گئے بلکہ بقول غلام عباس اس سے "کچھ بددل سے ہو گئے تھے۔" آغا عبدالحمید کا خیال ہے (ص ۵۱) کہ "زندگی سے باعمل رشتہ" قائم کرنے کا جذبہ انھیں اس تحریک کی طرف لے گیا تھا مگر میں سمجھتا ہوں

کہ راشد کی انانیت نے انہیں خاکسار بنایا تھا

مجھے پشاور کے دنوں سے خلش تھی کہ راشد جیسا بڑا شاعر احساس کمتری کا شکار ہے۔ اپنی کلرکی اور خاکسار تحریک سے دلبستگی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ ریڈیو سیلون کی ملازمت کو بھی حقیر سمجھتے تھے۔ پشاور میں ان سے میں نے اپنے "سازِ نو" والے مضمون کا ذکر کر کے پوچھا کیا آپ اپنی پرانی یاد بن تازہ کرنے کے لیے مضمون پڑھنا پسند کریں گے۔ دکھاؤں آپ کو وہ مضمون" تو عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا" بھول جایئے اس نوکری کو"۔ میرے خیال میں ایسے لوگ کم ہی ہوں گے جو اپنی بابت سات آٹھ سال پہلے کا لکھا ہوا کوئی مضمون پڑھنے سے بھی گریز کریں، خصوصاً جبکہ برصغیر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ انگریز جا چکا تھا اور پاکستان ایک حقیقت بن چکا تھا۔ اگر وہ مجھے ایک حقیر مضمون نگار سمجھتے تھے تب بھی ایک نارمل انسان کا فطری تجسس اسے اکساتا ہے کہ دیکھیں آخر لکھا کیا گیا ہے۔

ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر ہونے کے باوجود راشد کی زندگی عسرت میں گزری۔ آمدنی کم اور فضول خرچ نہ ہونے پر بھی ان کا خرچ زیادہ تھا۔ مشکل سے دو تین سوٹ تھے۔ پرانا فوجی اوور کوٹ تھا، نعل جڑا ہوا جوتا تھا اور اسی باعث ریڈیو پشاور کے دوسرے اسٹیشن ڈائریکٹروں افضل اقبال اور مرحوم محمود نظامی کے برعکس راشد سرکاری یا دوسری بڑی تقریبوں میں کم ہی جاتے تھے۔ اپنے گھر پر تقریبیں یا دعوتیں کرنے کے مالی موقف میں بھی نہیں تھے۔

احساس کمتری کا ایک سبب ان کی پہلی بیوی کی بے علمی بھی تھی۔ وہ ایک خانہ نشیں اور خالص قدیم مشرقی طرز کی خاتون تھیں۔ نہ وہ کہیں جاتی تھیں نہ راشد انہیں کہیں لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے دونوں میاں بیوی اور بچوں کو چائے پر مدعو کیا۔ اکیلے آئے اور کہا بیوی بچے پھر کبھی آجائیں گے۔ اور وہ کبھی نہیں آئے۔ سیکل پہ دفتر آتے تھے۔ دوسرے اسٹیشن ڈائریکٹر اپنے اور بیوی بچوں کے خانگی کاموں کے لیے سرکاری موٹر استعمال کرتے تو آٹھ آنے فی میل کے حساب سے کرایہ ادا کرنے کے موقف میں تھے۔ شادی کے متعلق آغا عبدالحمید کے نام اپنے ۲۸ فروری ۱۹۳۹ کے خط (صفحہ ۱۵۹) میں لکھتے ہیں: "مجھے شادی کا قریباً تین سال کا تجربہ ہو چکا ہے۔ شادی برے آدمیوں کے لیے یقیناً اچھی ہے لیکن اچھے آدمیوں کے لیے قطعاً اچھی نہیں۔ اور میں تمھیں اور اپنے آپ کو کسی قدر اچھے آدمیوں میں تصور کرتا ہوں۔ محض جنسی خواہشات کا اظہار تو کئی طریقوں سے ہو سکتا ہے ـــــ بالخصوص لاہور میں ـــــ شادی کے ابتدائی دن یقیناً خوشگوار ہوتے ہیں لیکن بعد کی ROUTINE توبہ۔ میں اپنے معاملے میں شادی اور کلرکی کو چکی کے دو پاٹ سے زیادہ نہیں سمجھتا۔" حیرت ہے کہ پہلی بیوی کے انتقال پر یہ "اچھا" آدمی اپنے گھر چکی کا ایک اور پاٹ لے آیا۔ اسے بھی میں مرحوم کا احساس کمتری قرار دیتا ہوں کہ ایک یورپی نژاد خاتون کے شوہر بننے کے جذبے

اور خواہش نے ان سے ان کے ۱۹۳۸ء کے تجربے اور نظریے کی نفی کر دی۔

راشد تنقید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایسی انوکھی کمزوری نہیں ہے جو دوسروں میں نہ ہو مگر راشد یہ چاہتے تھے کہ ناقد اور ناظر دونوں ان ہی کے دماغ سے سوچیں اور ان ہی کی زبان میں اظہار رائے کریں۔ غلام عباس نے حیات اللہ انصاری والے مقالے کی مثال دی ہے (صفحہ ۶۲) دیکھیے کس طرح وہ مقالہ نگار پر جھپٹ پڑے۔ مرحوم کے وہ خطوط پڑھیے جو ضیا جالندھری اور ڈاکٹر عبداللہ کے نام ہیں (صفحہ ۱۹۲ — ۱۹۴) چلیے تسلیم کہ ضیا اور ڈاکٹر عبداللہ نے جو کچھ لکھا غلط ہے مگر یہ کس طرح ادیب کو زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے نقاد کے لیے لٹھ اٹھا لے۔ اگر غلط بات لکھی گئی ہے تو جواب دینے کے لیے دوسرے لوگ موجود ہیں۔ دوسروں نے اگر جواب نہیں دیا تو شاید کہ وہ بات غلط نہ ہو۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے تعلق سے راشد کی تحریریں دیکھیے اور ان کے انداز تحریر اور فکر پر غور کیجیے۔ ادب میں قاسمی کا جو مقام ہے اس سے انھیں نیچے اتارنے کی کوشش نامناسب بھی ہے ناممکن بھی۔ حد تو یہ ہے کہ وہ مرحوم پطرس بخاری کی تنقید بھی برداشت کر سکتے تھے، جو نہ صرف ان کے مشفق استاد، مداح اور محسن تھے بلکہ اگر پطرس نہ ہوتے تو راشد نہ ریڈیو میں ملازم ہوتے اور نہ اقوام متحدہ بلائے جاتے جہاں مالی اعتبار سے ان کی زندگی کا زریں دور شروع ہوا۔ پطرس نہ ہوتے تو کوئی تعجب نہیں جو راشد کمشنر ملتان کے دفتر میں کلرک سے ہیڈ کلرک اور پھر سپرنٹنڈنٹ ہو کر ایک نان گزٹیڈ پنشن یاب کی صورت میں زندگی بسر کرتے۔ راشد کے دوسرے شعری مجموعے "ایران میں اجنبی" کا مقدمہ پطرس نے لکھا جس میں بقول غلام عباس (صفحہ ۶۲) "کہیں کہیں مخصوص طنزیہ رنگ میں راشد پر تنقید بھی کی تھی" جس سے راشد سوچنے لگے کہ پطرس کا یہ مقدمہ شامل کتاب کریں کہ نہ کریں۔

پشاور ریڈیو سے "چیستان" یعنی بوجھو تو جانیں قسم کا ایک پروگرام نشر کرتا تھا جس میں سوال جواب ہوتے تھے۔ ایک ریہرسل میں راشد بھی موجود تھے۔ احمد فراز نے جو اس وقت زیادہ سے زیادہ میٹرک پاس اسٹاف آرٹسٹ ہوگا کہا "ایک عیب چھپانے والی چیز بوجھیے"۔ سوال جواب ختم ہوئے، کوئی نہ بوجھ سکا تو فراز نے راشد کے گنجے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا "راشد صاحب کی ہیٹ"۔ یہ بات اگر کسی اور نے کہی ہوتی تو راشد نہ جانے کیا کر گزرتے مگر فراز بخاری مرحوم کا چہیتا اور بخاری صاحب ڈائرکٹر جنرل تھے۔

صاحب علم ہونے کے باوجود شاید انھیں اپنی زبان پر کامل اعتماد نہیں تھا یا انھیں بھی PERFECTIONISM کا عارضہ لاحق تھا۔ نظم کا میں نہیں کہہ سکتا اپنے نثری مضامین قاری تجمل حسین کو زبان کی اصلاح یا نظر ثانی کے لیے دیا کرتے تھے جو ایک زبان داں اسٹاف آرٹسٹ

تھے۔ مجھے نہ صرف قاری صاحب نے بتایا بلکہ مضامین بھی دکھائے۔ پشاور ریڈیو کے سابق اسٹیشن ڈائریکٹر قاضی سرور بھی گواہی دیں گے جن کی قاری صاحب سے دلچسپ نوک جھوک ہوتی اور جو کہتے تھے قاری صاحب کی اصلاح راشد صاحب کی اچھی خاصی نثر کی حجامت بنا دے گی۔ ایک تحریر سے تو یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۱ء میں انھیں اپنی فکر پر بھی اعتماد نہیں تھا تب ہی تو آغا عبدالحمید کے نام اپنے خط (ص ۱۹۱) میں لکھتے ہیں: "میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمھاری ذاتی رائے فیض کی شاعری کے متعلق کیا ہے اور یہ کہ (نقش فریادی پر مقدمہ لکھتے ہوئے) اس پر کس رخ سے روشنی ڈالی جائے۔ اس سے مجھے بڑی مدد ملے گی کیونکہ مجھے آل انڈیا نے ذہنی طور پر بیکار محض بنا دیا ہے۔

پچھلے اوراق سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اور جس سے ساقی فاروقی کے بیان کردہ واقعات (ص ۲۵) کا رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ کو کچھ اور انتظار کرنا ہوگا کیونکہ اب چند ایک باتیں فیض کی کروں گا۔

فیض بھی تنگ دست رہے ہیں۔ دکھ سہے ہیں۔ اور بہت زیادہ جسمانی اور ذہنی اذیتیں بھی برداشت کی ہیں مگر ان کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ راولپنڈی سازش کی اسیری کے خط نمبر ۲ میں جو ایلس فیض کے نام ہے لکھتے ہیں: "ہم نے اس سے زیادہ تنگ دستی کے دن بھی دیکھے ہیں اور جیسے وہ گزر گئے یہ بھی بیت جائیں گے"۔ اور کئی خطوط اور تحریریں ہیں جن میں انھوں نے اپنے افلاس کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے والد اور دادا کی مفلسی کے واقعات فیض نے مجھے سنائے جو میں اپنی تصنیف "عمر گزشتہ کی کتاب" اور دوسرے مضامین میں لکھ چکا ہوں۔ شادی کے لیے پیسے نہیں تھے تو میاں افتخار الدین سے تین سو روپے قرض لے کر شادی کی۔ ان کے والد نے کالا قادر میں چرواہے کا اور لاہور ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کر کے روزی کمائی۔

تمام ہم عصروں اور ہم عمروں بلکہ جونیئر ادیبوں اور شاعروں کی جتنی اور جس انداز سے مخالفت کی گئی ہے غالباً اس سے زیادہ ایک اکیلے فیض کی کی گئی ہے اور جو پانچ دس سال نہیں بلکہ ایک ربع صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ مخالفت بھی کس قسم کی؟ الزام واتہام کس نوعیت کے؟ انھیں کمیونسٹ کہا، بے دین قرار دیا۔ سیاسی ایجنٹ بنایا، تین مرتبہ کی گرفتاری اور قید کو ان کی غداری کا ثبوت قرار دیا۔ یہ داغ داغ اجالا والی نظم پر ہنگامہ برپا کیا، ۶۵ء کی جنگ میں ان کا حبِّ وطن مشکوک بتایا۔ فیض کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے اعصاب جواب دے دیتے، وہ احساس کمتری کا بری طرح شکار ہو جاتا۔ مشفق خواجہ میری کتاب "دکن اداس ہے یارو" کے مقدمے میں لکھتے ہیں (ص ۱۱) "گزشتہ ۲۵ برسوں میں فیض صاحب کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھنے والوں میں ہر طرح کے لوگ

شامل ہیں لیکن فیض صاحب نے کبھی کوئی ردِّ عمل ظاہر نہیں کیا۔ آج تک کسی مخالفانہ تحریر کا جواب نہیں دیا۔

"واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں"

راشد تو دو ایک فقروں سے برہم ہو کر اپنے قلم کو تلوار بنا دیتے تھے اور فیض ۲۵ سال سے مخالفین کی بڑی بڑی پلٹنوں کے وار سہے جا رہے ہیں ؎

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے۔ بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

فیض کی ازدواجی زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی ہے۔ میاں بیوی کے حقوق اور فرائض کے ضمن میں نہ جانے دونوں میں کیا سمجھوتہ ہوا ہے کہ عسرت کے دن ہوں کہ عشرت کے نہ کوئی اپنے حقوق سے تجاوز کرتا ہے اور نہ کوئی اپنے فرائض کی انجام دہی سے آنکھ چراتا ہے۔

کسی سیاسی یا نیم سیاسی تحریک یا تنظیم سے فیض کبھی وابستہ یا منسلک نہیں رہے کسی پارٹی کے نہ رکن رہے نہ اس کے لیے کوئی کام کیا۔ ویسے ان کا جھکاؤ بائیں بازو والی سیاست اور معیشت کی طرف ہے۔ میرا اشارہ اشتراکیت کی طرف ہے۔ مگر اشتراکیت کے معاملے میں بھی ان کے اپنے چند ذاتی نظریات ہیں۔ ایک دن میں نے فیض سے پوچھا اگر آپ کو اشتراکیت رائج کرنے کا اختیار دیا جائے تو آپ کی نظریں کس طرف اٹھیں گی، ماسکو کی جانب یا پیکنگ کی طرف؛ بولے ملک کے معاشی معاشرتی اور دوسرے حالات کے پیش نظر اس کے لیے سیاسی ڈھانچہ تیار کیا جائے تو وہ فطری بھی ہوگا، مناسب اور مفید بھی اس لیے بھی کیا ضرورت ہے کہ ہم ماسکو یا پیکنگ کی تقلید کریں۔ ہمارے ملک کے لیے اگر باہر کی کوئی چیز مفید اور مناسب ہے تو حسب ضرورت لی جا سکتی ہے۔ جو بھی نظام ہو اس میں معاشی عدل ہو۔ معاشرہ استحصال سے پاک ہو، امن ہو اور فکر، اور اظہارِ فکر کی آزادی ہو۔

فیض کم گو اور سادہ مزاج ہونے کے باوجود بڑے مجلسی اور محفل پسند انسان ہیں۔ میں ان کی ایسی محفلوں میں بار ہا شریک ہو چکا ہوں جو رات دو دو بجے تک جاری رہیں۔ ان میں وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور ممکنہ حد تک ہر ایک کی فرمائش پوری کرتے ہیں۔ جنھیں نہیں پہچانتے انھیں یہ تاثر نہیں لینے دیتے کہ انھیں بھول گئے ہیں۔ کسی کو اپنا مخالف نہیں سمجھتے۔ جو واقعی مخالف ہیں ان سے بھی بہت اچھی طرح ملتے ہیں۔ انتقام، مخالفت، بدگوئی، بدکلامی، بدتمیزی، درشت نویسی، طنز آن کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ بڑے سے بڑا لفظ جو میں نے ان کی زبان سے سنا یا تحریر میں پڑھا وہ "پاجی" ہے۔

اب ساقی فاروقی کے مضمون کے صفحہ ۳۵ پر لکھی ہوئی دو ملاقاتوں کی داستان کی طرف پہلے

واقعے میں ایک پٹرول پمپ پر راشد کی ملاقات فیض اور ایلس فیض سے ہوئی۔ فیض نے راشد کو کھانے پر مدعو کیا۔ راشد پہنچے تو کھانا وغیرہ نہیں تھا البتہ وہسکی کی ایک چھوٹی سی شیشی پیش کی جو راشد نے نہیں پی اور فیض نے "غٹاغٹ" ختم کر دی۔

ساقی فاروقی لکھتے ہیں "راشد صاحب نے یہ واقعہ کئی بار سنایا، انھیں رنج یہ تھا کہ فیض صاحب نے (راشد سے) معافی تک نہیں مانگی"۔ میں نہ تو ساقی فاروقی کے مضمون کے متعلقہ متن کی تردید کروں گا نہ تائید کیونکہ میرے پاس فی الوقت کوئی دستاویزی ثبوت نہیں مگر چند تنقیحات ضرور قائم کروں گا۔ اسی سے ناظرین خود کوئی فیصلہ کریں۔

(۱) مضمون میں نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ واقعہ کس ماہ و سال کا ہے۔ نہ غالباً راشد نے ساقی فاروقی سے کہا نہ انھوں نے کوئی ذکر کیا۔ نیویارک میں وہ دو مرتبہ متعین اور مقیم رہے۔ پہلی بار ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک۔ اگر اس مدت میں نیویارک سے لاہور آئے اور فیض سے پٹرول پمپ پر ملاقات ہوئی تھی تو یہ یاد رکھا جائے کہ فیض ۵۱ء سے اپریل ۵۵ تک جیل میں تھے۔ اور جب رہا ہوئے تو ان کے پاس موٹر نہیں تھی۔ اور ایلس فیض سیکل پر اپنے دفتر جایا کرتی تھیں۔ راشد دوسری بار ۶۱ء سے ۶۴ء تک نیویارک میں رہے۔ اگر اس مدت میں نیویارک سے لاہور پہنچے تو یاد رہے کہ فیض ۶۲ء سے ۶۴ء تک لندن میں اور ۶۴ء سے ۷۲ء تک عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل اور کراچی میں مقیم رہے۔ ایلس بھی کراچی کے ایک اسکول میں استانی تھیں۔

(۲) دوسری بات ڈائریوں کی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ دونوں میاں بیوی کبھی اپنی ڈائریاں لے کر گھر کے باہر نہیں جاتے۔ فیض صرف دفتر جاتے وقت ڈائری ساتھ رکھتے ہیں۔ کیا یہ ایک ڈرامائی اتفاق نہیں تھا کہ ملاقات کے وقت دونوں کے پاس ان کی ڈائریاں بھی تھیں۔

(۳) تیسری بات یہ کہ راشد اور ایلس ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے اور ایلس جنھیں ناپسند کرتی ہیں ان کے بارے میں فیض ہمیشہ بہت محتاط رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ غور طلب ہے کہ فیض جیسے محتاط شوہر نے پٹرول پمپ پر راشد کو دیکھتے ہی "فوراً اپنی بیوی سے کہا کہ راشد کو کھانے پر بلائیں"۔ کیا متذکرہ حالات میں یہ ضروری نہ تھا کہ فیض گھر لوٹ کر ایلس سے مشورہ کرتے اور اس کے بعد راشد کو مدعو کرتے۔ عجلت اور فوری تصفیے کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔

(۴) فیض جہاں بھی رہیں، جس طرح بھی رہیں اگر کوئی شخص گھنٹی بجائے، دستک دے یا دروازہ کھٹکھٹائے تو خود دروازہ نہیں کھولتے۔ یہ کام ہمیشہ ایلس کرتی ہیں یا نوکر۔ ہاں گھر میں اکیلے ہوں تو مجبوری ہے۔ اگر پٹرول پمپ پر دعوت کی تاریخ طے ہوئی تھی مگر کسی وجہ سے گھر پر دعوت کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا تو دل یہ کہتا ہے کہ ایسی صورت میں میزبان یا صاحبِ خانہ دستک یا گھنٹی پر دروازہ نہیں کھولے گا یا گھر مقفل

کر کے کہیں چلا جائے گا یا کوئی ایسی صورت پیدا کر دے گا کہ مہمان اور میزبان کی مڈبھیڑ ہی نہ ہو۔

(۵) ساقی فاروقی لکھتے ہیں راشد نے " دو تین بار گھنٹی بجائی تو اوپر کھڑکی سے فیض صاحب کا سایہ نمودار ہوا "۔ جہاں تک میں جانتا ہوں فیض صرف دو مرتبہ دو منزلہ مکان میں مقیم رہے ہیں۔ ایک تو لاہور میں، راولپنڈی سازش کی اسیری سے پہلے، دوسرے کراچی میں جب وہ کالج کے پرنسپل تھے۔ ماہ و سال بتا دیا جاتا تو مکان اور محلّے کا تعین کیا جاسکتا تھا یا اگر محلّے کی نشاندہی کی گئی ہوتی تو اس سے ماہ و سال مقرر ہوسکتا تھا۔

(۶) زبان کے معاملے میں فیض نہایت شائستہ اور قدیم روایات کے پابند ہیں۔ ہمیشہ آپ جناب سے بات کرتے ہیں۔ بے تکلف دوستوں اور کم عمروں کو " تم " سے مخاطب کرتے ہوئے بھی آپ جناب پر آجاتے ہیں۔ ایسے شخص سے مندرجہ ذیل جملے منسوب کیے گئے ہیں۔

" ارے یار تو کہاں ؟ "

" میں سمجھا تھا تُو مصروف آدمی ہے یار، نہیں آئے گا "

" آدھی تو پی، آدھی میں پیوں گا "

میں کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور میری طرح فیض کے دوسرے قریبی دوست سبط حسن عبداللہ ملک، حمید اختر وغیرہ بھی کہ فیض کبھی تُو تکار نہیں کرتے۔

(۷) ویسے تو فیض لاپروا ہیں مگر رہائش کے معاملات میں بہت باسلیقہ ہیں۔ میں اسلام آباد اور لاہور میں ان کے گھر رہ چکا ہوں اور کراچی میں سیکڑوں بار ان کے گھر جا چکا ہوں اور اس کا ایک ایک کونا دیکھ چکا ہوں اس لیے اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان کا کمرہ سجا سجایا ہوتا ہے۔ غسل خانے تک میں راکھ دان رکھے ہوتے ہیں تاکہ راکھ ان ہی میں جھٹکی جائے اور سگریٹ بجھا کر ڈالا جائے۔ ایسے میں راشد کا یہ کہنا کہ " فیض نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے بستر کے نیچے سے وسکی کی ایک شیشی نکالی " کم از کم میرے لیے تو بہت حیران کن ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ " شیشی " " بستر کے نیچے " ہو۔ کوئی چوری یا خوف ہو تو کوئی چیز بستر کے نیچے رکھی جاتی ہے۔ فیض کو کس کی چوری یا خوف تھا کہ " بستر کے نیچے " رکھتے ؟ اور پھر فیض کے علاوہ خود ایلس جیسی سلیقہ مند خاتون خانہ نے کس طرح گوارا کر لیا کہ " شیشی " " بستر کے نیچے " رہے۔ ایک یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ یہ نشست کیا فیض کی خواب گاہ میں ہوئی جو راشد نے فیض کو " بستر کے نیچے " سے شیشی نکالتے ہوئے دیکھا ؟

(۸) یہ بات فیض کے مزاج کے بالکل خلاف ہے کہ وہ کہیں " آدھی (شیشی) تو پی آدھی

دشنیشی) میں پیوں گا"۔ زبان کی طرف پہلے اشارہ کرچکا ہوں، یہاں آدھا آدھا کرنے کا ذکر ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ دعوت طے ہوئی تھی۔ فیض اس کا انتظام کسی وجہ سے نہ کرسکے، شراب بھی فراہم نہ ہوسکی، صرف ایک چھوٹی سی شیشی گھر پر تھی تو کیا ایسی صورت میں فیض جیسا شخص راشد سے جو نیویارک سے آئے تھے یہ کہے کہ "آدھی تو پی آدھی میں پیوں گا"۔ عقل سلیم تو یہی کہتی ہے کہ ان حالات میں میزبان کہے گا معاف کرنا اس وقت میرے پاس صرف یہ چھوٹی سی شیشی ہے۔ اسی سے شوق کرو (نہ کہ آدھا آدھا کرو)۔ شاید اس سے بڑا جھوٹ اور فیض پر اس سے زیادہ سنگین بہتان نہیں لگایا جاسکتا۔ شائستگی فیض کا شیوہ ہے۔

(۹) میں فیض کی ہر قسم کی محفلوں میں شریک رہا ہوں۔ انھیں ہر رنگ میں دیکھ چکا ہوں۔ ان کا نہایت قریب سے مطالعہ کرچکا ہوں۔ "غٹا غٹ" وہسکی ختم کی، بھی اتنی ہی بڑی تہمت ہے جتنی کہ آدھا آدھا کرنے والی بات۔ خلوت ہو کہ جلوت فیض کھانے پینے کے آداب کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ ان کے سامنے جام رکھا ہوا تھا کہ اچانک ممتاز حسن مرحوم تشریف لے آئے اور فیض نے فوراً جام چھپا دیا۔ مولانا ماہر القادری مرحوم نے خود مجھے بتایا کہ کسی محفل میں مولانا پہنچ گئے۔ انھیں فیض کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ فیض کے آگے بھرا ہوا جام رکھا تھا۔ مولانا کہتے تھے، "جب تک میں بیٹھا رہا فیض نے اُسے چھوا تک نہیں۔ اسی لمحے مجھے خیال ہوا کہ فیض بڑا شاعر نہ سہی بہ حیثیت انسان عظیم ہے"۔ کیا ایسا شخص اور متذکرہ حالات میں "غٹا غٹ" پی سکتا ہے؟

دوسرا واقعہ یا دوسری دعوت کا سانحہ بھی لاہور ہی میں پیش آیا۔ یہاں بھی پتا نہیں چلتا کہ کس سال ہوا۔ دوسری مرتبہ فیض نے راشد کو "پھر کھانے پر بلایا"۔ راشد کا جو مزاج تھا اس کے پیش نظر انھیں فیض سے کہنا چاہیے تھا کہ بھئی پچھلی دعوت کی طرح تو کوئی حرکت نہیں ہوگی؟ مگر راشد نے نہیں کہا یا کم از کم ساقی فاروقی نے مضمون میں نہیں لکھا۔ راشد پہنچے، فیض انتظار میں تھے۔ مصافحے کے بعد فیض راشد کو "فلانے چوہدری صاحب" کے پاس لے گئے۔ یہ میں ماننے کے لیے تیار ہوں کہ فیض نے راشد کی دعوت کسی دوسرے گھر پر کی ہوگی۔ کیونکہ راشد اور ایلس ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر میں یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ فیض نے راشد سے کہا چوہدری صاحب کے پاس "اچھی، شراب ملے گی"۔ فیض نے جب بھی اور جہاں کہیں بھی شراب پی وہ "اچھی شراب" ہی تھی۔ انھیں کبھی گھٹیا شراب نہیں پیش کی گئی۔ یہاں بھی فیض کی زبان کا سوال اٹھتا ہے جب بقول ساقی فاروقی فیض راشد سے کہتے ہیں "فکر نہ کر یار تجھے وہ خوب جانتے ہیں"؛

چوہدری صاحب کے گھر سے اٹھ کر یہ دونوں ایک اور "فلانے" کے پاس جاتے ہیں جہاں دوسرا دور چلتا ہے۔ اس کے بعد فیض راشد کو کسی شیخ صاحب کے پاس یہ کہہ کر لے جاتے

ہیں کہ "ان کے ہاں کباب بڑے لذیذ ملتے ہیں۔" ایک تو یہ کہ فیض کی شام یا رات کا کچھ حصہ صرف ایک جگہ بسر ہوتا ہے۔ وہ گھر گھر گھومنے کے عادی نہیں۔ دوسرے وہ جہاں بھی جاتے ہیں، ان کی اس طور پذیرائی کی جاتی ہے کہ پھر کسی دوسرے کے ہاں جانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ دو چار بار اجازت طلب کریں تب ان کا میزبان انھیں واپسی کی اجازت دیتا ہے۔ ایسے میں حیرت ہوتی ہے کہ فیض راشد کو چند گھنٹوں میں تین جگہ گھما لائے۔ "لذیذ کباب" کی بات میں اسی طرح مسترد کرتا ہوں جس طرح "اچھی شراب" کر چکا ہوں۔ ڈرامے کے کسی کردار کی شخصیت اور اس کے مکالموں میں فکری اور انسانی ہم آہنگی لازمی شرط ہوتی ہے ورنہ یا تو کردار کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے یا مکالمے بے جوڑ ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ فیض کی شخصیت تو خیر کیا مسخ ہوتی، راشد نے ان سے جو مکالمے منسوب کیے ان سے ثابت ہوا کہ وہ ڈراما نہیں لکھ سکتے۔

اب میں تیسری دعوت کا ذکر کروں گا جس کا حال میں اپنی تصنیف "عمر گزشتہ کی کتاب" میں فیض کے نام اپنے ایک خط کی صورت میں اس طرح لکھ چکا ہوں (صفحہ ۱۷۴)

"آپ میاں بیوی کے مراسم پر ایک بات یاد آئی۔ میں اسلام آباد میں آپ کے ہاں مقیم تھا۔ ایک شام آپ نے مجھ سے کہا سبزہ زار پر کرسیاں رکھواؤ اتنے میں میں کپڑے بدل لیتا ہوں۔ ن م راشد آنے والے ہیں۔ انھیں کہیں لے جانا ہے تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ راشد کو ایلس کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی اور ایسا ہی کچھ حال راشد کا بھی ہے۔ اس لیے ذرا انھیں باتوں میں مصروف رکھنا میں ابھی آیا۔

دس بیس منٹ میں راشد آئے۔ ایلس اور راشد میں بس ہلو ہلو ہوا۔ میں انھیں سبزہ زار پر لے گیا۔ احمد فراز کے آتے آتے تک آپ بھی برآمد ہو گئے اور ہمارا قافلہ آپ کے ہم مکتب خواجہ مسعود کے گھر پہنچا جہاں آپ نے مزید دو تین احباب کو بلا لیا تھا۔ رات بارہ بجے تک کی ہم نشینی کے بعد سب ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے...... ایلس نے آپ کو راشد سے ملنے یا راشد کو کسی اور جگہ مدعو کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جو وہ یہ کہہ کر سکتی تھیں، جیسا کہ ہماری بعض مشرقی خواتین کا خاصّہ ہے کہ بیوی جسے پسند نہ کرے شوہر اس سے کیوں ملے۔ آپ نے ایلس کو مجبور نہیں کیا جیسا کہ ہمارے بعض مشرقی مرد کرتے ہیں کہ شوہر اپنی مرضی کا مختار ہے، وہ جس کی اور جیسی دعوت کرنا چاہے بیوی کا فرض ہے کہ اس کا اہتمام کرے۔"

دعوتوں کے سلسلے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلی دعوت کا راشد کو تلخ تجربہ ہو چکا تھا جس کا انھیں ہنوز قلق رہا تو بعد کی دو دعوتیں انھوں نے کیوں قبول کیں؟ قبول کیں تو فیض سے کیوں نہیں کہا کہ پہلی دعوت کا سا حشر نہ ہو۔

دوسرا سوال اس زبان اور مکالموں کا ہے جو فیض سے منسوب کیے گئے ہیں۔ ساقی فاروقی نے یہ مکالمے واوین میں دیے ہیں اس لیے باور کرنا ہوگا کہ راشد کا من وعن بیان ہے اور ساقی فاروقی نے زیبِ داستان کے لیے اپنی طرف سے اختراع نہیں کیے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں یہ فیض کی زبان اور لہجہ نہیں ہے۔

تیسری بات جو میں قبول کرتا ہوں یہ ہے کہ فیض نے راشد کو ضرور دوسروں کے گھر مدعو کیا ہوگا مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ انھیں گھر گھر لے جائیں۔ دوسرے کے گھر جانے پر اگر راشد کو اعتراض تھا تو وہ راولپنڈی میں فیض کے ساتھ خواجہ مسعود کے گھر کیوں گئے جہاں میں بھی موجود تھا۔

چوتھا اور میرے نزدیک سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ راشد جیسے بڑے شاعر کے لیے یہ ایسا کیسا سانحہ ثابت ہوا کہ بقول ساقی فاروقی انھیں "کئی بار سنایا" اور اس کا رنج رہا کہ فیض نے ان سے" معافی تک نہیں مانگی"! کیا بڑوں کا ظرف ایسا ہوتا ہے؟

مجھے یاد ہے تین چار سال پہلے فیض اسلام آباد سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ کل صبح گیارہ بجے سردسنز کلب چلنا ہے، کرتے پاجامے میں نہ آنا وہاں لباس پر پابندی ہے۔ ہم دونوں سردسنز کلب گئے۔ فیض کو عمر قریشی نے مدعو کیا تھا مگر وہ غائب تھے۔ ان کے بڑے بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ فیض نے ان سے انگریزی میں پوچھا تمھارا وہ لوفر قسم کا بھائی کہاں ہے جس نے ہمیں بلایا اور خود غائب ہے۔ بھائی نے جواب دیا گھر میں پڑا پی رہا ہوگا، چلو اچھا ہے اس کی عدم موجودگی سے مجھے ہم نشینی اور میزبانی کا شرف نصیب ہو رہا ہے۔ ہم کوئی دو تین گھنٹے ان کے ساتھ رہے۔ وہ دن اور آج کا دن فیض نے کبھی عمر قریشی یا کسی اور سے عمر قریشی کی اس وعدہ خلافی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ صاحب ظرف بڑے ایسے ہوتے ہیں۔

آخر میں دوبارہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مسئلہ سوانحی ادب کا نہ ہوتا تو ساقی فاروقی کے مضمون کے حوالے سے میں راشد مرحوم کے بارے میں یہ جوابی مضمون نہ لکھتا۔ خدا راشد کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

یادِ یارِ مہرباں

زیڈ۔ اے۔ بخاری کی یادیں اور باتیں

مرتبہ

مرزا ظفر الحسن

صفحات ۱۹۰ قیمت ۲۵ روپے

مکتبۂ اسلوب

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ کراچی ۱۸

غالب اور صفیر بلگرامی

مشفق خواجہ

غالب کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان سے وابستہ ہر شخص ہمارے ادب کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہے۔ ان کے ممدوح ہوں یا شاگرد، دوست ہوں یا دشمن، رشتہ دار ہوں یا ملاقاتی، یہ سب غالب کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن صفیر بلگرامی صرف اسی وجہ سے اہم نہیں ہیں۔ انھوں نے ایک شاعر، تذکرہ نگار، داستان گو، سوانح نگار، مورخ، ناول نگار، قواعد نویس اور مکتوب نگار کی حیثیت سے بہت سے اہم کام انجام دیے۔ انھوں نے بے شمار شاگردوں کی ادبی و ذہنی تربیت بھی کی۔ شاد عظیم آبادی جیسا خوش فکر شاعر انھیں کا شاگرد ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں غالب و صفیر کے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ دونوں کی مراسلت اور ملاقاتوں کی روداد کے ساتھ وہ تمام تحریریں بھی یک جا کر دی گئی ہیں جو صفیر نے غالب کے بارے میں لکھی تھیں، اور شائع نہیں ہوئی تھیں یا شائع ہوئی تھیں تو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں۔ مصنف نے بہت سی قلمی اور نادر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کر کے بہت سا ایسا مواد جمع کیا ہے جو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس میں غالب و صفیر کے بارے میں بہت سی نئی باتیں ہیں، اور دونوں کے ایک دوسرے کے نام خط پہلی مرتبہ صحیح اور مکمل صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔

قیمت ۲۵ روپے

مکتبۂ اسلوب

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ - کراچی ۱۸